

خاندان بھر کے لیے

ماہنامہ

ریشم

August, 2011

جشن آزادی مبارک

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے  
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com



ریشم راسٹرزلن تقریب کی جھلکیاں اندرونی صفحات

ہیجنگ ایڈیٹر: بشری مسرور

ایڈیٹر: محمد عرفان راے

سب ایڈیٹر: مشعل فاروقی

بزنس ایگزیکٹو: محفوظ احمد

سرکولیشن مینیجر: علی شیر

0321-7053753



نوٹ:

قیمت فی پیج (پاکستان) 50 روپے، (سعودی عرب) 14 ریال یا مساوی  
حمہ عرب الامارات 14 درہم، زوسالانہ (اندرون ملک) 700 روپے  
ایڈیٹر: بشری مسرور نے زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر لاہور سے شائع کیا۔

خاندان بھر کے لیے

ماہنامہ  
ریشم

جلد نمبر: 11 شماره نمبر: 12 اگست 2011

ABC Certified



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

مارکیٹنگ مینیجر کراچی: ریاض مرزا

یورو چیف اسلام آباد: نعیم قریشی

0323-4731751  
0307-4400851

ایڈورٹائزنگ مینیجر پنجاب: شاقب بخاری

0333-7853837

مارکیٹنگ مینیجر کوئٹہ: ڈبلیو آ آر قریشی

فونو گرافر: طاہر چوہدری

0321-4320844

قانونی مشیر: ایڈووکیٹ ہانی کورٹ

کرامت علی خان

لے آؤٹ: شہزاد علی

Suite#1, 4th Floor, Block No.12 Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore  
Ph (042) 36280008 Email: Raysham\_Editor@hotmail.com

19  
تذکرے اور محبتیں  
ڈاکٹر طاہر القادری  
مفتی مضمون

21  
ریشمی دستک  
بشری مسرور  
آپ کے خطوط

23  
شہر اسرارِ تقرب  
بشری مسرور

44  
کافرہ  
عرفان رائے  
تاریخی کہانی

78  
جنون  
بشری مسرور  
سلسلہ وار

101  
ادھورا خواب  
عذرا فردوس  
افسانہ

107  
صبح آزادی  
نصیر آصف خان  
افسانہ

114  
ناسور  
ام اے راحت  
سلسلہ وار ناول

139  
ساون کی بجلی بارش  
بینا عالیہ  
افسانہ

143  
واسوخت  
قاسم رشید  
افسانہ

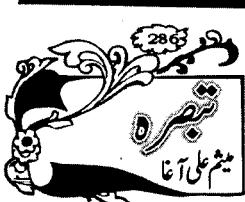
158  
ہم ساتھی داماں  
نقارت نصر  
ناولٹ

187  
یوسف اور نازیبہ  
ریم کریش  
ناٹک فراموش

197  
کہانیاں زندگی کی  
محمد کہانیاں

202  
بھروسہ  
مدف راشد  
ناولٹ







یا اللہ

یا اللہ

## حرم باری تعالیٰ

اے اللہ تو سب سے بڑا  
تو نے جہان کو خلق کیا  
تیرے جلوے شام و سحر  
غنچے و گل میں تو ہی سجا  
گلشن گلشن باس تیری  
مہر و ماہ کو دی ہے ضیا  
ہر شے کا خالق ہے تو!  
کوہ و دمن بہتے دریا  
جگڑے کام بنے پل میں  
جب بھی تیرا نام لیا  
تیرے در کے بھکاری سب  
ہر کوئی ہے تیرا ہی گدا  
تیری عنایت کیا کہنے!  
نعتیں تو نے بخشیں کیا  
تیری ثنا کرتے ہیں سب  
کوہ و دمن جھل صحرا  
جسم و جاں کا خالق تو  
فہم و فراست تیری عطا  
جس سے شاہ روم جاں حاصل  
میرے لب پر اس کی ثنا  
(شاہ روم خان، کراچی)

یا محمد ﷺ

یا محمد ﷺ

## نعت رسول مقبول ﷺ

جس پل نے نام محمدؐ لیا  
فرشتوں نے اس پل کو بوسہ دیا  
جس دم بھی نام محمدؐ سنا  
کونین کا سر ادب سے جھکا  
جب بھی دیا آپؐ کا واسطہ  
بھٹکے ہوؤں کو ملا راستہ  
بعد از خدا آپؐ ہی آپؐ ہیں  
ہم سر نہیں ہے کوئی دوسرا  
اتنے ہیں میرے نبیؐ خو برو  
کہ رب جہاں بھی ہے عاشق ہوا  
آقاؐ نے جوں ہی اشارا کیا  
دو نیم فوراً قمر ہو گیا  
عشرت کی رب سے یہی ہے دعا  
کرے ذکر ان کا وہ صبا و مساء

(عشرت گورداسپوری، لاہور)

روشن مستقبل آپ کی دہلیز پر



خواب ستاروں کی مانند ہیں تو ان پر کمر کیسے ڈالنا ہے.....

آپ پر کوشش شخصیت کی مالک ہیں اور کمرے سے نظریں ملا  
کر مائلنگ کی دنیا میں تھلا لکھ چاویے کا عزم رکھتی ہیں تو....

ماہنامہ  
**ریشم**

کاسرورق ان ادھورے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر منزل  
تک پہنچنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

سوٹ نمبر 1، فلور نمبر 4، بلاک نمبر 12، میاں مجید رفیق پبلیکیشنز  
پوسٹ بکس نمبر 716، جی پی او لاهور  
فون: (042) 6280008  
فیکس نمبر: 042-6370732  
Email: Raysham\_Editor@yahoo.com

ماہنامہ  
**ریشم**  
ڈائریکٹ پبلیکیشنز

## اصاریہ

قوموں کی زندگیاں عروج و زوال اور شکست و ریخت کے عمل سے عبارت ہوتی ہیں۔ روز اول سے نسل آدم کی تاریخ کا ہر باب کسی قوم کی فنا پر بند ہوتا ہے تو کسی نسل کی حیات نو کی نوید پر کھلتا ہے، صفحہ ہستی سے مٹنے والے اپنے پیچھے سینکڑوں داستانیں اور ہزاروں عبرت ناک اسباق چھوڑ جاتے ہیں جو رہتی دنیا کو تاریخ کے ان ادوار پر دیدہٴ عبرت نگاہ ڈالنے کی دعوت شام و سحر دیتے ہیں۔ گھڑیوں کی مستقل مزاج اور سبک خرام سوئیاں ان ایام اور واقعات کو ہمارے آگے بار بار دہراتی ہیں جو سنگ میل کی طرح شاہراہ زندگی پر جا بجا ایستادہ ہیں۔

لیکن تاریخ برصغیر پاک و ہند میں 14 اگست 1947 کا دن اک سنگ میل نہیں بلکہ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ دشمنوں نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مگر جب قوم کا ہر مرد و زن تمام تر لسانی اور فروعی اختلافات بھول کر ایک ہی نصب العین پر متحد ہو گیا تھا تو اسی اتحاد و یگانگت کے نتیجے میں پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر ابھرا، آج بھی موجود ہے اور انشاء اللہ تاقیامت قائم رہے گا۔

آئیے..... آج کے دن آپس کے تمام اختلافات بھلا کر یہ عہد کریں کہ فرقہ پرستی، تعصب اور ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر پاکستان کو ترقی اور عظمت کی بلندیوں تک لے جانے کے لئے اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کریں گے۔ تاکہ پاکستان کو زوال پذیر دیکھنے کے خواہش مندوں کا خواب کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

بشریٰ مسرور

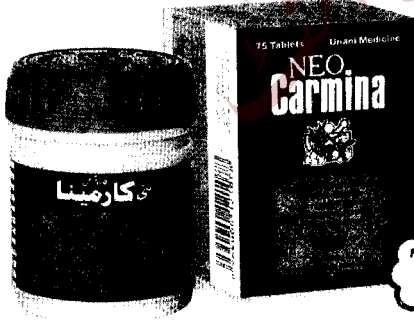


ہاضمہ برقرار، صحت پائیدار



نئی کارمینا

اب جدید سیل بند پیک میں  
زیادہ مؤثر، زیادہ مفید



75  
قرص



نہایتی اجزاء اور مجرب نمکیات زیادہ محفوظ، آپ کو ملے بہترین ذائقہ اور افادیت  
ساہا سال سے آزمودہ نئی کارمینا قبض، عجز، سینے کی جلن، پیٹ کے درد، قے یا متلی کی کیفیت کو  
فوری رفع کر کے صحت بحال رکھتی ہے۔

نئی کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے



### رمضان المبارک میں معمولات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات رمضان پر عمل ہی ہماری کامیابی کا ذریعہ ہے اور انہی معمولات کی روشنی میں ہی ہم اس مہینے کی برکتوں اور عبادتوں سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔

**رمضان المبارک کا چاند دیکھنے پر خصوصی دعا:**  
جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کا چاند دیکھتے تو فرماتے: یہ چاند خیر و برکت کا ہے، یہ چاند خیر و برکت کا ہے، میں اس ذات پر ایمان رکھتا ہوں جس نے تجھے پیدا فرمایا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، 10: 400، رقم: 9798)۔

**سحری و افطاری کا معمول:**

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالاتزام روزے کا آغاز سحری کھانے سے فرمایا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو تلقین فرمائی کہ سحری ضرور کھایا کرو خواہ وہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سحری کھایا کرو، کیونکہ سحری میں برکت ہے (صحیح البخاری، 1: 257، کتاب الصوم، باب برکتہ السحور من غیر ایجاب، رقم حدیث: 1823)۔ ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل کتاب اور مسلمانوں کے روزے کے درمیان فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں سحری کھانے کا فرق ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل السحور، رقم حدیث: 1096)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

رمضان المبارک کا مہینہ نہایت ہی برکتوں اور سعادتوں والا مہینہ ہے۔ حدیث پاک ہے: الرمضان شہر اللہ (رمضان اللہ کا مہینہ ہے)۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک سے بہت زیادہ محبت فرماتے اور اس کے پانے کی اکثر دعا کیا کرتے تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مبارک مہینے کا خوش آمدید کہہ کر استقبال کرتے۔ جب رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ تم کس کا استقبال کر رہے ہو اور تمہارا کون استقبال کر رہا ہے؟ (یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے) (الترغیب والترہیب، 2: 105)۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا کوئی وحی اترنے والی ہے یا کسی دشمن سے جنگ ہونے والی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم رمضان کا استقبال کر رہے ہو جس کی پہلی رات میں تمام اہل قبلہ کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ (الترغیب والترہیب، 2: 105)۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کا استقبال ماہ شعبان میں ہی روزوں کی کثرت کے ساتھ فرماتے تھے۔ جب رمضان المبارک شروع ہوتا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات عبادت و ریاضت میں عام دنوں کی نسبت کافی اضافہ ہو جاتا۔ ذیل میں ہم رمضان المبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چیدہ چیدہ معمولات بیان کرتے ہیں

ارشاد فرمایا: سحری سراپا برکت ہے اسے ترک نہ کیا کرو۔ (مسند احمد بن حنبل، 3: 12)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: سحری کرنے والے پر اللہ کی رحمتیں ہوتی ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل، 3: 12)۔

رمضان المبارک میں پابندی کے ساتھ سحری و افطاری بے شمار فوائد اور فیوض و برکات کی حامل ہے۔ روحانی فیوض و برکات کے علاوہ سحری دن میں روزے کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دن کو قبولہ کر کے رات کی نماز کے لئے مدد حاصل کرو اور سحری کھا کر دن کے روزے کی قوت حاصل کرو۔ (سنن ابن ماجہ: 123، کتاب الصیام، باب ما جاء فی السحر، رقم حدیث: 1693)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ سحری میں برکت کے فوائد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

سحری میں برکت کی وجوہات ظاہر ہیں جیسا کہ یہ روزے کو تقویت دیتی ہے اور اسے مضبوط کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے روزے میں زیادہ کام کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق رات کو جاگنے کے ساتھ ہے اور یہ وقت ذکر اور دعا کا ہوتا ہے جس میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور دعا اور استغفار کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سحری کھانے کی برکت کئی طرح سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً اتباع سنت، یہود و نصاریٰ کی مخالفت، عبادت پر قوت حاصل کرنا، آادگی عمل کی زیادتی، بھوک کے باعث جو بدظنی پیدا ہوتی ہے اسکی مدافعت، سحری میں کئی حق داروں اور محتاجوں کو شریک کر لینا جو اس وقت میسر آ جاتے ہیں۔ تاہم سحری کھانے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جانوروں کی طرح بے تحاشا کھایا جائے۔ علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روزے کا مقصد چونکہ پیٹ اور شرم گاہ کی خواہشات کو توڑنا اور درجہ اعتدال میں لانا ہے لیکن اگر آدمی اتنا کھاتا کہ جس سے روزے کے

مقاصد پورے نہ ہوں بلکہ ختم ہی ہو جائیں تو یہ روزہ کی روح کے خلاف ہے۔ جبکہ عیش پسند لوگ ایسا کرتے ہیں کہ دن بھر کی کسر شام کو اور رات بھر کی کسر سحری کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

افطاری میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر اوقات کھجوروں سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر وہ میسر نہ ہوتیں تو پانی سے افطار فرمایتے تھے۔ حضرت سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چائے کہ کھجور سے کرے کیونکہ اس میں برکت ہے، اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے کیونکہ پانی پاک ہوتا ہے۔ (جامع الترمذی، 1: 83، کتاب الزکوۃ، رقم حدیث: 658)۔ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر افطاری کے وقت عجیب معصکہ خیر صورت نظر آتی ہے۔ ہماری مجلسی زندگی کا خاصہ ہے، جو الا ماشاء اللہ افرا تفری، بدظنی اور وحشی انتشار کی آئینہ دار ہے۔ ادھر مغرب کی اذان بلند ہوتی، اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ شروع ہو گیا اور افطاری کے لئے بھانگم دوڑ مچ گئی۔ کوئی جلدی سے کھانے کی طرف لپک رہا ہے اور کھلی کر کے مسجد کی طرف بھاگ رہا ہے۔ مؤذن کے اذان سے فارغ ہونے کے فوراً بعد مغرب کی نماز کھڑی ہو گئی۔ اس افرا تفری میں افطاری کرنے والوں میں سے کسی کو دوسری اور کسی کو آخری رکعت میں جماعت ملی۔ بدظنی اور عدم توازن پر مبنی یہ صورت حال ہماری کج فہمی کی پیداوار ہے، ہم اپنی لاعلمی کی بنا پر نماز مغرب میں غیر ضروری غلت کو روا گردانتے ہیں، حالانکہ نماز کا وقت اتنا تک بھی نہیں، جتنا ہم سمجھ بیٹھے ہیں۔

افطاری میں جلدی کرنا:

سحری کرنے میں تاخیر اور افطاری کرنے میں جلدی کرنا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زندگی بھر معمول رہا۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک وہ روزہ

سے پیدا ہوتے وقت بے گناہ تھا۔ (سنن نسائی، 1: 308، کتاب الصیام، رقم حدیث: 2208)۔ اس ارشاد گرامی کی زد سے روزے کے آداب کی بجا آوری اور اس میں عبادت اور ذکر الہی کے لئے کھڑے رہنے سے انسان کے گناہ بارگاہ ایزدی کی طرف سے عفو و کرم سے اس طرح مٹا دیئے جاتے ہیں، گویا وہ ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ رات کے قیام کے لئے جو محبوب عمل سنت نبوی سے ثابت ہے نماز تراویح ہے جس میں قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔

### تراویح کی شرعی حیثیت:

نماز تراویح کا سنت مؤکدہ ہونا نص حدیث سے ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز تراویح مسجد میں باجماعت اور انفرادی طور پر گھر میں بھی ادا فرمائی۔ اس کا باجماعت ادا کرنا سنت کفایہ کے ذیل میں آتا ہے۔ بصورت دیگر موجودہ نماز تراویح خلفائے راشدین کی سنت بھی ہے، جس نے اجماع امت کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔

رمضان المبارک میں قیام کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جتنا قیام تھا اس مہینے کیا جاتا ہے، وہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں نہیں ہوتا۔ منشاء ایزدی اس سے یہ ہے کہ بندہ رمضان المبارک میں راتوں کی زیادہ سے زیادہ ساعتیں اس کے حضور عبادت اور ذکر و فکر میں گزارے اور اس کی رضا کا سامان مہیا کرے، قیام رمضان کا تقاضا ذکر و استغفار کی کثرت اور ذوق و شوق سے عبادت اور یاد الہی میں انہماک و استغراق ہے۔ رمضان المبارک کی رات کی ہر ساعت اتنی فضیلت اور قدر و منزلت کی حامل ہے کہ ہمارے لئے اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔

### معمول ختم قرآن:

رمضان و قرآن میں گہرا باہمی ربط و تعلق پایا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: رمضان کا مہینہ (وہ ہے)

جلد افطار کرتے رہیں گے۔ (صحیح مسلم، 1: 350، کتاب الصیام، باب فضل السحور، رقم حدیث: 1098)۔ اسی طرح دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اذان سنے اور برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو اپنی ضرورت پوری کئے بغیر اسے نہ رکھے۔ (سنن ابی داؤد، 1: 328، کتاب الصوم، رقم حدیث: 2350)۔ حدیث قدسی ہے کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندوں میں مجھے پیارے وہ ہیں جو افطار میں جلدی کریں۔ (جامع الترمذی، 1: 88، کتاب الصوم، باب ما جاء فی تعجیل الافطار، رقم حدیث: 700)۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس امت کے لوگوں میں یہ دونوں باتیں (یعنی افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرنا) رہیں گی تو اس وقت تک سنت کی پابندی کے باعث اور حدود شرع کی نگرانی کی وجہ سے خیریت اور بھلائی پر قائم رہیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے روزہ جلدی افطار کرنے اور سحری میں تاخیر کا حکم دیا گیا ہے۔ (السنن الکبریٰ، 4: 238)۔ صحابہ رضی اللہ عنہ کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ آفتاب غروب ہوتے ہی افطاری سے فارغ ہو جاتے تھے۔

### قیام اللیل:

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا مبارک معمول رمضان المبارک کی راتوں میں تواتر و کثرت کے ساتھ قیام، نماز تراویح، تسبیح و تہلیل اور ذکر الہی میں محویت سے عبارت ہے۔ نماز کی اجتماعی صورت جو ہمیں تراویح میں دکھائی دیتی ہے، اسی معمول کا حصہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک میں قیام کرنے کی فضیلت کے باب میں ارشاد فرمایا: جس نے ایمان و احتساب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور راتوں کو قیام کیا وہ گناہوں سے اس دن کی طرح پاک ہو جاتا ہے، جس دن وہ بطین مادر

جس میں قرآن اتارا گیا ہے۔ (البقرۃ، 2: 185)۔  
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دورانِ رمضان المبارک ایک بار ختم قرآن کا معمول تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو بھی اسی اعتدال پر چلنے کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے۔ اسلام سادہ اور فطرت سے ہم آہنگ دین ہے اور تعلیماتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی اسی فطری سادگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے دین میں تنگی پیدا نہ کرو۔ اسی لئے ہر امتی کی سہولت کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہِ صیام میں ایک بار قرآن پاک ختم کرنے کے معمول پر زندگی بھر کا رہنما رہے، حفاظ و قراء کرام قرآن کریم کو اتنی مقدار میں نہ پڑھیں کہ ترتیل کے ساتھ تلاوت ممکن نہ رہے۔ قرات میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ نماز تراویح کی جماعت میں بچے اور بوڑھے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس بناء پر قرات کو اتنا طول دینا ہرگز مناسب نہیں، جو ان کی برداشت سے باہر ہو جائے۔ صرف اتنی مقدار پر کفایت کی جائے کہ ہر شخص اطمینان و سکون کے ساتھ نماز تراویح کے دوران قرات کو سن سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہ کو رمضان المبارک میں ایک ختم قرآن پر اکتفا کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا معمول ہر روز ایک قرآن ختم کرنے کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابی موصوف کو بلایا اور حسب دستور اس مہینے میں ایک قرآن ختم کرنے کی ہدایت فرمائی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اس سے زیادہ کی استطاعت ہے اور مجھے حافظ قرآن ہونے کے پیش نظر زیادہ کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے زیادہ اصرار پر پہلے بیس دن، پھر دس دن اور آخر میں ہر سات دن کے بعد ایک قرآن ختم کرنے کی اجازت ان الفاظ میں عطا فرمادی:

سات دن میں ایک قرآن پڑھ لیا کرو۔ (مسند احمد بن حنبل، 2: 162)۔

اس سے یہ نکتہ بڑی صراحت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ایک دن میں قرآن مجید کے شہینہ کرانے کا رواج صرفاً خلاف سنت ہے۔ بہر حال اگر شبینہ کرانا مقصود ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق ختم قرآن کے لئے زیادہ سے زیادہ سات سے دس دن یا کم از کم تین رات کی محفل شبینہ کا اہتمام کیا جائے لیکن اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ تلاوت کردہ قرآنی الفاظ کو سننے والے اس کی نشست و برخاست اور مطالب و معانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ رفتار اتنی تیز نہ ہو کہ الفاظ گڈگڈ ہو جائیں اور سننے والے کے کچھ بھی پلے نہ پڑے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کے دورہ ختم قرآن کا معمول:

صحیحین کی متفق علیہ حدیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر رمضان المبارک میں رات کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام قرآن پاک کا دور کرنے کے لئے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجرہ مبارکہ میں تشریف لاتے جہاں باری باری ان دونوں ہستیوں میں سے ایک کلام پاک کی تلاوت کرتی تو دوسری سماعت فرمائی۔ یہ معمول ہر رمضان میں جاری رہا، یہاں تک کہ وصال مبارک سے پہلے آخری رمضان آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سابقہ معمول کے برعکس دو مرتبہ قرآن پاک کا دور جبریل علیہ السلام کے ساتھ فرمایا۔ حفاظ و قراء کرام کی کتنی خوش قسمتی ہے کہ وہ دوران تراویح ہر رمضان میں قرات اور سماعت کا فریضہ ادا کر کے بیک وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

معمولی تہجد:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز تہجد میں آٹھ رکعت ادا فرماتے، جس میں وتر شامل کر کے کل گیارہ رکعتیں بن جاتیں۔ تہجد کا یہی مسنون طریقہ حضور صلی اللہ علیہ



کو سختی سے روندتا ہے اور (وقت و عادل و زبان کی یکسانیت کے ساتھ) سیدھی بات نکلتی ہے۔ (المزمل، 6: 73)۔ ان نفوس قدسیہ کی راتیں یوں بسر ہوتی ہیں کہ ان کے پہلو شب کی غلوت میں بستروں سے الگ رہتے ہیں، جب دوسری خدائی خواب گراں کی لذتوں میں غلطاں ہوتی ہے، وہ اپنے رب کو منانے کے لئے اس کے حضور پیکر عجز و نیاز بنے گزر گزرا رہے ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کی راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عشاء و تراویح ادا کرنے کے بعد سونے کے لئے تشریف لے جاتے، پھر رات کے کسی حصے میں نماز تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو بشمول وتر گیارہ رکعتیں نماز کی ادا فرماتے۔ نماز تہجد کے لئے نماز عشاء کے بعد کچھ سونا شرط اور مسنون ہے، یہی عمل افضل و مستحب ہے، جو سید صحابہ رضی اللہ عنہ اور سید صالحین سلف سے ثابت ہے، بغیر نیند کے نماز تہجد کا ادا کرنا مکروہ ہے۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز تہجد کے بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں: جو شخص آخر عشاء کے بعد دو رکعت اس طرح ادا کرے کہ ایک مرتبہ فاتحہ الکتاب اور بیس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں دو محل بنائے گا، جن کا جنت والے مشاہدہ کریں گے۔ (الدراۃ المشرور، 6: 415)۔

**کثرت صدقات و خیرات:**

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ وہ ہر وقت صدقہ و خیرات کثرت کے ساتھ کیا کرتے تھے، کوئی سوالی ان کے در سے خالی نہیں لوٹتا تھا۔ لیکن رمضان المبارک میں صدقہ و خیرات کی مقدار باقی مہینوں کی نسبت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ اس ماہ صدقہ و خیرات میں اتنی کثرت ہو جاتی کہ ہوا کے تیز جھونکے بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ حضرت ابن عباس

آلہ وسلم سے منسوب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم پر رات کا قیام (نماز تہجد) لازمی ہے کیونکہ تم سے صالحین کا یہ عمل رہا ہے۔ (سنن الترمذی، 2: 194، کتاب الدعوات، رقم حدیث: 3549)۔ نماز تہجد تمام نفلی نمازوں میں افضلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مومن کی بزرگی قیام اللیل میں ہے اور عزت لوگوں سے استغناء میں ہے۔ (سنن الترمذی، 2: 194، کتاب الدعوات، رقم حدیث: 3549)۔ نماز تہجد میں مداومت اختیار کرنے سے بندہ اپنے رب کی نظر میں وہ مقام و مرتبہ حاصل کر لیتا ہے کہ اسے عزت و وقار اور شان استغناء نصیب ہوتی ہے، جس کے صلے میں اسے دنیا میں کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی حاجت نہیں رہتی اور اس کی جبین نیاز آستانہ خداوندی کے سوا اور کسی در پر نہیں جھکتی۔ بندہ جب اپنے رب سے تعلق آشنائی محکم و پختہ تر کر لیتا ہے تو اس کی زندگی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کی عملی تفسیر بن جاتی ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذت آشنائی

راتوں کی تہائی میں خدا سے راز و نیاز اور اس کے آگے گزر گزرا کر خشوع و خضوع کے ساتھ دعا میں مانگنے سے بندہ دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے اور کسی فرعون کو خاطر میں نہیں لاتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے شب زندہ دار اور نماز تہجد کی خاطر قیام اللیل کرنے والوں کی شان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: میری امت کے برگزیدہ افراد وہ ہیں جو قرآن کو (اپنے سینوں میں) اٹھائے ہوئے ہیں اور شب بیداری کرنے والے ہیں۔ (شعب الایمان، 2: 557، رقم حدیث: 2703)۔ امت مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ پاک باز اور قدسی صفات مردان باخدا ہیں، جن کے بارے میں اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: بے شک رات کا اٹھنا نفس

رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب جبرئیل امین (علیہ السلام) آجاتے تو آپ کی سخاوت کی برکات کا مقابلہ تیز ہوا نہ کر پاتی۔ (صحیح البخاری، 1: 255، کتاب الصوم، رقم حدیث: 1803)۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام محبت لیکر آتے تھے اور رمضان المبارک میں چونکہ عام دنوں کی نسبت کثرت سے آتے تھے اس لئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے آنے کی خوشی میں صدقہ و خیرات بھی کثرت سے کرتے۔ اس حدیث پاک سے کئی فوائد اخذ ہوتے ہیں: مثلاً

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جود و سخا کا بیان،  
رمضان المبارک میں کثرت سے صدقہ و خیرات کے پسندیدہ عمل ہونے کا بیان،  
نیک بندوں کی ملاقات پر جود و سخا اور خیرات ہونے کا بیان،

نیک بندوں سے ملنے کے بعد ان کی ملاقات کی خوشی میں صدقہ و خیرات،  
قرآن مجید کے شرح درس و تدریس کے لئے مدارس کے قیام کا جواز۔ (شرح نووی، 15: 69)۔  
معمول اعتکاف:

رمضان المبارک میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی باقاعدگی کے ساتھ اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ زیادہ تر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے، ابھی کبھار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے اور دوسرے عشرے میں بھی اعتکاف فرمایا۔ لیکن جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کر دیا گیا کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرے میں ہے۔ اس کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ آخری عشرے میں ہی اعتکاف فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے معمول اعتکاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں: حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے چاہے۔ (صحیح البخاری، 1: 271، کتاب الاعتکاف، رقم حدیث: 1922) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ آخری عشرہ کے علاوہ رمضان المبارک کے پہلے اور دوسرے عشرے میں بھی اعتکاف فرمایا۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کا پہلا عشرہ اعتکاف فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درمیانی عشرہ اعتکاف فرمایا اور یہ اعتکاف ایسے ترکی خیمہ میں تھا جس کے دروازے پر بطور پردہ چٹائی تھی جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مبارک ہاتھ سے پکڑ کر خیمہ کی طرف ہٹایا اور پھر اپنا سر اقدس نکال کر صحابہ کرام کو اپنے قریب آنے کے لئے فرمایا: جب وہ قریب آگئے تو فرمایا میں نے لیلۃ القدر کی تلاش میں پہلا عشرہ اعتکاف کیا، پھر میں نے درمیانی عشرہ اعتکاف کیا، پھر مجھے بتایا گیا کہ وہ آخری عشرہ میں ہے۔ تم میں سے جو اعتکاف جاری رکھنا چاہتا ہے وہ اسے جاری رکھے۔ (صحیح مسلم، 1: 370، کتاب الصیام، رقم حدیث: 1167) وصال مبارک کے سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیس دن اعتکاف فرمایا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال رمضان المبارک میں دس دن تک اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ لیکن جس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال فرمایا اس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیس دن تک متکف رہے۔ (صحیح البخاری، 1: 272، کتاب الاعتکاف، رقم حدیث: 1939)۔ اعتکاف میں انسان دنیاوی معاملات سے علیحدگی اختیار کر کے خدا کی رضا کی تلاش میں گوشہ تنہائی اختیار کرتا ہے۔ صوفیاء کرام اور اولیاء کرام حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی میں چلہ کشی کے عمل کو اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ اس عمل کے ذریعے خدا کو راضی کر سکیں اور تزکیہ نفس کے مقام کو حاصل کر سکیں۔

☆.....☆.....☆.....☆



# ریشمی دستک

بشری مسرور

ریشمی بہن بھائیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جب تک یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں تک پہنچے گا تو رمضان المبارک کا مقدس و بارکات مہینہ شروع ہو چکا ہوگا۔ ہماری جانب سے آپ سب کو رمضان المبارک کی آمد مبارک ہو۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کے روزے اور عبادات کو قبول فرمائے اور ماہ رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اگست کا آزادی نمبر آپ سب کے ہاتھوں میں ہے۔ پڑھ کر اپنی رائے دینا مت بھولے گا اور ہمارا اگلا شمارہ اس لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ اسے تین اہم مواقعوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔

1- یوم دفاع

2- عید الفطر

3- ریشم کی سالگرہ

آپ سب سے گزارش ہے کہ ان مواقع کی مناسبت سے اپنی تخلیقات جلد از جلد ہمیں روانہ کیجئے۔ تاکہ بعد میں معیاری ہونے کی صورت میں بھی تاخیر سے ملنے کے سبب شائع ہونے سے رہ نہ جائیں۔ ورنہ پھر بعد میں آپ کو شکوہ اور ہمیں شرمندگی ہوگی۔

بہت عرصے سے ہم ریشم رائٹرز کو اکٹھا کرنے کا سوچ رہے تھے مگر کبھی کوئی مصروفیت آڑے آ جاتی تھی اور کبھی کوئی رکاوٹ حاصل ہو جاتی تھی۔

بالآخر ہم اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے 3 جولائی 2011ء کی اک سلونی سی شام کو اپنی کوشش میں کامیاب ہو ہی گئے اور ریشم گیٹ و گیدر کے نام سے بی بیس میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں لاہور و گردونواح کے رائٹرز نے بھر پور شرکت کی۔

ہم نے لاہور سے مرد و خواتین رائٹرز جبکہ لاہور کے قرب و جوار سے صرف مرد لکھاری حضرات کو مدعو کیا تھا۔ (کیونکہ دور دراز سے اکثر لوگوں خصوصاً خواتین کا آنا دشوار ہوتا ہے) اور ہمیں خوشی ہے کہ موسم گرم اور خشک ہونے کے باوجود ریشمی مہمانوں کی ایک بڑی تعداد میس کے ہال میں موجود تھی۔

دور دراز سے آنے والے مہمانوں میں غضنفر علی شاہد، ڈاکٹر طارق محمود اور نعیم رضا بھی شامل تھے۔ ان کی آمد ریشم سے ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

ہمیں سعید بدر، عرفان عرفی کا نمبر باوجود کوشش کے نہیں مل پایا۔ اور صلاح الدین سبحان سے باوجود کوشش کے رابطہ نہیں ہو پایا۔ جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ ہم نے دوست محمد دو، میثم علی آغا اور ارشد محمود کو بھی مدعو کیا تھا۔ لیکن تینوں کی جی نوعیت کی چند مجبوریاں تھیں اور وہ اس تقریب میں شمولیت کے لئے نہیں آ سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے فون کر کے معذرت کر لی تھی۔ بہر حال ان کی کمی ہمیں بے حد محسوس ہوئی اور یہ شاہ روم خان آج کل کہاں غائب ہیں؟ ہم نے ان کے بیٹے کے انتقال پر تعزیت کے لئے ناجانے کتنے فون کئے مگر افسوس کہ بات نہیں ہو سکی۔ ہم نے

ایک دو جگہ سے ان بے ہنر کی تصدیق کی تو وہ وہی نمبر تھا جس پر ہم ڈاکل کر رہے تھے۔ خدا جانے پھر فون کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ شاید کوئی نیٹ ورک پر ایلم تھا۔ پھر بعد میں جب ہم نے انہیں ریشم رائز ملن تقریب میں شرکت کی دعوت دینے کی خاطر فون پر رابطہ کرنا چاہا تب بھی وہی مسئلہ درپیش رہا اور یوں ان سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ لیکن یقیناً جاپے کہ ہم سب نے اس شام جب سب ریشمی پروانے موجود تھے، شاہ روم خان کی کمی کو بہت محسوس کیا۔

سو، شاہ روم خان! آپ جہاں کہیں بھی ہیں فوراً سے پیشتر واپس پلٹ آئیے کہ آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ آپ کی آپنی آپ کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں اور ہم سب کو آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔

بات ہو رہی ہے ریشمی تقریب کی تو ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ ریشم رائز ایوارڈ تقریب کے انعقاد کا اعلان بھی جلد ہی کر دیا جائے گا۔ جس میں نا صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک بسنے والے تمام لکھاریوں، شاعروں، اور تبصرہ و مراسلہ نگاروں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی اور ریشم میں شائع ہونے والی تمام بہترین تحریروں کے مصنفین اور بہترین شعراء کرام کے ساتھ ساتھ بہترین تبصرہ و مراسلہ نگاروں کو ان کی ریشمی ادبی خدمات کے سہ، میں ایوارڈز و تعریفی اسناد سے نوازا جائے گا۔ اس تقریب میں آپ سب کی دلچسپی اور تفریح طبع کے لئے اور کئی بہت کچھ شامل ہو گا۔ تو انتظار فرمائیے اس خوب صورت ریشمی تقریب کے انعقاد کے اعلان کا۔

ہم نے آپ سے پچھلی بار یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اگلی دفعہ ریشمی دستک میں ”انعام یافتہ خط“ پر انعام کا اعلان بھی کیا جائے گا۔ اب ہم سوچ رہے ہیں کہ اس بارے میں اعلان بھی ریشم کے سالانے میں کیا جائے۔ سو اس کے لئے بھی آپ سب کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جانتے ہیں کہ انتظار میں اذیت ہوتی ہے مگر لذت بھی تو ہوتی ہے۔ آپ یقیناً ہماری بات سے اتفاق کریں گے ہے ناں.....؟

ریشم کے سالگرہ نمبر سے آپ اس کے اندر کافی نئی تبدیلیاں دیکھیں گے اور آپ کو پسند بھی آئیں گی۔  
(انشاء اللہ)

اس بار ریشمی دستک میں آپ سب کے خطوط کو جگہ دینے کی بجائے ہم ریشمی تقریب کا احوال لگا رہے ہیں تاکہ ہمارے جو لکھاری بہن بھائی اس تقریب میں شامل نہیں ہو سکے وہ بھی خود کو اس تقریب کا حصہ تصور کر سکیں۔  
آپ سب کے خطوط اور تبصرے آئندہ ماہ شامل کئے جائیں گے۔  
اور انشاء اللہ اگلے ماہ بشرط زندگی انہی صفحات پر دوبارہ ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک کے لئے اجازت۔

فی امان اللہ

بے شمار چاہتوں کے ساتھ آپ سب کی

بشریٰ مسرور

ہمارا ای میل ایڈریس یہ ہے

bushra\_raysham@hotmail.com

خطوط اور اپنی تحریروں ہمیں اس پتے پر ارسال کریں

## ریشم رانسرز ملن تقریب

### مشعل فاروقی (سب ایڈیٹر ماہنامہ ریشم)

2 جولائی کی شام آفسرز میس میں ماہنامہ ریشم کی تقریب منعقد کی گئی۔ مین گیٹ پر محمد طلحہ اور عرفان راے صاحب ریشمی لکھاریوں کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ سب سے پہلے تشریف لانے والوں میں امان اللہ نیز شوکت صاحب اور ان کی صاحبزادی عائشہ نیز تھیں۔ باقی ٹیم کے ممبرز اندر میس میں لکھاریوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تقریباً تمام مہمان مقررہ وقت پر پہنچ گئے تھے۔

تقریب کا آغاز محمد طلحہ مسرور نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اس کے بعد میں یعنی مشعل فاروقی (سب ایڈیٹر ماہنامہ ریشم) نے مائیک سنبھال کر آنے والے تمام معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور اپنی ٹیم کو آنے والے مہمانوں سے متعارف کیا بشری مسرور صاحبہ میرون اور کریم کلر کی بنگالی ساڑھی میں خوب فنج رہی تھیں۔ آج بطور خاص یہ احساس ہوا کہ جتنی خوبصورتی ان کی آواز ہے اس سے بڑھ کر وہ خود دلکش اور حسین ہیں۔ ان کے ساتھ ہی صوفے پر کشائش مسرور الف سے اچھے ب سے بچے کی نگران بیٹھی تھیں۔ ان کو دیکھ کر سبھی کی زبان پر ایک فقرہ تھا کہ ہونہار پروا کے چلنے چلنے پات، اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنا ٹیلنٹ گڑیا! (ماشاء اللہ) کشائش کے ساتھ ہی ہم براجمان تھے اور تقریب کی میزبانی کے فرائض بھی سر انجام دے رہے تھے۔ بشری صاحبہ کی دوسری طرف بابر فاروقی بیٹھے تھے جو کہ پہلے ریشم کے سرکولیشن منیجر اور پھر نوک جھونک کا کالم کرتے رہے۔ عرفان راے صاحب، کمپوزر شہزاد علی اور علی شیر (نئے سرکولیشن منیجر) لکھاریوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ راشدہ انور بھی تقریب کا حصہ تھیں جو کہ سلائی کڑھائی سے نکل کر اب

ریشم کا باورچی خانہ سنبھال چکی ہیں۔ طلحہ مسرور زیادہ تر فوٹو گرافی میں مصروف رہے اور ہم سب کے درمیان بیٹھ کے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ بھائی کوئی دو تین اچھے پوز ہی بنا دو۔

ٹیم کے تعارف کے بعد بشری صاحبہ نے لکھاریوں کو دعوت دی کہ وہ اپنے احساسات شیر کریں۔ سب سے پہلے مائیک تھا ماٹوشین ناز اختر نے اور نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ امید نہیں تھی کہ ریشم لاہور سے شائع ہو کر ڈائجسٹوں میں جگہ بنالے گا۔ مگر بشری مسرور نے ثابت کیا کہ وہ فوجی کی بیگم ہیں اور انہوں نے اپنی محنت اور حوصلے سے ریشم کو یہ مقام دلایا۔ ان کے بعد فریدہ جاوید فری صاحبہ نے منتخب کردہ کلام سنایا اور واد سیٹی۔ عطشہ زہرہ، نسیم نیازی، زمر نعیم، عائشہ امان اللہ جو کہ پہلے ریشم کا باورچی خانہ سنبھال رہی تھیں۔ سب نے ریشم سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر زمر نعیم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی بطور لکھاری ریشم کا حصہ بننا چاہتی ہیں۔ نئی لکھاری ریم رفیق بھی موجود تھیں۔ مگر انہوں نے کچھ کہنے کے بجائے صرف سننے پر اکتفا کیا۔

مرد حضرات میں غضنفر علی شاہد نے میلہ لوٹ لیا۔ انہوں نے اپنی چند غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ جن میں ”ماں“ کے عنوان کی نظم احساسات سے بھرپور تھی۔ قاسم فاروقی نے بشری مسرور صاحبہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ اتنی خوبصورتی سے کیا کہ وہاں بیٹھے سبھی لوگ Emotional ہو گئے۔ شاہجہاں منقل، نعیم رضا بھٹی، ڈاکٹر طارق محمود، آفتاب خان نے ریشم سے اپنی اپنائیت کا اظہار کیا۔ امان اللہ نیز شوکت نے بتایا کہ وہ لاہور میں آج کل ریشم کی ترویج کا کام کر رہے ہیں۔ آخر میں ایم اے راحت صاحب نے ریشم سے



ہوئیں۔ ایم اے راحت صاحب نے بتایا کہ وہ اب تک کئی کتابیں، ناول، ڈرامے لکھ چکے ہیں اور کوئی بھی موضوع ایسا نہیں رہا جس پہ ان کی کوئی تحریر شائع نہ ہوئی ہو۔ رائٹرز نے باری باری بشری صاحبہ سے اجازت طلب کرنا شروع کر دی اس طرح ایک خوبصورت شام کا اختتام ہوا۔

☆.....☆.....☆.....☆

## قاسم رشید فاروقی

ہر شخص اپنی ذات کے لئے چند پروگرام رکھتا ہے جن کا کسی بھی فرد کی خوشی یا ناخوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنی معروضی مصروفیات کا حصار توڑ کر، قلبی مجاہدات کی دادی میں داخل ہو جاتا ہے جہاں کچھ لوگ کرم خوردہ زنگ آلود گمان کا تابوت اٹھائے لہجہ بہ لہجہ فاصلے طے کرتے جاتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ آگے کیا ہے؟ یہ جانے بغیر کہ کب منزل طے کی مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ وہاں ایسے دیدہ ور بھی ملیں گے جو وابستگی کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے ہیں۔

ماہنامہ ریشم کراچی سے لکھتا تھا تو نہ معروف تھا نہ مقبول، بس ادب کی ایک طویل سرنگ کا معمولی سارر، باہمی روابط کا ایک بے ضرر سا وسیلہ تھا۔ مصطفیٰ ہاشمی جیسا قلم کار اپنی تمام توانائیاں، تمام جسمانی روحانی طاقتیں بروئے کار لانے کے باوجود اس معاشی طوفان بلا خیز کا تن تنہا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے قلم کی کاٹ ہمسر ڈائجسٹوں کے اشتہارات کا مقابلہ کرنے سے محروم تھی۔ رسالہ شائع ہوتا رہا اور ہاشمی دن بدن زیر بار ہوتا چلا گیا۔ اسے اس روایتی زندگی سے شدید نفرت تھی جو انسان پر انسان کے بنائے ہوئے قانون کے ذریعے مسلط کر دی جاتی ہیں۔ وہ سوتے جاگتے صدقاتوں کے خواب پرکھتا، محبتوں کے جال بنا اور اپنی تخلیق کو پھیلتا پھولتا دیکھنا چاہتا تھا۔

مصطفیٰ ہاشمی اس دور کا فرد نہیں، احتجاج اور مزاحمت اس کے خمیر میں نہیں کیونکہ مزاحمت نے اب

اپنے لگاؤ کا ذکر کیا اور کہا کہ میں ریشم پہ ایک ناسور ہوں۔ ان کے اس جملے سے کبھی لطف اندوز ہوئے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ لاہور کو ڈائجسٹس کے حوالے سے کراچی سے کم سمجھا جاتا ہے مگر ریشم نے اس بات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اس کے بعد ریشم کی ٹیم نے اپنی جدوجہد اور کاوش کے بارے میں بتایا کہ ریشم لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا اس وقت سب لوگ رات گئے تک جاگ کر کام کرتے تھے۔ ریشم کی پہلی Sale سے لے کر آج تک کے ساتھی سب وہاں موجود تھے اور یہ خوشی ان کے چہروں سے جھلک رہی تھی کہ جس پودے کو انہوں نے لگایا تھا اب وہ ایک تناور درخت بن گیا ہے اور اسی کی چھاؤں تلے یہ تقریب رکھی گئی تھی۔ خوشی کے طے جملے احساس کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں اس بات کا عزم اور حوصلہ بھی تھا کہ ابھی یہ ان کی منزل نہیں اور وہ بشری مسرور کی سربراہی میں ریشم کو مقبولیت کی نئی بلندیوں تک لے کے جائیں گے۔ (انشاء اللہ)

اس کے بعد میزبان محفل نے اعلان کیا کہ ہال میں چائے تیار ہے اس سے لطف اندوز ہو کر پھر فوٹو سیشن ہوگا۔ باوردی پیرے مستعدی سے مہمانوں کو لوزامات سرو کر رہے تھے۔ بشری مسرور اپنائیت بھرے انداز میں فرائض میزبانی انجام دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی اپنے رائٹرز سے مکمل مل گئی تھیں۔ کہیں کہانی نہ لکھنے کے گلے شکوے ہو رہے تھے، کہیں خط کے کٹ جانے کا افسوس۔ دوستوں کے ساتھ تصویریں کھینچوانی جا رہی تھیں۔ کبھی لوگ ریشمی ڈور سے بندھے ایک دوسرے کی جانب کھینچ رہے تھے۔

اس کے بعد فوٹو سیشن ہوا اور ساتھ ہی ایک خاتون مہمان جن کا تعلق شعبہ تعلیم جیسے قابل احترام پیشہ سے تھا انہوں نے بشری صاحبہ سے ان کی Inspiration اور لکھنے کے آغاز کے بارے میں پوچھا۔ نئے اور پرانے لکھاریوں میں فراق، میر، سودا، داغ کی باتیں

سے قلم کار لکھاری ”وسٹک“ دے کر اندر آچکے ہیں اور بہت سے آنے کی راہ تلاش رہے ہیں، بھلا جہاں لذتوں بھرا ”باورچی خانہ“ ہو، جہاں علم و آگہی و عرفان کے چشمے جاری ہوں ”الف سے اچھے پ سے بچے۔“ آپ کے روبرو ہوں وہاں پر خیال ہر سوچ امکان بھری نہ ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟

☆.....☆.....☆.....☆

کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے.....!

ریشم کی ریشمی نشست کا سحر ابھی تک ذہن و دل کو گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ اس ریشم گاہ میں ہم نے جو دیکھا اس کے بارے میں اجازت چاہتے ہیں کہ ادب و آداب کی چادر کا تھوڑا سا گوشہ سرکا کر جو دل میں ہے کہہ دیں۔ صدق دل سے کہتے ہیں کہ ”جو کہیں گے سچ کہیں گے، سچ کے سوا کچھ نہیں کہیں گے۔“

ہم حلف اٹھا کر کہتے ہیں کہ شرکاء محفل کا ہر فرد ہمارے دل میں تمام مقدس جذبوں سے منسلک ہے اور کسی کی اہانت یا الفاظ کی ترتیب سے کسی کی تشہیک مقصود نہیں۔ اگر ہماری یہ تحریر ”ناگوار خاطر“ ہو تو اسے رد فرما دس..... اور اگر.....

بدتمیزی، ناشائستگی، گستاخی اور بے ادبی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے وہ ایسی ماں ہے جو اپنے بچے کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں لگاوٹ لانے کے لئے اپنی ذات کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی شاید ایسا ہی کوئی لمحہ ہوگا۔ جب ہاشمی نے اپنی اولاد بشری مسرور کے حوالے کر دی۔ ماں جب اپنی اولاد دکی اور کوسونپتی ہے تو وہ ہمیشہ ماں ہی کو چھٹی ہے کبھی کسی ماں نے اپنا بچہ کسی باپ کو نہیں دیا، ایک ماں ہی دوسری ماں کا درد سمجھ سکتی ہے۔ ایک ماں ہی بچے کی بہترین پرورش کر سکتی ہے۔ اس طرح ماہنامہ ریشم کراچی کی بے رحم لہروں سے دور لاہور کے مرغزاروں میں آن بسا۔

بشری کی آنکھوں میں ریشم کے تانناک مستقبل کے خواب تھے اور اس خیف بچے کو توانا بنانے کا عزم اس نے اپنے دن رات اس کے نام وقف کر دیئے، خوب صورت گیٹ اپ کی شکل میں بہترین لباس مہیا کیا، ادیبوں، شاعروں، قلم کاروں کا ذخیرہ یکجا کر کے اس بچے کی بہترین خوراک کا انتظام کیا، مختلف شہروں کے بیشتر سٹالوں میں نمایاں مقام دلا کر سرکولیشن کا اہتمام کیا۔ یوں وہ بچہ جو ہمک ہمک کر ماں کی گود میں آنے کو بے چین تھا بشری کی آغوش میں آ کر اترنے کو راضی نہیں وہ کمزور مرنی سا بچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اسے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہے۔

تھا۔

پھر محترمہ بشریٰ صاحبہ نے شرکاء سے خطاب کیا۔ سچ کہیں..... ہم نے کچھ نہیں سنا۔ ہم تو ان کی مہین اور نغمہ بار آواز کے بحر میں ڈوب گئے جو کچھ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کہا یقیناً خوبصورت الفاظ سے مرصع ہوگا..... اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن بس..... ہمیں بھائی غفنغر سے شرمندہ ہونا پڑے گا جو بہت مشکل سے چپ ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆.....☆

## شاہجہاں مغل

ریشمی ڈور میں بندھے ریشمی پروانے ”ریشم ملن پارٹی“ کا مقررہ وقت شام پانچ بجے کا طے تھا مگر! میری بد قسمتی! کہ وہ دپہر ایک بجے سے جو میں مصروف ہوا اور ایسا مصروف ہوا کہ فراغت ہی نہ نصیب ہو رہی تھی۔ حالانکہ سارا پروگرام طے تھا۔ مگر! بزنس ڈیل کی میٹنگ میں پانچ گھنٹے صرف ہو گئے۔

بشکل پانچ بجے فراغت ہوئی اور فوراً گھر جا کر چیخ کیا اور آپ کی بتائی ہوئی مطلوبہ جگہ جا پہنچا اور جب گھڑی دیکھی تو سوا چھ بج چکے تھے۔ یعنی میں پورا سوا گھنٹہ لیٹ تھا۔

”بی بی“ کے گیٹ پر پاک آری کے جوان الٹ کھڑے تھے ان سے چیکنگ کروا کے بھاگم بھاگ اندر پہنچا۔

کوریڈور سے گزرتے ہوئے دائیں طرف کے دروازے پر دو معزز حضرات جو سفید کاشن کے شلوار سوٹ اور بلیک ویسکوٹ میں لمبوس تھے۔ انہیں دروازے پر بادب دیکھ کر اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ میٹنگ اس ہال میں ہے۔ وہ معزز حضرات نہایت شفق سے پیش آئے اور مجھے اندر ہال میں صوفے پر لا بٹھایا۔

اندر ہال میں فرنٹ کے صوفوں پر بھائی باہر فاروقی، بشریٰ آپی، کشاش مسرور اور مشعل فاروقی

گئے تھے، لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر طبیعت چل گئی۔ سب کچھ بہت اچھا لگا ہمارے گھمبیر تصور سے مختلف سادگی اور پرکاری کا امتزاج عجیب تھا۔ ایک جھلمل جھلمل، جگمگ جگمگ کرتی چھوٹی سی ٹریا نے جسے مشعل کہا گیا اور جو اسم باسکی بھی تقریب کا آغاز کیا۔ تلاوت کلام پاک ہوئی، شرکاء کا تعارف کرایا گیا اور پھر شعراء اور شاعرات سے ان کی نظم اور غزل کی فرمائش کی گئی۔ ہم سامع بھی تھے، دیدہ ور بھی۔ جو دیکھا جو سنا وہ یوں ہے کہ خوبصورت لباس، خوبصورت چہرے، خوبصورت آوازیں۔ زیادہ تر اپنے محبوب یا محبوباؤں کی بے وفائی یا جدائی کی شایاں تھیں۔ آوازوں کا سوز، الفاظ کی کسک دل لرز رہی تھی۔ شاید اس لئے بھی ہم نثر کے آدمی ہیں اور نثر نگار کا کوئی ذاتی محبوب نہیں ہوتا۔ وہ بس عموماً دوسروں کی کہانیاں سنا رہے۔ کچھ شاعرات کی آوازیں کی لرزش نے تو ہمیں برا فروختہ کر دیا اور دل چاہا کہ ان سے ان کے محبوب کا پتہ معلوم کر کے کہیں کہ ”ٹھہر تو سہی تیری.....!“، لیکن پھر سوچا کہ ممکن ہے یہ صرف اختراع پردازی ہو اور ہمیں شرمندگی اٹھانی پڑے۔ پھر یہ کہ وہ ہمیں پتہ کیوں بتائیں گی۔

ہاں کچھ کو اپنے جذبات اور تاثرات پر قابو تھا جیسے فریدہ جاوید فری صاحبہ۔ انہوں نے بڑے تحمل سے اس شخص کا تذکرہ کیا تھا جس کا بعد میں نجانے کیا ہوا۔

مرد حضرات بھی تھے، کچھ نے نظمیں اور غزلیں بھی پیش کیں۔ جوش ملیح آبادی نے قص کو اعضاء کی شاعری کہا، بالکل ٹھیک تھا۔ صنف نازک کا تو وجود ہی شعر ہوتا ہے۔ لیکن مرد حضرات کا شکوہ ہجر، اشعار کی پیروڈی لگتا ہے۔ کچھ شاعر حضرات کا تذکرہ ضرور کروں گا جنہیں سن کر مرحوم ”جون الیا“ یاد آگئے۔ مرحوم کو کوئی حسین چہرہ دیکھتے ہی اپنے سارے دیوان یاد آ جاتے تھے اور وہ کہتے۔ بی بی! یہ شعر یہ غزل صرف آپ کے لئے ہے۔ بات ایک غزل کی نہ رہتی اور بی بی سوچیں کہ ہائے میں باہر کدھر سے جاؤں۔ محترم بھائی فاروقی صاحب نے بہت متاثر کیا ان کا ہر لفظ پر تاثر

براجمان تھے اور باقی لائن میں ترتیب وار مہمان صوفوں پر بیٹھے تھے۔

میرے سوا گھنٹہ لیٹ پہنچنے پر کافی رائٹرز اور شعراء اپنا اپنا کلام سنا چکے تھے۔ (جس کا مجھے دلی طور پر رنج ہے) کہ میں سننے سے محروم رہا تھا۔

بہر حال! تب مائیک انکل غففر علی شاہد کے ہاتھ میں تھا۔ جنہوں نے اپنے کلام سے پوری محفل لوٹ لی اور خوب داد کمائی۔ خصوصاً انکل کے کلام ”بھول جاتا ہوں“ سے سارا ہال عیش عش کر اٹھا۔ انہیں میں ”ویلڈن“ کہتا ہوں۔ شاہد انکل کو کافی عرصہ پڑھا ہے مگر ملاقات پہلی دفعہ ہوئی اور شوق پورا ہو گیا۔ الحمد للہ! ان کے بعد عائشہ خان نے ریشم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا عائشہ جو کافی عرصہ ”ریشم کا بادورچی خانہ“ سنبھالتی رہی ہیں ان کو دیکھ کر یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی عائشہ ہیں؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ شاید کوئی کافی عمر کی تجربہ کار خاتون ہوں گی جیسے زبیدہ آپا، شیریں اور کوکب ملک وغیرہ۔

بہر حال عائشہ کا ماشاء اللہ اس کم عمری میں تجربہ بہت وسیع ہے اور اسی طرح اللہ جی انہیں کم عمری میں ہی ترقی کی مزید منزلیں عطا فرمائے۔ (آمین)

ان کے بعد انکل امان اللہ شوکت نیز جو کہ ”بجوں کا پرستان“ کے ایڈیٹر بھی ہیں انہوں نے ریشم کے متعلق اپنے خیالات و جذبات سے آگاہ کیا۔

ان انکل کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اپنے ڈائجسٹ کا ایڈیٹر ہونے کے باوجود ”ریشم“ کے لئے وقت نکالنا ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان کے بعد مائیک آیا ہماری بھادج گل بانو فاروقی کے ہاتھ میں انہوں نے بھی ”ریشم“ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خصوصاً اپنی زندگی میں گزرا ہوا واقعہ (چٹکھ) سنا کر سب حاضرین کو بہت محظوظ کیا۔ اللہ جی بابر بھائی اور ان کی جوڑی کو ہمیشہ سلامت رکھے اور آپس میں پیار و محبت میں کبھی کمی نہ ہونے پائے۔ (آمین)

ان کے بعد بشری آپنی کے سر تاج مسرور صاحب بیٹھے تھے مگر انہوں نے مائیک بغیر کسی تبصرے کے آگے بڑھا دیا۔ اور یوں انکل قاسم فاروقی نے ”ریشم“ اور بشری آپنی کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ”ریشم“ اور اپنی پیمیلی کے پیار کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اللہ جی انہیں بھی اپنی فیملی کے ہمراہ سلامت رکھے۔ (آمین)

ان کے بعد مائیک اچانک ہمارے ہاتھوں میں تھا دیا گیا اور تمام ہال کی نظریں جم گئیں اس وقت میں بہت ڈپر ہوا۔ گھبراہٹ کے عالم میں مجھ سے کچھ بولا ہی نہ جا رہا تھا۔ جبکہ ہاتھ اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

سچ ہے آپنی! میں اس قابل نہیں تھا نہ ہی ہوں نہ میں شاعر اور نہ ہی میں رائٹر ہوں۔ بس اگلے سیدھے الفاظ جو بھی لکھ دیتا ہوں انہیں آپ ہی سنواری ہیں اور ”ریشم“ کی زینت بناتی ہیں۔

میں نے 98ء سے اخبارات، دوسرے ڈائجسٹ وغیرہ میں لکھنا شروع کیا۔ مگر! وہاں جو بھیج دیا جائے وہ ہو بہ ہو شائع ہو جاتا ہے۔ کوئی اصلاح نہیں کوئی ایڈیٹنگ نہیں۔ مانا کہ اس طرح تحریر تو شائع ہو ہی جاتی ہے مگر اسے لکھنے والا لکھاری تو نہیں بن جاتا نا.....

جب میں نے پہلی دفعہ ”ریشم“ میں اپنا افسانہ ”انا کے غلام“ جنوری 08ء میں لکھا۔ اس میں کافی ایڈیٹنگ ہوئی۔ جس سے پتہ چلا کہ شاید میں جیسا لکھ رہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا۔ میرے خیال میں یہ اعزاز ”ریشم“ کو حاصل ہے کہ ”ریشم“ میں لکھنے سے انسان کو لکھنے کی تمیز، سلیقہ و شعور حاصل ہوتا ہے۔

آج میں جو جس مقام پر ہوں۔ میں اس قابل نہ تھا۔ یہ سب آپ کی محنت آپ کی اپنائیت سے حاصل ہوا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہم تو پتھر تھے۔ گونگے بہرے پتھر جسے آپ نے تراشا اور آج یہاں لا بٹھایا۔

میں بشری آپنی کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ دوسری بات یہ جو پادانی ہوئی ہے یہ ریشم کا بہت اچھا اقدام

ہے۔ جس سے تمام رائٹرز اکٹھے مل بیٹھے اور انہیں ایک دوسرے کی رائے سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔

تیسری بات! آج میں دعویٰ کرتا ہوں کہ جو کوئی ایک دفعہ ”ریشم“ کو پڑھ کر، اس میں لکھ کر اس ”پیار بھری“ فیملی میں شامل ہو کر کسی بھی وجہ سے چھوڑ دے۔ آخر کبھی نہ کبھی دوبارہ اس میں ضرور شامل ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ پیار اور اپنائیت کسی اور ڈائجسٹ میں نہیں مل سکتی۔ اللہ جی ”ریشم“ اور ریشم فیملی کا سایہ ہم پہ ہر وقت ہر دم قائم و دائم رکھے۔ (آمین)

وقفہ نماز کے بعد بھائی عرفان رامے نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہمارے قارئین کی تعریف کے ساتھ ان کی اصلاح تنقید ہی دراصل ریشم کو نکھارنے اور سنوارنے میں مدد دیتی ہے اور ہم تعریف کے ساتھ تنقید کا بھی کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور پھر ایم اے راحت انگل نے بھی بہت مفید مشورے سے نوازا اور ”ریشم“ کے لئے اپنی اپنائیت اور محبت کا ثبوت دیا۔

میری بشری آپلی سے درخواست ہے کہ ایسی پارٹی سال میں کم از کم ایک دفعہ ضرور ہونی چاہیے۔ اللہ جی بشری آپلی اینڈ فیملی کو ہمیشہ ہمیشہ سلامت اور خوش و خرم رکھے اور انکا سایہ ہم پر رکھے۔ (آمین)

☆.....☆.....☆.....☆

## ریم رفیق

خوش آمدید سے کھلا خوشیوں کا در.....

جولائی کی صبح ہم ابھی چائے یعنی ”بیڈی“ پی رہے تھے۔ ”ماہنامہ ریشم“ کی سب ایڈیٹر کا فون آیا۔ ہیلو ہائے کے بعد مشعل فاروقی نے کہا کہ آج کی شام ہمارے نام کر دیں۔ ہم نے بے ساختہ پوچھا کہاں؟ بولیں ”آفیسر میس بی“ میں ماہنامہ ریشم کی تقریب ہے ٹھیک پانچ بجے آجائے گا اور ہم نے وعدہ کر لیا پہنچنے کا۔ ہم بہت خوش تھے کہ ریشم کے لکھاریوں کے ساتھ ساتھ ریشم کی ٹیم سے بھی ملاقات ہوگی۔ جس

کا ارمان ایک عرصہ سے ہمارے سینے میں پل رہا تھا۔ اس دن سے جس دن ریشم کو بشری مسرور نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے لپیٹا تھا۔ خوشی کے مارے ہم نے وارڈروب سے تمام کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کر دیئے۔ یہ نہیں کہ کچھ ایسا کہ ہم بھی ریشم نظر آئیں (ادا کارہ ریشم نہیں)

آخر کچھ نہ سمجھ میں آنے پر ہم نے اپنا سادہ فیروزی سوٹ منتخب کیا۔ ہم وہاں پہنچے تو استقبال مشعل فاروقی، بابر اور طلحہ مسرور نے کیا۔ سب بہت پیارے لگ رہے تھے ریشم کے ریشمی خوبصورت بچے۔

اندر گئے تو ہال کے دروازے پر سب سے پہلے عرفان رامے سے سامنا ہوا۔ انہوں نے بھی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور ہم ہال میں جا بیٹھے۔

تقریب میں باقی ٹیم کے ممبرز بھی موجود تھے اور آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تمام مہمان وقت مقررہ پر موجود تھے۔ یہ ہم نے پہلی بار دیکھا کہ کسی بھی تقریب میں سارے کے سارے مہمان وقت پر آئے ہوں۔

تقریب کے آغاز کے لئے مشعل فاروقی نے مائیک سنبھالا۔ جو کہ اپنی جونیئر بچوں کے صفحے کی نگران کشائش مسرور اور ان کی ماما بشری مسرور کے ساتھ سامنے صوفے پر براجمان تھیں۔ تینوں پر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ مشعل اور کشائش اپنے اپنے ”ڈریسز“ میں بڑی کیوٹ لگ رہی تھیں۔

بشری کی تو چھب ہی زالی تھی۔ وہ خوبصورت میرون اور کریم گلر کے امتزاج سے بنی بنگالی ساڑھی میں اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ ہم نے ان پر ”آیت الکرسی“ پڑھ کر پھونکی۔ بشری کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہر ڈریس انہیں کے لئے ہے۔ وہ جو لباس بھی پہنیں ان کے پہننے سے خوبصورت ہو جاتا ہے۔ ادھر سے نظر اٹھا کر دیکھا تو بشری کے ساتھ والے صوفے پر بابر فاروقی کو دیکھا۔ بے ساختہ منہ سے ”ماشاء اللہ“ نکلا۔ شادی کے بعد بھی بابر کی وہی معصومیت نظر آئی جو

کہ ”نوک جھونک“ کے کالم کی تصویر میں تھی۔

بابر کے بائیں ہاتھ والی لائن میں ایم اے راحت اور ایک صاحب جو کہ شکل سے تو فوجی لگ رہے تھے اور دوسرے ”میل“ لکھاری بیٹھے تھے۔ مشعل کے دائیں ہاتھ پر نوشین ناز اختر اور دوسری رائز پر بیٹھی تھیں۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا۔ مائیک سنبالنے کا۔ مشعل نے اپنی خوبصورت آواز اور ادائیگی کے ساتھ بشری مسرور سے تقریب کی کارروائی کا آغاز کرنے کی اجازت مانگی۔

سب سے پہلے انہوں نے دعوت دی طلحہ مسرور کو کہ آ کر تلاوت کلام کریں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا گورا سا نو عمر لڑکا جس کی آنکھیں بہت شفاف اور چمکدار تھیں۔ ”پنپے تلتے“ قدموں سے مائیک کی طرف بڑھا اور تلاوت کا آغاز کیا۔

طلحہ کی یہ خوبی ہمیں وہیں بیٹھ کے معلوم ہوئی کہ ”طلحہ“ صرف ایک اچھا گلوکار ہی نہیں بہترین قرأت کے ساتھ تلاوت بھی کرتا ہے۔ ”جیوندارہ تے لبان عمراں“ (آمین ثم آمین)

فوجی باپ اور لکھاری ماں کا بیٹا طلحہ بہت اچھا گاتا ہے۔ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ بشری مسرور نے لکھاریوں کو دعوت دی کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کو ”شیر“ کریں۔

سب سے پہلے مائیک لیا ”نوشین ناز“ نے جنہوں نے کہا کہ امید نہیں تھی کہ ریشم لاہور سے شائع ہو کر ڈائجسٹوں میں اپنا مقام بنا لے گا۔ لیکن بشری مسرور نے ثابت کیا کہ وہ ایک فوجی کی بیگم ہیں انہوں نے اپنی محنت، کوشش اور حوصلے سے ریشم کو یہ مقام دلایا ہے۔ ان کے بعد فریدہ جاوید فری صاحبہ نے منتخب کردہ کلام سنایا۔ اور داد و وصول کی۔ عطیہ زہرہ، نسیم نیازی، زمر نسیم، عائشہ امان اللہ جو کہ پہلے ریشم کا باور پتی خانہ لکھ رہی تھیں۔ سب نے ریشم سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ زمر نسیم نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ بھی ریشم کا حصہ بننا چاہتی ہیں۔ جس پر بشری نے انہیں ”ویلم“

کیا۔ مرد حضرات میں غضنفر علی شاہد نے داد و تحسین سے محفل کو لوٹ لیا۔ انہوں نے اپنی چند غزلیں اور نظمیں سنائیں جن میں ”ماں“ کے عنوان کی نظم جذبات اور احساسات کی غمازی تھی۔

قاسم فاروقی نے بشری مسرور کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے بتایا کہ 1977ء میں جاگیر فرائیگ سبنے والی بیٹی آج خود رائٹر ہے۔ جو کہ اس وقت ان کے کتابیں پڑھنے سے ”خفا“ تھی۔ قاسم فاروقی کی پر اثر گفتگو پر وہاں بیٹھے سبھی لوگ Emotional ہو گئے۔

شا جہاں مغل، ڈاکٹر طارق محمود، آفتاب خان، نسیم رضا بھٹی سبھی نے ریشم سے اپنائیت کا اظہار کیا۔ امان اللہ نیز شوکت نے بتایا کہ وہ لاہور میں آج کل ”ریشم“ پھیلاؤ سکیم پر کام کر رہے ہیں۔ آخر میں ایم اے راحت صاحب نے ریشم سے اپنے لگاؤ کا اظہار کیا اور کہا کہ میں ریشم پر ایک ”ناسور“ ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لاہور کو ڈائجسٹس کے حوالے سے کراچی سے کم سمجھا جاتا ہے۔ مگر ریشم نے اس بات کو غلط ثابت کیا۔ ان کے اس جملے کا سبھی نے باری باری اعتراف کیا۔ پھر ریشم کی ٹیم نے اپنی لگن اور جدوجہد کے بارے میں بتایا کہ جب ریشم لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا تو۔ اس وقت سب لوگ کس طرح رات گئے تک کام کرتے تھے۔ بابر فاروقی نے بتایا کہ ”ایم بی اے“ کے بعد سب سے پہلا کام جو انہوں نے کیا تھا۔ وہ ”دس ریشم“ رسالوں کی سیل تھی۔ اس وقت بابر ریشم کے سرکولیشن منیجر بھی تھے۔ لاہور میں ”ریشم“ کو پھیلانے کا پہلا ”سہرا“ بابر کے سر ہے۔ اور پھر ریشم کی ”نوک جھونک“ تو انہیں ایک اداکار سے زیادہ مشہور کر گئی۔ جہاں بھی کہیں کوئی بابر کو پہچان لیتا تو بابر کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ بشری مسرور نے بھی سنایا اور بتایا کہ وہ لڑکی جو کہ بابر کے فراق میں دیوانی تھی۔ کس طرح سر سے اتاری۔ اس بات کا گلہ بابر کی بیوی کو بھی تھا۔



عرفان رائے کے ساتھ کمپوزر شہزاد اور نئے کرولین فیبر علی بھی موجود تھے اور لکھاریوں کے درمیان تشریف فرماتھے۔

ہاں راشدہ انور بھی موجود تھیں جو کہ پہلے سلائی کڑھائی اور اب ریشم کے باورچی خانہ میں ہیں۔ کیا بات ہے بھئی واہ..... راشدہ انور خوبصورت ریڈشن کا مدار ریشمی سوٹ میں پورا ریشم کا تھان بنی ہوئی تھیں۔ اوہو..... (منہ نہ پھلاؤ مذاق سے کہا ہے یار)..... طلحہ مسرور مسلسل فونو گرافی میں مصروف رہے۔ غرض یہ کہ پوری ٹیم کے چہرے تو چہرے آکھوں تک سے اپنی کامیابی کی خوشی جھلک رہی تھی۔ اور ایک عزم نظر آ رہا تھا۔ آگے بڑھنے کا محنت کرنے کا، پھر ہم نے تصور کی آنکھ سے ”مصطفیٰ ہاشمی“ کو کونے میں کھڑے مسکراتے دیکھا۔ جو کہ ریشم کی کامیابی پر نازاں تھے۔ اور کہہ رہے تھے دیکھا میرا فیصلہ۔ میں نے ریشم کو صبح ہاتھوں میں دیا۔ کتنی پرکھ ہے مجھے لوگوں کی۔ میں جانتا تھا کہ بشری سنبھال لے گی اور ایسا ہی ہوا ہے اور یہ ٹیم ریشم کو اور بلند یوں پر لے جائے گی۔ آمین ثم آمین۔ بہت بہت مبارک ہو مصطفیٰ ہاشمی بھائی۔

پھر میزبان نے اعلان کیا کہ ہال میں چائے تیار ہے۔ اس کے بعد میں فونو سیشن ہوگا۔

باوردی بیرے مستعدی سے مہمانوں کو لوازمات سرو کر رہے تھے۔ بشری مسرور مسکرا مسکرا کے حق میزبانی ساتھ ساتھ رائٹرز سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کر رہی تھیں۔ اس کے بعد واپس ہال میں آگئے اور فونو سیشن ہوا۔ ساتھ ہی رائٹرز نے بشری مسرور سے جانے کی اجازت لی مہمانوں کے جانے کے بعد جب صرف ریشمی ٹیم اور چند گئے جنے مہمان رہ گئے۔ تو کسی نے طلحہ مسرور سے گانے کی فرمائش کر ڈالی۔ طلحہ اپنا گٹار لانا بھول گئے تھے۔

کشاں میس روم سے ان کا ”گٹار“ لینے گئیں۔ تو عبد اللہ مسرور نے اپنی خوبصورت آواز کا جادو جگایا۔ جو لوگ موجود تھے وہ عبد اللہ کی ”گائیکی“ سے بہت متاثر تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ تو ساری فیملی ہی ”میلیڈز“

ہے یار.....

گٹار آنے پر ”طلحہ مسرور“ نے فرمائش پر گانے سنائے اور داو وصول کی۔ گانے کی اس محفل میں حمزہ مسرور کی بھی کمی محسوس ہوئی وہ بھی بہت اچھا گاتا ہے۔ اللہ ان سب کی عمر دراز کرے اور اپنی امان میں رکھے۔ (آمین ثم آمین)

وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ دل تو ایک اور اپنی پسند کا گانا سننا چاہ رہا تھا لیکن گھڑی پر نظر ڈالی تو بانی لوگوں نے بھی جانے کی اجازت چاہی ہاں ہم شاہجہاں مغل کو دیکھ کر انہیں بتائے بغیر نہ رہ سکے کہ آپ اپنے نام کا متضاد ہیں۔ یعنی کہ بھاری بھر کم نام والا ”دبلا پتلا“ شاہجہاں

سب کے ساتھ ہم نے بھی اجازت چاہی اور ہم بھی روانہ ہوئے ریشم کی ریشمی یادوں کے ساتھ۔

دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی برسات بشری مسرور پر برساتے رہیں۔ اور ریشم اس طرح کی محافل سجاتا رہے۔ (آمین ثم آمین)

چلتے چلتے ایک بار پھر ”ریشم“ کی ٹیم کو کامیابی کی مبارکباد

☆.....☆.....☆.....☆

## بینا عالیہ

### ذکر الہ ریشمی ملاقات کا.....

پہلے تو ریشم کی بات کروں گی کہ مجھے جب بھی موقع ملا میں نے اسے تفصیل سے پڑھا ہر بار اس کا معیار پہلے سے کہیں زیادہ بہتر پایا۔ ایم اے راحت اور آپ کا ناول اچھا جا رہا ہے۔ عرفان کی تاریخی کہانیوں کا بھی جواب نہیں۔

اب ریشم کی ادبی تقریب کی جانب آتی ہوں جو ایک پروقار سادہ سی تقریب تھی رائٹرز برادری کو اکٹھا دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ جب ہال میں اتر ہوئی تو سب سے پہلے بشری مسرور پر نگاہ پڑی جن کی شخصیت سے میں بے حد مرعوب ہوئی۔ سفید ساڑھی میں بہت ہی

تقریب میں پیش پیش رہے۔  
 سب ایڈیٹر مشعل فاروقی نے ریشم کی ترتیب میں  
 پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد  
 زبردست قسم کی چائے تھی۔ سبھی ایک دوسرے سے گپ  
 شپ لگاتے رہے۔ سب رائٹرز نے بشریٰ اور مسرور  
 صاحب سے لمبی چوڑی باتیں کیں ریشم کی باتیں ہوئیں  
 آئندہ آنے والے دنوں کی بات ہوئی۔ نوبے کے  
 قریب سب سے پہلے ایم اے راحت صاحب نے  
 رخصت چاہی۔

پھر آہستہ آہستہ باقی مہمان رخصت ہونے لگے  
 بشریٰ اور مسرور صاحب سب کا شکریہ ادا کرتے رہے اور  
 دوبارہ مہمانوں سے تقریب میں آنے کا وعدہ لیتے رہے۔  
 نسیم نیازی عمرے پر جانے کی خاص مبارک باد قبول کرو۔  
 خداوند تمہاری تمام حاجات پوری کرے آمین اور ہم گناہ  
 گاروں کو بھی اپنے درحیث پر بلائے۔ آمین۔  
 آخر میں بشریٰ اور تمام اراکین ریشم کا شکریہ ادا  
 کروں گی جنہوں نے اتنی عزت سے ہر مہمان کو نوازا  
 اللہ پاک ریشم کو بے پناہ کامیابیوں اور کامرانیوں سے  
 نوازے آمین۔ اجازت چاہوں گی۔

☆.....☆.....☆.....☆

## فریدہ جاوید فری

ریشمی تقریب نے دل موہ لیا.....

ڈیزر بشریٰ جی!

السلام علیکم: جب وائے صاحب کا فون آیا کہ ریشم  
 کی رائٹرز کی تقریب میں شرکت کرنا ہے۔ جو کہ کیٹ  
 میں ہونا تھی ہفتہ کے روز ہم بھی تیار ہو کر پہنچ گئے۔  
 جہاں سب سے تعارف ہوا سب مخلص ہو کر ملے ج  
 زندگی میں ایسی تقریب میں شامل ہونے کا موقع ہی  
 نہیں ملا۔ آپ نے بہت ہی اچھا انتظام کیا تھا ہال میں  
 سب جمع تھے۔

نسیم نیازی، عطیہ زہرہ، نگہت اکرم، نوشین ناز اختر،  
 مینا عالیہ اور زمر نسیم بھی تھیں بھائی صاحبان میں عرفان

خوبصورت مہمانت بھری مدبر پرسنائی کی صورت میں  
 دکھائی دیں۔ ان کے ساتھ ان کی پیاری سی بیٹی بیٹی  
 تھی۔ ساتھ ان کی بھانجی مشعل فاروقی تھیں جو ریڈ لباس  
 میں ملبوس تھیں۔ بشریٰ کے ساتھ والی نشست پر بابر  
 براجمان تھے۔ ساتھ ہی ایم اے راحت صاحب  
 تشریف رکھتے تھے ان کے ساتھ رائٹر اور شاعر حضرات  
 تھے اسی لائن میں نسیم نیازی کے شوہر نامدار اختر محمود  
 نیازی براجمان تھے۔ ان کے فرنٹ پر نسیم نیازی، زمر  
 نسیم، فریدہ فری، نوشین ناز اختر، ریم رفیق اور راشدہ  
 انوار تشریف فرما تھیں اور بھی رائٹرز تھیں جن کے نام  
 میں نہیں جانتی میں سب سے آخری مہمان میں تھی چند  
 مہمان اٹھ کر پیچھے چلے گئے اور ہمیں بیٹھنے کی سیٹ دی  
 ان معزز حضرات کا میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی میرے  
 پیچھے سے پہلے تقریب کا آغاز ہو چکا تھا کافی مہمان اپنا  
 تعارف کرا چکے تھے جب میں پہنچی تو ایک نوعمر شاعر اپنی  
 غزل سنا رہے تھے۔ بہت خوبصورت غزل تھی انہوں  
 نے خوب داد و وصول کی بشریٰ مسرور کے ہاتھ میں مائیک  
 دیا گیا انہوں نے ریشم کی بابت چند باتیں کیں اور  
 قریب بیٹھے بابر کو مائیک پڑا دیا۔ جنہوں نے اپنے کام  
 کے متعلق اپنا تعارف کرایا۔

پھر ایم اے راحت صاحب کے پاس مائیک آیا۔  
 انہوں نے اپنے ادبی سفر کا ذکر کیا اپنی ان گنت تخلیقات  
 کے بارے میں بات کی مائیک میرے پاس آیا کچھ سمجھ نہ  
 آتے ہوئے بھی ہم نے اپنا تعارف کرا دیا ریشم کے متعلق  
 بھی بات کی یعنی اپنے خیالات کا اظہار کیا کچھ زوریں ایسے  
 ہوئے ہم کہ اپنے افسانوں کی تعداد ایک سو سے زائد بتائی  
 یہاں وضاحت کروں گی ڈھائی سو سے زائد میرے  
 ناول منی ناول اور افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

مغرب کی نماز خواتین و حضرات نے میس کے  
 الگ الگ کمروں میں ادا کی۔ اس کے بعد سب لوگ  
 آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ عرفان سے شاعری کی  
 فرمائش کی گئی انہوں نے کہا میں اپنا ناول سنا دیتا ہوں  
 مسرور صاحب اور ان کے دونوں صاحب زادے

راے، غففر علی شاہد، طارق محمود اور جو بہت ہی معزز ہستی ایم اے راحت صاحب بھی تشریف لائے تھے سب سے پہلے بشریٰ مسرور نے خطاب کیا۔ ان کی مترنم آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

مشعل فاروقی بھی بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ پھر ان کے بیٹے طلحہ مسرور نے تلاوت کلام پاک سے آغاز کیا پھر باری باری سب نے اپنا کلام سنایا سب کی نظمیں غزلیں بہت ہی اچھی لگیں۔ ہم نے بھی ایک عدد اپنی غزل سنا کر بشریٰ مسرور کی پچاس کشائش وغیرہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔

پھر سب نے مغرب کی نماز پڑھی اس کے بعد چائے کا دور چلا ساتھ میں بہت سے لوازمات تھے۔ جو سب کے سب مزیدار تھے بہر حال تقریب بہت ہی اچھے طریقے سے انجام پائی اور ہمیں ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوئی۔ اس طرح کی تقاریب ہونا چاہئیں کیونکہ فون پر تو باتیں ہوتی رہتی ہیں رو برو ملنے کی بات اور ہے۔

☆.....☆.....☆.....☆

## عطیہ زاہرہ

### کیا لکھوں ریشمی تقریب پر..... ۹

بشریٰ آپ آپ کے حکم پہ ریشم کی تقریب پر تاثرات لکھنے تو بیٹھ گئی ہوں۔ لیکن سوچ رہی ہوں اب کیا کروں؟ کیونکہ ٹھیک قلم تھامتے ہی بجلی صلبہ دعا دے گئی ہیں۔ لیکن خیر..... ہم تو ابھی تقریب پر اپنا تبصرہ کریں گے۔ کیونکہ صبح ہر حال میں پوسٹ کرنا ہے۔ اس لئے مصنوعی روشنی زندہ باد!

ہاں تو جناب جب ریشم کی تقریب میں شمولیت کا فون آیا۔ ہم نے تو اس دن سے تیاریاں شروع کر دیں۔ کیونکہ یہ تقریب، خالص کوشش تھی ان لوگوں کو آپس میں ملانے کی۔ جو اک دوسرے کو صرف نام یا ان کے کام کے حوالے سے جانتے تھے۔ یہاں ان سب لوگوں کو رو برو ملنے کا موقع ملنے والا تھا۔ اسی لئے جب

میں تین جولائی کو تقریب میں گئی تو وہاں کچھ کچھ جانے پہچانے چہرے نسیم نیازی، فریدہ جاوید فری، نگہت اکرم اور سب سے بڑھ کر راحت صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ابھی ہم ایک دوسرے سے مل ہی رہے تھے کہ اک پیاری سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ خوبصورت سالہاس نازک سے جوتے ہلکا سا میک اپ اور اس کے ساتھ ڈینٹ سی ساڑھی میں کچھ کچھ جانا پہچانا چہرہ سامنے آیا تو سب ہی آنے والی ہستیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں اک تو نازک سی مشعل فاروقی تھی اور دوسری بشریٰ آپ تھیں۔

اپنا تعارف کروانے کے بعد جب مرحلہ باقی لوگوں کے تعارف کا آیا۔ تو سب ہی متحس تھے۔ ہر اک اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ اپنا کلام یا اقتباس سناتا چلا گیا۔ اک پر تکلف سی فضاء ہر طرف چھا گئی تھی اور جب باری راحت صاحب کی آئی تو ان کا یہ جملہ کہ ”میں ریشم کے صفحات پر اک ناسور ہوں“ محفل کو قہقہوں سے پر کر گیا۔ کیونکہ دراصل یہ جملہ ان کا اپنے ناول ناسور کے حوالے سے تھا۔ اس دوران تصاویر اترنے کا سلسلہ جاری و ساری رہا اور آخر کار نماز کے وقفے کے بعد بشریٰ آپ نے سب کو چائے کی دعوت دی۔ تو سب ہی ان کی بیروی میں ساتھ والے کمرے کی جانب چل دیے۔ بشریٰ آپی صبح میں وہاں سب بہت زبردست تھا۔ کھانے کا انتظام اور چائے وغیرہ..... خیر اس وقت سب کو کھل کر اک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا۔ گفتگو کہاں سے کہاں چلی گئی۔ وہیں پر اک دوسرے سے موبائل نمبرز کا تبادلہ ہوا۔ اور عاکشہ خان سے دوستی ہوئی اور پھر بشریٰ آپی آخر پر جو فوٹو سیشن کا سلسلہ چلا وہ بہت دلچسپ تھا۔ اتنے لوگ بے چارے کمرے کی آنکھ میں سما ہی نہیں رہے تھے۔ بے چارے طلحہ نے جانے کس طرح ان کو کمرے کی آنکھ میں قید کیا جو بھی تھا لیکن آپ کی سب کو ملانے کی کوشش بہت پر خلوص تھی۔ اس کے لئے شکریہ۔

☆.....☆.....☆.....☆

## نگہت اکرم

شکریہ ادا کرتے ہوئے مائیک لے لیا اور اپنا تعارف پیش کیا پھر یہ سلسلہ چل نکلا تو تمام رائٹرز نے اپنا تعارف پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ڈائجسٹ کو منظر عام پر لانے کے لئے مصروف عمل ہونے والے بابر فاروقی، مشعل فاروقی، مسز بابر فاروقی، راشدہ، عائشہ خان، امان اللہ نیئر شوکت نے اپنے اپنے تجربات بیان کئے جو کہ کافی انٹرسٹنگ تھے۔

تقریب کے حوالے سے بشری مسرور کا انداز بے ساختہ اور پر خلوص بھی تھا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی رقص کر رہی تھی۔

تمام رائٹرز اور ریٹم کا عملہ آپس میں ایسے لگ رہا تھا جیسے سب پہلی بار نہیں مل رہے یوں لگتا تھا جیسے برسوں پہلے ہی کہیں ملے ہوں۔

رائٹرز کسی بھی رسالے کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ آج کے اس دور میں رسائل کی دنیا میں ایک ڈائجسٹ کو نکھارنا اس کو کامیابی سے چلانا توجہ باندھے رکھنا کہانیوں میں موضوعات میں، کالم میں دلچسپی کا عنصر قائم رکھنا غیر معمولی بات نہیں۔ بشری مسرور ریٹم ڈائجسٹ کو اس لیول تک لے آئیں کہ یہ لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں گھر کر گیا ہے۔

فریدہ جاوید فری نے اپنا تعارف پیش کرنے کے بعد ایک خوبصورت غزل سب کی نذر کی غزل کا ایک شعر متاثر کر گیا۔

اکھیاں چھم چھم برس ایسے

بن بادل برسات ہوئی تھی

تجھ کو پا کر کھودینا

جیتی بازی مات ہوئی تھی

شاہ جہاں مغل نے اپنا تعارف کروایا اور ساتھ ہی ریٹم سے کیسے منسلک ہوا اچھے انداز میں رائٹرز تک پہنچایا۔

نوشین ناز اختر، نسیم نیازی، عطیہ زہرہ، زمر نعیم، مینا عالیہ نے اپنے تعارف اور اپنی تحریروں کے بارے میں

باتیں تو ہوں کہ کچھ دلوں کی خبر ملے آپس میں اپنے کچھ تو جواب و سوال ہوں

(منیر نیازی)

شاید اسی خیال کے تحت بشری مسرور صلبہ نے ریٹم رائٹرز کے ساتھ ایک تقریب ایک شام منانے کا سوچا اور اس تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ 2 جولائی 2011ء ان کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے بھی اس تقریب میں آنا ضروری سمجھا۔ ریٹم ڈائجسٹ کی تقریب میں آنا کسی بھی ڈائجسٹ کے حوالے سے ہونے والی تقریب میں میری شرکت کا پہلا موقع تھا۔

میں جیسے ہی تقریب میں شرکت کے لئے آئی تو میں نے محبت اور خلوص کو چھلکتا دیکھا خوبصورت کوئل سی مشعل فاروقی اور نازک سی بھولی بھالی کشکش مسرور کے لبوں میں جنہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

جیسے ہی میں ہال میں داخل ہوئی ایک طلسماتی ماحول نظر آیا میں نے ادھر ادھر دیکھا تو کچھ اجنبی کچھ شناسا چہرے نظر آئے جن میں نسیم نیازی، عطیہ زہرہ، فریدہ جاوید فری، نعیم رضا بھٹی، ایم اے راحت، عرفان رائے، عفتنظر علی شاہد، امان اللہ نیئر شوکت، آفتاب خان۔

مجھے آئے ہوئے کچھ پل ہی گزرے ہوں گے میں نے پھر ہال کا جائزہ لیا تو بشری مسرور مسکرائیں بکھیرنی دلکش انداز میں اپنی خوبصورت پرسنلٹی کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں۔

مشعل فاروقی کا نرم، کوئل انداز ساعتوں سے نکرایا اور تقریب کا آغاز ہو گیا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا۔ تو بشری مسرور نے اپنے خوبصورت انداز سے سب کو خوش آمدید کہا اور تقریب کا مقصد بیان کیا پھر مشعل فاروقی نے تمام رائٹرز سے کہا کہ اپنا تعارف پیش کریں اور مائیک نوشین ناز اختر کو دیا نوشین ناز نے مشعل فاروقی کی تعریف کرتے ہوئے اور

نہایت خوبصورتی سے گوش گزار کیا۔ غنفر علی شاہد منگلا سے تشریف لائے تھے۔ غنفر علی شاہد کا اپنا ہی ایک انداز تھا بولنے اور تعارف پیش کرنے کا انہوں نے ماں ٹاپک پر غزل سنائی غزل کا ایک شعر تھا:

موزن دل میں ایسی مدیت ماں کی  
ہر قدم پر ہے ملی مجھ کو محبت ماں کی  
غنفر علی شاہد نے اپنی نظم ”میں بھول جاتا ہوں“ سنائی جس نے ماحول کو کافی خوشگوار بنا دیا۔

ڈاکٹر طارق سیالکوٹ سے آئے تھے۔ اپنا تعارف پیش کیا اور آخر میں ایک پیغام نماز کی باقاعدگی کریں۔ تلاوت کریں اللہ تعالیٰ سب کی پریشانیاں دور کرے اور اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔ زبردست اور کارآمد لگا۔

آفتاب خان نے اپنا تعارف پیش کیا انہوں نے اپنا کلام بھی پیش کیا۔

نعیم رضا بھٹی منڈی بہاؤ الدین سے پیش قدمی تقریب میں شرکت کے لئے آئے۔ نعیم رضا بھٹی نے اپنا تعارف پیش کیا اور کلام بھی پیش کیا۔ انہوں نے ایک غزل اور ایک نظم پڑھی۔

ایم اے راحت نے جب اپنی تحریروں کے حوالے سے بتایا تو معلومات میں اضافہ ہوا اور اچھا لگا۔

اذان مغرب ہوئی تو نماز مغرب کا وقفہ ہوا۔ وقفے کے بعد تقریب کا دوبارہ آغاز ہوا تو عرفان

راے نے بھی اپنائیت بھرے دھیمے لہجے میں اپنے خیالات راسخز تک پہنچائے اور سب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

آخر میں مشعل فاروقی نے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا اور ساتھ ہی چائے کی دعوت دے ڈالی تو تمام راسخز چائے کی ٹیبل کی طرف چلے گئے۔ جہاں پر سب لوگ چائے کے ساتھ بے شمار لوازمات، سموے، مٹھائی، بسکٹ، کباب، چاٹ، چائے اور ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف رہے۔

پھر بشری مسرور نے سب راسخز کو گروپ فوٹو کے لئے بلوایا آخر میں فوٹو گرانی ہوئی اور پھر سب ایک

دوسرے سے ملتے ملائے رخصت ہوئے۔

مجھے اس تقریب میں محبت اپنائیت، احترام ہی نظر آیا مجھے بشری مسرور، مشعل فاروقی، نسیم نیازی، فریدہ جاوید فری، راشدہ، عائشہ خان، عطیہ زاہرہ نوشین ناز اختر، کشائش مسرور اور تمام راسخز نے متاثر کیا ان سب سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ بشری مسرور مبارکباد کی مستحق ہیں کہ ریشم واقعی ایک اچھا میگزین ہے اور بشری مسرور کو ایک اچھی نسیم ملی۔ میری یہی دعا ہے کہ ریشم ڈائجسٹ ترقی کی منازل طے کرے۔ ریشم ڈائجسٹ کے حوالے سے اس قسم کی تقریب ہونی چاہیے۔ تقریب میں، میں نے جو غزل پڑھی اس کے دوا شعرا۔

کوئی ہدم نہیں زمانے میں  
کیسا بدلا ہوا زمانہ ہے  
دل کی گہری اداس ہے اپنی  
گرچہ موسم بڑا سہانا ہے  
☆.....☆.....☆.....☆

غنفر علی شاہد

ریشمی قلم کاروں کی ملن پارٹی.....

ماہنامہ ریشم کی ٹینگ ڈائریکٹر محترمہ بشری مسرور نے لاہور سے تعلق رکھنے والے ریشمی قلم کاروں کے اعزاز میں ایک مختصر سی تقریب کا اہتمام کیا۔ جس کا مقصد آپس میں ہم آہنگی اور رابطوں کو فروغ دینا تھا۔ یہ تقریب بروز ہفتہ 2 جولائی 2011ء کو شام 5 بجے آفیسر بی میس لاہور کینٹ میں منعقد ہوئی۔ اس میں ماہنامہ ریشم لاہور کے اسٹاف اور بشری مسرور کے جن فیملی ممبران نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔

عرفان راے (ایڈیٹر)، مشعل فاروقی (اسسٹنٹ ایڈیٹر) بابر فاروقی (سرکولیشن منیجر)، (علی شیر) (سرکولیشن منیجر)، شہزاد علی (کمپوزر)، گل بانو (مسز بابر فاروقی)، طلحہ مسرور (بشری مسرور کا بیٹا)، کشائش مسرور (بشری مسرور کی بیٹی) اور محترم قاسم فاروقی شامل تھے۔

جن شعراء، شاعرات، افسانہ نگاروں، کہانی نویسوں اور دوسرے قلم کاروں نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔ بیٹا عالیہ (افسانہ نگار)، نسیم نیازی (شاعرہ)، زمرہ نعیم (افسانہ نگار)، آفتاب خان (افسانہ نگار، شاعر)، فریدہ جاوید فری (شاعرہ)، ریم رفیق (افسانہ نگار) نگہت اکرم (افسانہ نگار، شاعرہ) ایم اے راحت (ریشم میں شائع ہونے والے سلسلہ وار ناول ”ناسور“ کے مصنف)، نوشین ناز اختر (ناول نویس) شاہ جہاں مغل (کہانی نویس)، امان اللہ نسیم شوکت (شاعر، کہانی نویس)، عائشہ خان (کہانی نویس)، راشدہ انور (ریشم کا باورچی خانہ کی رائٹر)، عطیہ زاہرہ (افسانہ نگار)، غنفر علی شاہد (شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار)، نعیم رضا بھٹی (شاعر) اور ڈاکٹر طارق محمود (کہانی نویس) شامل تھے۔

تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ آیات قرآنی تلاوت کرنے کی سعادت طلحہ مسرور کو ہوئی۔ بشری مسرور نے محفل کے شرکاء کو خوش آمدید کہا اور خاص طور پر دور دراز مقامات سے سفر کر کے آنے والوں کی ریشم کے ساتھ وابستگی کو سراہا۔ ان میں سیالکوٹ سے آنے والے ڈاکٹر طارق، منڈی بہاؤ الدین سے آنے والے نعیم رضا بھٹی اور منگلا سے آنے والے غنفر علی شاہد شامل تھے۔

محترمہ بشری مسرور نے اپنے مختصر خطاب میں ریشم کی ترقی کے سلسلے میں کئے جانے والے اقدامات کا احاطہ کیا۔ ماہنامہ ریشم کا دفتر کراچی سے لاہور منتقل ہونے کے بعد جن مشکلات کا سامنا ہوا۔ ان کا احوال بیان کیا۔ اس کے بعد شرکاء محفل کے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے ریشم کے اسٹاف کی باری تھی۔ اپنے تعارف کے ساتھ ساتھ انہوں نے درپیش مشکلات کا بھی تذکرہ کیا۔ بشری مسرور نے ریشمی اسٹاف کی کارکردگی کو سراہا کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود ریشم کی ترقی کے لئے شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں۔

جب قلم کاروں کے تعارف کی باری آئی تو اس

میں یہ شرط بھی رکھ دی گئی کہ اہل محفل کے سامنے تعارف کراتے ہوئے نمونہ کلام بھی پیش کرنا ضروری ہے۔ قلم کار جس ترتیب سے نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی ترتیب سے تعارفی سلسلہ شروع ہوا۔ بابر فاروقی اور مشعل فاروقی نے اپنا تعارف کروایا اور ریشم کی ترقی کے سلسلے میں اپنی کاوشوں کا ذکر کیا۔ شاعری کی ابتداء فریدہ جاوید فری سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے تعارف کے بعد غزلیات پڑھیں جو پسند کی گئیں۔ نگہت اکرم نے نظمیں پڑھ کر داد حاصل کی۔

غنفر علی شاہد نے دو نظمیں ”ماں“ اور ”میں بھول جاتا ہوں“ کے عنوان سے پڑھیں اور خوب داد پائی۔ اس کے بعد ریشم کی تقریب کے حوالے سے قطعاً پڑھے۔ غزلیں بھی سنائیں۔ ان کے کلام کو بہت پسند کیا گیا۔ نعیم رضا بھٹی نے غزلیں پڑھ کر داد تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر طارق محفل میں تاخیر سے پہنچے تھے۔ انہوں نے ماہنامہ ریشم کے دیر سے ملنے کی شکایت کی۔ ریشم میں شائع ہونے والے سلسلہ وار ناول ”ناسور“ کے مصنف ایم اے راحت نے اپنا بھرپور تعارف کروایا اور ایک ذومعنی جملہ کہہ کر محفل کو شگفتہ و زعفران بنا دیا۔ جملہ یہ تھا کہ ”میں بھی آپ کے ماہنامے میں ایک ناسور ہوں۔“ انہوں نے پاکستان کے ماہناموں میں شائع ہونے والے ناولوں کے کئی سالوں پر پھیلے ہوئے طویل سلسلوں کے بارے میں اپنی کاوشوں پر روشنی ڈالی۔

تعارفی سلسلے کے بعد کھانے کا وقفہ کیا گیا۔ اس دوران بشری مسرور مہمانوں سے کھل مل گئیں۔ وہ ہشاش بشاش چہرے سے ہر ایک کے ساتھ کھل کر بات چیت کر رہی تھیں۔ ریشم کے سلسلے میں قلم کاروں کی شکایات اور غلط فہمیاں دور کر رہی تھیں۔ جن لوگوں کو بشری مسرور کی عدم توجہی اور کم گوئی کا شکوہ تھا۔ وہ دور ہو رہا تھا۔ شرکاء محفل کے گروپ فوٹو بن رہے تھے۔ اور ریشمی قلم کاروں کی ملن پارٹی اختتام کو پہنچ رہی تھی۔



Pakistanipoint

تاریخ ماضی کی باوریاقت کاٹن ہے۔ ایسے میں چند مخصوص کرداروں کے  
کارنامے بیان کر کے عہدِ گزشتہ کو زندہ نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ ایک اہل  
حقیقت ہے کہ جو لوگ تاریخ سے سبق سیکھ لیتے ہیں وہی نئی تاریخ رقم  
کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ورنہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائی رہتی ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے دور کی ایک ناقابل فراموش داستان





سلطان محمود غزنوی کی مسلسل فتوحات نے ہندوستان کی متحدہ فوجی قوتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ جو کل تک سلطان محمود کا نام طرہ انداز میں لیا کرتے تھے آج اس کی بہادری کے قصے سناتے ہوئے خوف سے قہر قہر کا پنے لگے تھے۔ اس وقت محمود غزنوی پہلا حکمران تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا تھا۔

قدم قدم پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتے ہوئے جب سلطان محمود ہندوستان میں کالنجر اور گوالیار کی تسخیر کے بعد واپس غزنی پہنچا تو اسے اپنے مخبروں سے خبر ملی کہ فتوحات کے اس طویل سلسلے کے بعد ہندوستان کی مشہور تیرتھ یا ترا سومات ابھی تک اس کے گھوڑوں کے سمنوں کی آواز سننے کے لئے منتظر ہے۔

مخبروں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ ہندوستان کے جن مقدس شہروں اور عبادت گاہوں نے اس کی تلوار کا مزا چکھ لیا تھا اہل سومات کو ان پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اپنی خفت مٹانے کیلئے یہ کہتے ہیں کہ اب تک محمود نے جن بتوں کو توڑا تھا سومات ان سب سے پہلے ہی بہت ناراض تھا اور انہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سومات نے ان بتوں کی تباہی پر کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا اور سلطان محمود اس کے قہر سے محفوظ رہا۔ ورنہ سومات کے برہمنوں کے بقول ان کے سومات جیمیں اتنی قدرت ضرور موجود تھی کہ وہ ایک ہی پہل میں محمود اور اس کے طاقتور لشکر کو تباہ کر دیتا۔

سومات کے پجاری یہ بھی کہتے تھے کہ سومات دنیا کے تمام بتوں کا بادشاہ ہے اور دوسرے تمام بت سومات کے دربان اور خدمت گار ہیں۔ ہندوؤں کو سومات سے اس قدر عقیدت تھی کہ انہوں نے اس شہر کا نام بھی سومات ہی رکھ دیا تھا۔

ادھر جیسے جیسے سلطان محمود کو سومات کے پجاریوں کے خیالات معلوم ہو رہے تھے اس کا جوش اور ولولہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں سومات

فتح کرنے کی خواہش شدت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی چنانچہ اس نے برہمنوں کا غرور خاک میں ملانے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

جب اس سلسلے میں غزنی اور کاٹھیاواڑ کے درمیان طویل فاصلے کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں تو سندھ اور راجپوتانے کی وسعتوں میں پھیلے وئے ریگستان کے وجود نے اسے کسی حد تک تذبذب میں ڈال دیا۔ کیوں کہ اس صحرا کو عبور کیے بغیر سومات تک پہنچنا کسی طور ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن فتوحات کا عادی سلطان محمود ہمت ہارنا نہیں جانتا تھا۔

چنانچہ اپنی اس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سلطان محمود نے ہر ہر قدم پر بھرپور منصوبہ بندی شروع کر دی اور اپنی ابتدائی کارروائیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے بارہ جاثرا آدمیوں کا انتخاب کیا۔ ان جاثراؤں میں مختلف پیشوں اور شعبوں سے متعلق ماہرین شامل تھے۔ جن میں چند ایسے انجینئر شامل تھے جنہوں نے قلعے کا جائزہ لے کر اس کے خاص رازوں سے محمود کو آگاہ کرنا تھا۔ کچھ فوجی طاقت کا اندازہ لگانے والے ماہرین تھے اور چند افراد ایسے تھے جنہیں عوام میں گھل مل کر انہیں درغلانے اور پریشان کرنے کا فن آتا تھا۔

انہی خاص لوگوں میں ایک نوجوان آصف علی بھی شامل تھا۔ اس کی عمر بچپن کے قریب تھی اور وہ چہرے مہرے سے خاص ہندوستانی لگتا تھا۔ آصف علی نے متھرا میں طویل عرصہ گزارا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے سنسکرت اور کئی دوسری مقامی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ سلطان محمود نے اسے سومات کے باسیوں اور مندر کے اندرونی حالات کی تفصیلات فراہم کرنے پر متعین کیا تھا۔ ہندوؤں کے گڑھ سومات پہنچ کر اس کے ہر پہلو کے بارے میں معلومات جمع کرنا نہایت حساس کام تھا۔ اس لئے ان سب جاسوسوں کو الگ الگ اوقات میں جدا جدا رخصت کیا گیا تھا تاکہ کسی قسم کی مخبری کی صورت میں کوئی ایک شخص باقی ساتھیوں کے



لے خطرہ نہ بن جائے۔

یہاں ایک پھیل کے درخت تلے شری کرشن جی آرام فرما رہے تھے کہ کسی شکاری کا تیران کی اڑی کو گھائل کر گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیر کا زہر شری کرشن جی کے پورے جسم میں پھیل گیا۔ یوں شری کرشن جی دریائے سرستی کے کنارے اسی مقام پر جہاں آج یہ مندر کھڑا ہے دنیا سے سدھار گئے تھے۔ یہ مندر ان کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔“

پروہت، آصف علی کو دیر تک مندر کی زیارت کراتا رہا۔ پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آصف علی سومنات کی زیارت کو جا رہا ہے تو اس پروہت نے یہ مہربانی کر ڈالی کہ سومنات کے بڑے پروہت کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا۔

خط حاصل کرنے کے بعد آصف علی نے پروہت کا بھرپور انداز میں شکریہ ادا کیا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

وہاں سے نکل کر مختصر سفر کرنے کے بعد وہ سومنات کے مندر کے سامنے موجود تھا۔ اب آصف علی تمام تر احتیاطی تدابیر پر عمل کرتے ہوئے ”ارجن لال“ بن چکا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد سومنات کے مہمان پروہت بھیم دیو نے اس خوبرو نوجوان کی بہت آؤ بھگت کی اور مندر ہی کے احاطے میں بنے ہوئے حجروں میں سے ایک حجرہ اسے رہائش کے لئے عطا کر دیا۔ سومنات کا مہمان پروہت بھیم دیو، ارجن لال سے دیر تک شمالی ہند کی مقدس تیرہ گاہوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ قنوج اور متھرا پر محمود غزنوی کی لائی ہوئی بربادیوں کا تفصیلی حال سننا چاہتا تھا۔ جب کہ آصف علی دل ہی دل میں لطف لیتے ہوئے نہایت غمگین انداز میں سلطان محمود کی لائی ہوئی تباہ کاریوں کی پراثر داستان سنا رہا تھا۔ پروہت اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور سومنات میں اس کے قیام کے دوران ہر طرح کی خدمت کا یقین دلایا۔ اور پھر اپنے اندر کے خوف کو چھپاتے ہوئے بولا:

آصف علی غزنی سے روانہ ہونے کے بعد پہلے متھرا پہنچا اور کچھ دن وہاں قیام کے بعد کاٹھیاواڑ روانہ ہو گیا۔ کاٹھیاواڑ سے سومنات تک کا سفر نہایت طویل اور کٹھن تھا۔ کئی روز کی مسافت طے کرنے کے بعد آصف علی ایک سرسبز علاقے میں پہنچ گیا۔ جہاں ہر طرف پھلوں کے باغات اور فصلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جب وہ ان حسین نظاروں کو پیچھے چھوڑتا ہوا آبادی میں داخل ہوا تو چونے، اینٹوں اور پتھروں کے مکانات دیکھ کر اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ سومنات اب زیادہ دور نہیں ہے۔

مندر کے سنہرے کلس سے ٹکرانے والی سورج کی کرنیں نظروں میں خیرگی پیدا کر رہی تھیں اور محرومی مندروں میں بے شمار نقش و نگار اور مختلف وضع کی مورتیاں اپنے کارگروں کے کمال فن کا دیکھنے والوں کے دلوں پر نقش بٹھا رہی تھیں۔ اس نواح میں آنے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

اس موقع پر دریائے سرستی کے کنارے کھڑے ایک عظیم الشان مندر نے اسے بطور خاص متاثر کیا تھا۔ اس وقت وہ ہندو یاتری کے لباس میں تھا۔ وہ مندر کے دروازے پر رکا حیرت اور شوق سے اس کی منفرد بناوٹ دیکھ رہا تھا کہ ایک بوڑھا پرہت اس کے قریب آن پہنچا۔ ”مقدس پروہت! یہ کون سی جگہ ہے اور اس مندر کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟“

آصف علی نے پروہت کو یوں اچانک سامنے پا کر سوال دانا تو پروہت نے اسے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور پھر مشکوک لہجے میں بولا:

”تم شاید شمالی ہند سے آئے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔ یاتری ہوں۔“

اس کے بات سن کر پروہت نے نہایت خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنے ہمراہ اندر لے جاتے ہوئے بولا:

”اس جگہ کو سبھا لکا کہتے ہیں۔۔۔ زمانہ گزرا

”جو کچھ محمود نے کیا وہ چھوٹے دیوتاؤں اور بتوں کے خلاف کیا۔۔۔ لیکن اگر شامت اعمال اسے سومات کی طرف لے آئی تو سومات جی اسے اچھی طرح سبق چکھا دیں گے۔“

آصف علی نے فوراً فکر مندانہ لہجے میں جواب دیا: ”پروہت جی میرا سفر صرف یا ترا کی غرض سے ہر گز نہیں ہے۔ میں نے تو وہاں یہ بھی سنا تھا کہ اب محمود سومات کی طرف ہونے والا ہے۔۔۔ اس خبر کے سنتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا تا کہ آپ سب کو اس خطرے سے آگاہ کر سکوں۔“

سرگوشی سن کر پروہت نے بھرپور قہقہہ بلند کیا۔ لیکن آصف علی کو یہ اندازہ لگانے میں قطعاً مشکل پیش نہ آئی کہ پروہت کا قہقہہ کھوکھلا ہے اور اس میں سلطان محمود کی آمد کا خوف واضح طور پر جھلک رہا ہے۔

”ارجن لال جی! تم مت گھبراؤ۔۔۔ اپنے سومات جی تو خود محمود اور اس کی فوج کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی وہ ہمارے قلعے کی فصیلوں کے نیچے آئے گا۔ سومات جی اسے اپنی عظمت کا سبق سکھا دیں گے۔“

اس کی بات سن کر آصف علی نے یوں پرسکون انداز میں سر ہلا دیا جیسے اسے بھی سومات کی ان دیکھی طاقت پر کامل یقین ہو۔

چنانچہ کچھ وقت مزید پروہت کے پاس گزارنے کے بعد وہ مندر کی دلکشی کا نظارہ کرنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سومات کے وسیع و عریض مندر کی حدود میں دو سو من وزنی سونے کی زنجیر پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں بے شمار چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ صبح شام جب پوجا پاٹ کے لئے لوگوں کو بلانے کی خاطر انہیں ہلایا جاتا تو گھنٹیوں کا کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور بلند ہوتا اور یوں تمام پجاری اور پروہت پوجا پاٹ کیلئے مندر میں آکر پہنچتے جس کے بعد سومات کی پرستش شروع ہو جاتی۔

مندر میں پانچ سو گانے والیاں اور تین سو مرد سازندے ہر وقت سر بکھیرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس مختصر ملاقات کے بعد پروہت بھیم دیونے سب سے پہلے آصف علی کے سر اور داڑھی کے بال منڈوائے۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اب ارجن لال پوری طرح یا تری بن چکا ہے تو اس نے مزید شفقت کا اظہار کیا اور آصف علی کو آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔

مندر میں تعمیر شدہ حجروں میں بہت سی دیوداسیاں بھی رہائش اختیار کیے ہوئے تھیں۔ ان میں بعض ایسی راجکماریاں بھی تھیں جنہیں والدین نے سومات جی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مستقل طور پر پجاریوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

یہ حسین اپسرائیں نا تمام لباسوں میں تلیوں کی طرح ادھر ادھر منڈلا کر آنے والے ان یا تریوں کا چمن و قرار لوٹ رہیں تھیں جو سومات میں آئے ہی ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے تھے۔ نہایت تنگ اور مختصر لباسوں میں مقید منہ زور دیوداسیاں عام یا تریوں ہی نہیں بڑے بڑے مہان پجاریوں کے لئے بھی کڑا امتحان ثابت ہو رہیں تھیں

آصف علی نے قدم قدم پر جب ان دیویوں کو اپنی پوجا کا منتظر پایا تو اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں قطعاً دشواری پیش نہ آئی کہ حسن شاید ساری دنیا سے اٹھ کر سومات کی حدود میں سٹ آیا ہے۔ لیکن اس کا مقصد ان مست نظاروں سے کہیں زیادہ عظیم تھا۔ چنانچہ وہ سر جھٹک کر ایک نئے عظم سے آگے بڑھا اور مندر کے اس حصے کی جانب چل پڑا جہاں سومات کا بت نصب تھا۔

چھپن ستونوں کی اس کشادہ عمارت کے جس حصے میں سومات نصب تھا۔ یہ ایک تاریک حجرہ تھا۔ وہاں قدیلوں میں تیل یا موم کی شمعوں کی جگہ جواہر و الماس جڑے گئے تھے اور انہی کی جگہ گاہٹ سے یہ تاریک حجرہ روشن رہتا تھا۔

آصف علی جب پہلی مرتبہ اس حجرے میں داخل

ہوا تو اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بہت سے دوسرے اس کا خون خشک کیے چلے جا رہے تھے۔ وہ مذہباً ہندو نہ ہونے کے سبب ان کی بہت سی رسومات سے ناواقف ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر لمحے اس بات کا امکان موجود تھا اسے مشتبہ قرار دے دیا جائے۔

حجرے میں بہت سے برہمن سومات کی پوجا پاٹ میں مشغول تھے اور عورتیں سریلی آواز میں بھجن گا رہیں تھیں۔ اس وقت سازوں کی آواز نے ماحول پر سحر سا پھونک دیا تھا۔ آصف علی نہایت مودبانہ انداز میں یاتریوں کے درمیان کھڑا کن اکھیوں سے حجرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک ایسی حسین و جمیل دوشیزہ پر پڑی جو سومات کے قدموں میں گر گزرائے چلی جا رہی تھی۔ وہ حسینہ وہاں موجود تمام مقامی عورتوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی لیکن اس کے چہرے پر نہایت سنجیدگی اور کرب کے آثار تھے۔

وہ جب سومات کے سامنے گھٹنوں کے بل گر کر گر گزرائی تھی تو اس کی مناجات اور گریے میں بہت زیادہ سوز محسوس ہوتا تھا۔ آصف علی اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اب وہ بھی سومات کے روبرو مودب کھڑا تھا لیکن اس کی تمام تر توجہ اس لڑکی پر ہی مرکوز تھی جو اس وقت گھٹنوں کے بل بیٹھی ہذیبی انداز میں زور زور سے گر گزرا رہی تھی:

”اے میرے سومات! اے میرے چاند کے آقا۔ گناہ میرے تعاقب میں ہیں اور میں ان سے بھاگتی پھر رہی ہوں۔ اے عظیم سومات مجھے حوصلہ دے کہ میں چاندنی کی طرح پاک و صاف رہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ گزشتہ جنم میں مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوئے ہیں لیکن میرے دیوتا یہ جنم تو تیرے سپرد کر دیا گیا ہے۔ تجھے سب معلوم ہے، تو نے میرے گناہوں کے پتھ کٹ کر مجھے بے بس کر دیا ہے۔ لیکن پھر مجھ پر یہ دیوانگی کا کیسا دورہ پڑتا ہے۔۔۔ میرا شباب مجھ سے

چھین لے۔ میرے خون میں سردی گھول دے اور میرے جسم کو بدنما بنادے۔ میں جب تیرے ایما پر اس کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہوں تو مجھے ان جذبات و احساسات سے کیوں نوازتا ہے۔۔۔ مجھے تہا رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو میرے دل و دماغ سے تنہائی کا احساس بھی چھین لے۔ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ مجھ پر رحم کر سومات! مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال۔۔۔ میری آزمائش کو ختم کر کے مجھے بے ضرر عورت بنادے یا پھر میرے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنے والے محرکات فنا کر دے۔ میں صرف تیری رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ صرف تیری رہنا چاہتی ہوں۔“

آصف علی نے دیکھا کہ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ پھر اچانک سر اٹھانے پر اس کی نظر آصف علی سے چار ہوئی تو وہ اس کے قریب ہو گیا اور ہمت کر کے پوچھا:

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔۔۔ کیا تم مجھے اپنے دکھ بتانا گورا کرو گی۔“

لڑکی نے خالی نظروں سے آصف علی کو دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر مندر سے واپس جانے لگی۔ اسے یوں جاتا دکھ کر آصف علی ہمت کر کے آگے بڑھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا:

”کیا تم نے میری بات نہیں سنی۔۔۔ میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں دیوی۔“

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”میں کرشن جی کی جنم بھوی متھرا سے سومات کی یاترا پر آیا ہوں اور میرا نام ارجن لال ہے۔۔۔ تم بہت زیادہ دھمی معلوم ہوتی ہو۔ اگر میں تمہارا دکھ کسی طرح بانٹ سکوں تو حاضر ہوں۔ تم بلا جھجک بتا دو مجھ سے جو ہوسکا ضرور کروں گا۔“

لڑکی نے آصف علی کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ اس کی پیشکش اور ہمدردانہ کلمات فضول سمجھ رہی ہو پھر بولی:

”تم ابھی مجھ سے واقف نہیں ہو۔ میری راہ چھوڑ دو اور سومات جی کی یا ترا کر کے گھر واپس لوٹ جاؤ۔ میرے دکھ کا علاج تمہارے بس کا نہیں ہے۔“

آصف علی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سامنے کچھ دور سومات کا مہان پر وہت بھیم دیو آتا دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بے چینی سے ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس نے قریب آتے ہی آصف علی کو آواز دی:

”ارجن لال جی چند لمحے ٹھہرنا تو!“

آصف علی نے بھیم دیو کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی پنڈلیوں کی قوت رخصت ہو گئی ہو۔ اور اس کے پاؤں حرکت کے قابل نہ رہے ہوں۔

بھیم دیو سے نظریں چرا کر اس نے ایک بار پھر لڑکی پر نظر ڈالی۔ لیکن اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لڑکی واپس جا چکی تھی۔ بھیم دیو نے پاس آ کر اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا:

”شوٹیا سے بات کر رہے تھے؟“

آصف علی لڑکی کے نام سے واقف نہیں تھا، بولا:

”میں اس کا نام تو نہیں جانتا۔ شاید شوٹیا ہی ہو؟“

اس کی بات سن کر بھیم دیو نے گہری سانس لی اور پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

”دیکھو ارجن لال جی! تم یا تری ہو۔ تمہیں یہاں کی تاریوں سے دل نہیں لگانا چاہیے۔ خاص کر شوٹیا سے تو بالکل نہیں۔“

”شوٹیا سے کوئی خاص وجہ؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”یوں سمجھو کہ وہ ایک ناگن ہے جو اپنے چاہنے والوں کو ڈس لیا کرتی ہے۔ اس کے حسن پر مت جاؤ۔ اس کی رگ رگ میں دوڑتے ہوئے دس سے ڈرو۔“

آصف علی شرمندہ سا ہو گیا اور اپنی اس کیفیت میں بھیم دیو کی باتوں کا مفہوم بھی دریافت نہ کر سکا۔ لیکن جب وہ بھیم دیو سے الگ ہو کر مندر سے باہر نکلا تو اس نے کئی پجاریوں کو افسوس کرتے دیکھا۔ یہ

پجاری بھی آصف علی اور شوٹیا کو باتیں کرتا دیکھ چکے تھے۔ وہ لوگ آپس میں جو باتیں کر رہے تھے ان کا مفہوم بھی یہی تھا جو بھیم دیو کی باتوں میں موجود تھا۔ خوبصورت شوٹیا اب آصف علی کے لئے ایک معمہ بن چکی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس کی اصلیت جاننے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

-☆-

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ آصف علی اس پر اسرار لڑکی کی تلاش میں کئی مرتبہ سومات کے رو بہد حاضری دے چکا تھا۔ لیکن وہ دوبارہ نہیں دکھائی دی تھی۔

آصف علی نے اس کی تلاش میں دیوداسیوں کے حجرہوں کے آس پاس بھی چکر لگائے لیکن وہاں بھی شوٹیا کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

صبح سویرے سونے کی زنجیر میں لٹکی گھنٹیوں کے شور سے مندر اور اس کے آس پاس کی فضا میں بھونچال سا آ گیا تھا۔ آصف علی اپنے حجرے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے پجاریوں کی مندر کے سمت جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پجاریوں کے درمیان مختصر ساڑھیوں میں پلیس دیوداسیاں بھی پریوں کی طرح اڑی چلی جا رہی تھیں۔ اسے حسن اور نزاکت کے ان صورتوں کو دیکھ کر کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑا تھا حسن کے معاملے میں سومات غزنی سے کہیں آگے ہے۔

اسی جہوم میں اس نے شوٹیا کو بھیم دیو کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ حجرے سے باہر آ گیا اور گردن جھکا کر آہستہ آہستہ ان دونوں کے پیچھے چلنے لگا۔ بھیم دیو کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتا شوٹیا سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ جب کہ شوٹیا ننگے پیر تھی۔ بائیں طرف دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور سبزے پر جگہ جگہ پھول کھلے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے ریکائیکوٹیا کراہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے پاؤں کی ایزھی ٹٹولنے لگی۔

بھیم دیو نے جھک کر پوچھا:

”کیا ہوا شوٹیا۔۔۔ کیا کاٹنا چھ گیا۔“



”شویتا تم مجھے کچھ دیر باتیں کرنے کا موقع دو۔“  
 شویتا نے بیٹھتے ہوئے پوچھا:  
 ”وشال پروہت نے تمہارا کیا نام بتایا تھا۔“  
 ”ارجن لال“

”ارجن لال! جیتم یاتری ہو۔ پاترا کر کے اپنے گھر واپس جاؤ۔ مجھ ابھامن کو مت کریدو۔ تم مجھ سے ہمدردی کرو گے تو میری اندر کی اگنی تمہیں جلا کر راکھ کر دے گی۔ خود کو یہیں روک دو۔ آگے مت بڑھو۔“  
 ”اگر کسی غم زدہ عورت کی ہمدردی میں مجھے کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے گا تو مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں ہو گا۔ تم مجھے بہت دھبی محسوس ہوتی ہو۔ مجھے اپنے غم میں شریک کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو۔ تم مجھ سے اتنی بیگانگی کی باتیں مت کرو۔“  
 ”دل کا بوجھ کسی طرح بھی ہلکا نہیں ہو سکے گا۔“  
 شویتا نے دکھ سے کہا۔

اس کے ثبت رویے نے آصف علی کی ہمت افزائی کی اور اس نے شویتا سے اس کا پتہ معلوم کیا۔  
 اسے حیرت تھی کہ شویتا اس کے قریب ہی رہتی تھی اور وہ اسے دور دور تلاش کرتا رہا تھا۔ اس نے شویتا سے وعدہ کیا کہ وہ رات کو اس سے ضرور ملے گا۔ مگر وہ اس رات نہ جا سکا۔ پھر اگلی رات بھی۔ وہ یہ راتیں جاگ کر گزارتا رہا اور اس کے اعصاب پر شویتا مسلط ہوتی گئی۔ آخر تیسری رات اس نے ہمت کی اور اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر لیا کہ کھل کر شویتا سے اپنے دل کی بے تابیوں کا اظہار کر سکے۔

☆-

اسی رات حجرے کا دروازہ بند کر کے آصف علی نے سلطان محمود غزنوی کے لئے ایک تفصیلی مگر دلچسپ روداد مرتب کی:

”سومناٹ کے لوگ اپنے حال میں مگن ہیں اور اپنے بت سومناٹ جی کی ماورائی طاقت پر گہرا عقیدہ رکھتے ہیں۔ الکا عقیدہ ہے کہ پوری دنیا کے بتوں میں سومناٹ سب کا آقا ہے اور تمام مذاہب ان کے

شویتا نے انگلیوں کے ناخنوں کی مدد سے ایزی میں چبھے ہوئے کانٹے کو کریدتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں وشال (مقدس) پروہت جی!“  
 اچانک ان دونوں کی نظریں آصف علی پر پڑیں۔  
 بھیم دیو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

”اچھا تو تم بھی ہمارے ساتھ ہی چل تھے۔“  
 اور پھر اسے حکم دیا کہ شویتا کے پاؤں سے کانٹا نکال دو۔  
 آصف علی زمین پر اکڑاں بیٹھ گیا اور ناخنوں کی مدد سے کانٹے کو باہر نکال لیا۔ ایزی کے ننھے سے سوراخ سے خون نکل کر بوند کی شکل میں جمع ہو گیا تھا۔  
 شویتا نے اپنی ایزی کو کوئی بار زمین پر رگڑا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بھیم دیو نے دونوں کا تعارف کروایا اور شویتا سے کہنے لگا:

”شویتا یہ ارجن لال ہے جو تمہارے سومناٹ جی کی یاترا کو یہاں آیا ہے۔“ پھر شویتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آصف علی سے کہنے لگا:  
 ”یہ شویتا ہے۔ دیوتاؤں کی حفاظت کے لئے اس کا وجود امرت اور دشمنوں کیلئے زہر۔“

ان دونوں نے ایک دوسرے کو نئے دوستوں کی طرح دیکھا۔ شویتا کی چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں بھی یاسیت کا سوز نمایاں تھا۔ جواب میں آصف علی بھی مسکرا دیا لیکن اس مسکراہٹ میں اشتیاق اور کچھ جاننے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔

سومناٹ کے سامنے پجاریوں کے اجتماع میں آصف علی اور شویتا دریا میں قطرے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ بھیم دیو انہیں چھوڑ کر سومناٹ کے قریب چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ زور زور سے اشلوک پڑھے جا رہا تھا۔  
 کسی کسی لمحے گھنٹی کا شور بھی بلند ہو جاتا تھا۔  
 شویتا اور آصف علی بھی قریب قریب دو زانو بیٹھے اشلوک سن رہے تھے اور کبھی کبھی کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیتے تھے۔

پھر ایک مرتبہ نظریں چار ہوتے ہی آصف علی سرگوشی کے سے انداز میں بولا:

مذہب سے کتر ہیں۔۔۔ سومات کے علاوہ مندر میں بے شمار چھوٹے بڑے اور بھی بت موجود ہیں جو کبھی سونے چاندی کے ہیں۔ سومات کے لوگ سلطان محمود سے ذرا چھی خونزدہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ انہیں یقین ہے کہ اگر سلطان سومات تک تشریف لائیں گے۔ تو سومات جی انہیں ان کے لشکر سمیت تباہ و برباد کر دیں گے۔

آصف علی کو یہ تفصیلات کسی بھی ذریعے سے غریبی بھیجتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جیسے کچھ اور لوگ بھی سومات میں مختلف جگہ موجود ہیں۔ اب اسے اپنے انہی ساتھیوں کی تلاش تھی۔

اس کے بعد وہ شویتا سے ملنے چلا گیا۔ مندر کے احاطے میں جگہ جگہ شمعیں روشن تھیں۔ چاند غائب تھا اور ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور مرغ کے محل وقوع سے اندازہ لگایا کہ شام کو رخصت اور رات کو آئے ہوئے چار ساعتیں گزر چکی ہیں۔ شویتا کے پاس رات کے اس پہر جاتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ شویتا سونہ گئی ہو۔ پھر یہ دوسوہ پیدا ہوا کہ اتنی رات گئے آمد کہیں شویتا کے نازک دل پر گراں نہ گزرے۔

اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ شویتا کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے۔ جو لوگ اس کے ساتھ رہتے ہیں وہ نا وقت اس کی آمد کو شاید پسند نہ کریں۔ انہی انجھنوں اور فکروں میں گھرا ہوا جب وہ شویتا کے دروازے پر پہنچا تو شیشم کے دروازے کی جھری سے اندر چلنے والے چراغ کی روشنی پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھی۔ اس نے چوروں کے سے انداز میں اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں ننگے فرش پر کوئی لیٹا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی کوئی بیٹھا انہماک سے لیٹے ہوئے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اٹھا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ لیٹا ہوا شخص جب اٹھ کر بیٹھ گیا تو آصف علی نے پہچان لیا کہ وہ شویتا تھی۔

وہ دروازے پر نظریں جمائے مزید دستک کی منتظر

تھی۔ آصف علی نے آہستہ سے پھر دستک دی۔ تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے آصف علی کو کھڑا دیکھ کر کچھ حیران سی رہ گئی۔ وہ ذرا دیر ٹھکنکی لگائے دیکھتی رہی اور پھر اداس ہنسی ہنس کر بولی:

”تو تم نہیں مانے، آخر تم آگئے۔ حالانکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آ جاؤ گے۔“

آصف علی نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”شویتا تم اگر مجھے نرکھ سے بھی آواز دو گی تو میں بھاگ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔۔۔ تم یقیناً کوئی جادو گر ہو۔ تم نے ایک ہی وار میں میرا کام تمام کر دیا ہے۔“

شویتا کلکلا کر ہنس دی اور پھر بولی:

”ابھی ملاقات کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا اور تم مجھے نرکھ میں بھیجے لگے۔“

آصف علی شرمندہ سا ہو گیا اور موضوع بدل کر کہنے لگا:

”یہ اندر کون ہے؟“

شویتا نے مرکز اندر موجود شخص کی جانب دیکھا اور لا پرواہی سے جواب دیا۔ ”تمہارے جیسا میرا ایک ہمدرد

آصف علی کی جان میں جان آئی اور کہنے لگا:

”میں غلط وقت پر تو نہیں آ گیا۔“

”یہاں وقت کو غلط اور صحیح پر تقسیم نہیں کیا جاتا۔ جب بھی میں اندر موجود ہوں اور تم آ جاؤ وہ صحیح وقت ہو گا۔۔۔ خیر اب اندر آ جاؤ۔“

آصف علی حجرے میں داخل ہو گیا۔ اندر موجود شخص ایک لمبے کیلئے اس کی طرف مڑا۔ آصف علی نے اسے رواداری میں لیکن اس نے آصف علی کو گہری نظر سے دیکھا۔

پہلی نظر میں آصف علی نے یہ سمجھا جیسے اس کے سامنے کوئی زرد مردہ بیٹھا ہو۔ اجنبی نے اپنے چہرے کو جلدی سے دھوئی میں چھپا لیا اور پھر نحیف آواز میں بولا:

”اچھا تو میں چلتا ہوں شویتا۔۔۔ پھر آؤں گا۔“

آصف علی کو ایسا لگا جیسے وہ اس آواز سے متعارف ہے۔ اس نے اجنبی کو غور سے دیکھنا چاہا لیکن دھوتی کی اوٹ اور کم روشنی کی وجہ سے وہ اسے اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔

شوہتا اسے دروازے تک چھوڑنے گئی۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے حجرے کو اندر سے بند کر لیا اور آصف علی کے روبرو آکر بیٹھ گئی:

”ارجن لال جی! میرے انداز و اطوار سے تو تم نے یہی سمجھا ہو گا کہ شاید میں کوئی بری عورت ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔۔۔ دیشیا بھی مجھ سے اچھی ہی ہو گی۔ کم از کم اسے خود پر اختیار اور بے ضرر ہونے کا یقین تو ہو گا۔“

اس کے لہجے میں عجیب سا کرب تھا۔ آصف علی جو کہ ابھی تک اجنبی کے بارے سوچ رہا تھا اچانک بولا:

”یہ اجنبی کون تھا؟“  
”تمہیں یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ تم وہ بات کرو جس کے لئے آئے ہو۔“ روکھا سا جواب ملا تو آصف علی شرمندہ سا ہو گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کس قسم کی بات کرے۔ پھر شوہتا نے ہی گنگو کا آغاز کیا:  
”تم ارجن لال جی! اکیلے پاتر آؤ آئے ہو۔ تمہارا کنبہ ہو گا۔ مال ہو گی، بہن بھائی ہوں گے اور شاید بیوی بھی ہو۔“

”ابھی میں نے شادی نہیں کی۔“  
”اور شاید شادی نہ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو گے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔  
”ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ یاتراؤں میں گزارنا ہے۔ اس کے بعد ہی گھر کے بارے سوچوں گا۔“

آصف علی نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بے انتہا خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس مجسمہ حسن کو آج تک کسی نے ہاتھ لگا کر میلا نہیں کیا ہو گا۔ آصف علی اس سر تا پا کیف و خمار میں گم سا ہو گیا تھا۔

پھر اچانک شوہتا کی مدھر آواز نے اسے سوچوں کی گرداب سے کھینچ نکالا:

”کہاں کھو گئے ہو ارجن لال جی۔۔۔ تم تو کچھ باتیں کرنے آئے تھے۔ رات اور زیادہ بھگ جائے گی۔ اور اگر ایسے میں دشال پروہت کا بلاوا آ گیا تو میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

اس آواز سے آصف علی کو ہوش سا آ گیا اور وہ بے اختیار لہجے میں بولا ”شوہتا! تم کہو گی کہ یہ کیسا یاتری ہے۔ جو دو ایک ملاقاتوں میں ہی اس قسم کی نازیبا باتیں کرنے لگا ہے۔ لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ ہوش و حواس گم ہو گئے ہیں۔۔۔ تمہارے حسن اور شباب کا نشہ رگ رگ میں اتر چکا ہے اور یہ جانے بغیر کہ تم کون ہو، کیا ہو تمہیں چاہنے کا مجھے حق بھی پہنچتا ہے کہ نہیں۔ میں نے تم سے انتہائی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اس دالہانہ اظہار کے بعد میرے ساتھ تمہارا کیا سلوک ہو گا۔ اگر عشق اسی کیفیت کا نام ہے کہ انسان اپنے مطلوب پر نفع و نقصان سوچے بغیر اپنا سب کچھ نچھاور کر دے تو میں اس بات کا برملا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تم سے وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ شوہتا میں نے اس طوفان کو روکنے کی بہت کوشش کی ہے مگر۔۔۔“

شوہتا انہماک سے آصف علی کی بات سنتی رہی۔ اور پھر چند لمحے توقف کے بعد غیر جذباتی لہجے میں بولی:  
”تم مرد لوگ جب کسی سے قریب ہونا چاہتے ہو تو یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ تم نے جسے پسند کیا ہے کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے کہ نہیں۔۔۔ تم لوگ مقابل کو صرف یہ بتا دینا کافی سمجھتے ہو کہ اسے بہت چاہتے ہو۔ لہذا وہ بھی تم سے اتنی ہی دالہانہ محبت کرے۔“

اس کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد خود ہی سکوت توڑا:  
”اگر تم لوگوں نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں خود

یہاں سے چلی جاؤں گی اور پھر کبھی کسی کو اپنی منحوس صورت نہیں دکھاؤں گی۔“

اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جس سے اس کی آنکھوں میں بسی دیرانی مزید گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آصف علی اپنے رویے پر شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ معذرت کرتا ہوا بولا:

”شاید میں بے احتیاطی میں کچھ زیادہ دور نکل گیا ہوں۔۔۔ میں اپنے رویے کی معافی چاہتا ہوں۔“

وہ پرافسوس نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھنے ہی والا تھا کہ شویتا نے اس کا ہاتھ تھام لیا:

”میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ تمہارا دل دکھاؤں۔ میں تو ان لوگوں سے اپنی بے زاری کا اظہار کر رہی تھی۔ جو خواہ مخواہ مجھے چاہنے لگے ہیں۔۔۔ میں ان سب سے کیسے محبت کر سکتی ہوں۔۔۔ بلکہ ان سب پر ہی کیا موقوف ہے میں تو کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتی۔ میں مجبور ہوں ارجن لال جی! میری طرف دیکھو۔ میں اتنی بد نصیب ہوں کہ جس سے محبت کروں گی اس کو موت کی نیند سلا دوں گی۔“

”تم بار بار ایسا کیوں کہتی ہو۔ بھگوان کے لئے کھل کر بات کرو۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تو شویتا نے جواب دیا:

”یوں سمجھو میں ایک ایسی ناگن ہوں جس میں صرف زہر بھرا ہے۔۔۔ تمہیں بس اتنی ہی بات یاد رکھنا چاہیے۔“

شویتا برابر آصف علی کے ہاتھ کو سہلا رہی تھی اور اسے سچ مچ یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ اس پر نشہ سا طاری ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ اس لمس کو محسوس کرنے کے بعد مدھوش سا ہونے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے خود بھی بے قراری سے شویتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آصف علی کے اس عمل پر شویتا یکدم ساکت و جامد سی ہو گئی۔ اور پھر جب آصف علی نے اسے خود سے مزید قریب کرنے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولی:

”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔ کیا تم مرنا چاہتے ہو۔ مجھ بد نصیب کے انگ انگ میں زہر چاہے۔ مجھ سے دور رہو۔ میں تمہیں بے موت مرتا نہیں دیکھ سکوں گی ارجن لال جی۔“

آصف علی اس کا لمحہ بہ لمحہ بدلتا ہوا مزاج دیکھ کر حیران سا رہ گیا تھا۔ جب کہ شویتا اپنی بکھری ہوئی ساڑھی سمیت کر دور جا بیٹھی تھی۔

☆-

اس رات کے بعد شویتا سے اس کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ مندر میں سومات جی کے روبرو، چلتے پھرتے اچاٹے کی راہوں میں دونوں کی اکثر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن شویتا ہمیشہ سرد مہری سے پیش آتی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اس کے خواب و خیال میں رچ بس گئی تھی۔

سومات کا جائزہ لکھا ہوا تیار تھا۔ لیکن بھیجنے کی صورت پیدا انہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں سومات کے قلعے کے اس حصے میں بھی گیا جہاں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ وہاں بہت سے مزدور کام کر رہے تھے۔ لیکن اتفاق سے اسے اپنا کوئی ساٹھی دکھائی نہ دے سکا اور وہ واپس لوٹ آیا۔

جب وہ واپس اپنے حجرے کی جانب بڑھ رہا تھا تو کئی تھ اس کے پاس سے کھڑکھڑاتے ہوئے گزر گئے۔ پھر ایک تھ اچانک اس کے قریب پہنچ کر رکا اور شویتا کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی مسکراتا ہوا اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ شویتا ایک مرد کے ساتھ تھ میں سوار تھی۔ جب آصف علی نے کن اکھیوں سے اس مرد کی جانب دیکھا تو شویتا نے فوراً اس کا تعارف کروا دیا:

”رتن سین! ان سے ملو یہ ارجن لال جی ہیں۔“

مقرر اسے سومات جی کی بات کو آوازے ہیں۔“

پھر آصف علی سے کہنے لگی ”اور ارجن لال جی! یہ ہیں رتن سین۔ سومات کی فوج کے ایک افسر ہیں۔۔۔ میں انہیں بہت پسند کرتی ہوں۔ یہ بھی مجھے چاہتے ہیں اور میں ان کا کوئی حکم نال نہیں سکتی۔“

اس تعارف سے آصف علی کو بہت دکھ پہنچا اور وہ رتن سین سے رقابت محسوس کرنے لگا تھا۔

تعارف کے بعد وہ تینوں رتھ پر بیٹھ گئے۔ آصف علی نے محسوس کیا کہ سانولی رنگت والا رتن سین اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور تعارف کے علاوہ اور بھی کچھ جاننے کی کوشش میں ہے۔

ادھر شویتا کچھ پس و پیش اور سکوت کے بعد بولی: ”ارجن لال جی! تم مقرر اسے آئے ہو تو یقیناً وہاں کے لوگوں کو بھی اچھی طرح پہچان سکتے ہو گے۔“

”ہاں بالکل۔“

آصف علی کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

”در اصل رتن سین جی کو معلوم ہوا ہے کہ سومنات

میں کچھ لوگ سلطان محمود کے جاسوس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کن حلیوں میں یہاں آئے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ اس سلسلے میں رتن سین مجھ سے مدد چاہ رہے ہیں۔۔۔ ہمیں محمود کے جاسوسوں کو پہچانا ہے۔ کل سے اس مہم کا آغاز ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اس کام میں ہمارا ساتھ دو۔“

آصف علی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ اسے شبہ گزرا کہ شاید وہ خود بھی پہچانا جا چکا ہے اور شویتا یہ سب کہہ کر اسے طفر کر رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے۔ جب کہ رتن سین کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پھر ان حالات میں خاموش رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔

چنانچہ وہ ہمت کر کے بولا:

”لیکن انہیں پہچانا کس طرح جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنی زبان سے تو یہ کہنے سے رہا کہ میں محمود غزنوی کا جاسوس ہوں۔“

اس کی بات سن کر شویتا نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگی:

”پورے سومنات میں مسلمان جاسوسوں کو پہچانا نہایت آسان بات ہے ارجن لال جی۔ اتنا آسان کہ اس سے زیادہ آسان دوسری کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

آصف علی شویتا کی شکل دیکھنے لگا۔

”جواب میں شویتا کے بجائے رتن سین نے

جواب دیا:

”مسلمان جاسوس کی پہچان شویتا نہیں بتا سکتی۔ میں بتاتا ہوں۔“ اس کے بعد رتن سین نے شرارت بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر شویتا کی جانب دیکھا جس نے فوراً شرما کر سر جھکا لیا۔ چنانچہ وہ دوبارہ آصف علی کی جانب متوجہ ہوا:

”سومنات میں موجود کسی بھی مرد کے زیریں کپڑے اترا کر دیکھ لینے سے فوراً معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔“

آصف علی اس کا منصوبہ سنتے ہی چکرا کر رہ گیا۔ اسے اپنی گرفتاری کا یقین ہو چلا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شویتا اور رتن سین اسے پہچان چکے ہیں اور اب اس کے ساتھ دل بہلا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک ترکیب ذہن میں آتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت اعتماد سے بولا:

”شویتا میں مقرر اسے آیا ہوں۔ تم نے ابھی جو کچھ کہا ہے اگر اس کا ذرا سا اشارہ بھی میری طرف ہے تو میں خود کو ہر قسم کی شناخت کے لئے پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ رتن سین چاہے تو بشوق اپنے شے کی تصدیق کر سکتا ہے۔“

شویتا نے دردمند آواز میں کہا:

”تم بھی بڑے تنگ مزاج ہو ارجن لال جی۔ ہم لوگ تم پر اعتماد کرتے ہیں اور یہ اعتماد ہی تو تھا جس کی وجہ سے تمہیں اتنی بڑی راز کی بات بتادی گئی۔“

اس کی پیش کش سن کر رتن سین نے مسکراتے ہوئے اٹھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا:

”دوست شویتا تمہیں بے حد شریف اور معقول آدمی سمجھتی ہے۔ اگر میں تم پر شبہ بھی کروں گا تو یہ ناراض ہو جائے گی اور ہم میں سے کوئی شخص کم از کم شویتا کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔“

اس موقع پر باتوں باتوں میں رتن سین نے یہ بھی

بتایا کہ غزنی کا سلطان محمود غفریب اپنے خنوخور لشکر کے ساتھ سومنات آنے والا ہے۔ اس نے سچی میں یہ بھی کہا کہ غزنی کے بادشاہ کو آنے تو دو سومنات جی اسے ایسا مزا چکھائیں گے کہ مسلمان رہتی دنیا تک اپنی شکست نہیں بھول سکیں گے۔ پھر اچانک ذہن میں کوئی خیال آتے ہی وہ شویتا کی جانب متوجہ ہوا اور پیار بھرے لہجے میں بولا:

”شویتا دیوی، سلطان کو اصل مزا تم ہی چکھاؤ گی۔“

”ہاں بالکل!“ شویتا کے لہجے میں ناگن کی سی بھینکار تھی۔ ”مسلمانوں کا بادشاہ مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔“

پھر وہ ایک دم اداس سی ہو گئی اور اس کی دھیمی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی:

”شاید میری زندگی کا آخری دن بھی وہی ہو گا۔ ایک طرف سلطان محمود دم توڑ رہا ہو گا اور دوسری طرف میں۔“

یہ ساری باتیں سن کر آصف علی پریشان ہو رہا تھا کہ آخر یہ کیا راز ہے کہ سلطان محمود کو شویتا ہی قتل کرے گی۔

اس کے بعد رتن سین آصف علی سے سلطان محمود کی تباہ کاریوں کے قصے سنتا رہا۔ جو مقررہ اور اس کے گرد دنواح میں رونما ہو چکی تھیں۔ پھر جب آصف علی نے رتن سین کو یہ بتایا کہ وہ غفریب مقررہ واپس جانے والا ہے تو رتن سین نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ابھی وہ مزید چند روز یہیں رہے۔ کیوں کی غزنی کا بادشاہ محمود غفریب سومنات آنے والا ہے۔ اس لئے آصف علی سومنات کے ہاتھوں اس کا عبرتناک انجام دیکھ کر ہی واپس جائے۔

اس کی خواہش سن کر آصف علی نے وہیں رکنے کا وعدہ کر لیا اور سب لوگ مندر کی جانب روانہ ہو گئے۔

-☆-

اسی رات شویتا آصف علی کے حجرے میں اس سے

ملنے کے لئے آئی اور دیر تک پیار بھری باتیں کرتی رہی۔ وہ شدید جذباتی انداز میں اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی:

”ارجن لال جی تم مجھ اپنے ساتھ مقررہ والے چلو میں یہاں کے لوگوں سے تنگ آ چکی ہوں۔“

آصف علی نے اس کے سیاہ چمکتے بال چومتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور محبت بھرے انداز میں بولا:

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ مقررہ نکل چلو۔۔۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ تمہارے بنا میری زندگی میں کبھی نہ پر ہونے والا ایک خلا رہ جائے گا۔“

”میں تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں مگر تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا۔“ شویتا نے اس کے سینے سے سر اٹھایا۔

”کیسا وعدہ؟“

”ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے مگر کبھی شادی نہیں کریں گے۔“

”اس کی وجہ؟“ آصف علی نے حیرت سے پوچھا۔

”شادی نہ کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔۔۔ جب میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گی تو تم خود ہی مجھ سے دور رہنے لگو گے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ ناگن سے بچتے ہیں۔“

آصف علی نے انگلی سے اس کی تھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے اداس آنکھوں میں جھانکا:

”تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔۔۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ ایک طرف تو تم میری محبت کا دم بھرتی ہو اور دوسری طرف اپنی زندگی کا اہم ترین راز چھپا کر غیروں جیسا سلوک کر رہی ہو۔“

اس کا شکوہ سن کر شویتا نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر اس سے الگ ہو کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ حجرے میں کئی بتیوں والا چراغ روشن تھا اور شویتا کی نظریں جھلملاتی روشنی پر جمی ہوئی تھیں۔ آصف علی اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی انہیں



سانس لیتے ہوئے کہنے لگی:

”میں محبت کی اہل نہیں ہوں اور یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ بہتر ہے تم سکون سے اپنے گھر واپس جاؤ اور میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔“

یہ کہہ کر شویتا نے منہ پھیر لیا تو وہ اجنبی اٹھ کر خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔ اجنبی کی آمد اور روانگی نے دونوں کو اداس سا کر دیا تھا۔ شویتا کچھ دیر کھوئی کھوئی اس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر واپس لوٹ گئی۔

آدھی رات کے بعد ایک بار پھر آصف علی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو وہی اجنبی سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔

اس بار اجنبی نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا نہیں تھا۔ آصف علی نے اندر کی زنجیر چڑھا دی اور سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

”ادھر آؤ۔ چراغ کے پاس۔“

اجنبی نے آصف علی کو شانے سے پکڑ کر کہا اور چراغ کی طرف لے جانے لگا۔ آصف علی معمول کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ چراغ کے قریب پہنچ کر اجنبی نے کہا:

”آصف علی تمہارے حافظے اور ذہانت کو کیا ہو گیا ہے۔ میں تو تمہیں پہلی ملاقات اور پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں تم خود مجھے پہچان کر بے اختیاری میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھو میں نے اپنا چہرہ دھونئی کی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔“

پھر اس نے اپنا چہرہ چراغ کے رو برو کر دیا اور بولا:

”لو اب پہچان لو مجھے۔۔۔ میں اسماعیل ہوں۔ سلطان کے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک جاسوس ہوں اور میں تم سے پہلے یہاں آ گیا تھا۔“

آصف علی نے اب اسے پہچان لیا تھا۔ وہ گرم جوش سے اس کے گلے لگ گیا اور پھر پریشان ہو کر کہنے لگا:

یوں گرم صبح بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ آصف علی دستک سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ لیکن شویتا بالکل پرسکون تھی:

”ارجن لال جی! تم میری موجودگی سے مت گھبرانا۔ میری حیثیت یہاں ہر قسم کے شک سے بالاتر ہے۔ اسی لئے تو میں عام عورتوں سے زیادہ بے پاک گفتگو کر لیتی ہوں اور جہاں چاہوں آزادی سے گھوم پھر لیتی ہوں۔“

اس کی بات سن کر آصف علی تھکے تھکے قدموں سے دروازے تک پہنچا اور زنجیر کھول دی۔ باہر ایک شخص دھونئی میں منہ چھپائے کھڑا تھا:

”شویتا یہاں موجود ہے؟“

آصف علی نے اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی زرد روٹھن تھا جو شویتا کے حجرے میں اس سے ایک بار پہلے بھی مل چکا تھا۔ شویتا نے بھی اس کی آواز سن لی تھی اور اسے پہچان بھی لیا تھا۔ چنانچہ وہ پرسکون لہجے میں بولی:

”ارجن لال جی! انہیں بھی اندر ہی بلا لو۔“

اور پھر وہ اجنبی شخص بھی اندر آ گیا۔ اس نے اپنا زرد چہرہ بدستور کپڑے سے چھپایا ہوا تھا۔ وہ شویتا کے قریب بیٹھ کر بلاتا خیر اس سے مخاطب ہوا:

”شویتا میں کل صبح واپس جا رہا ہوں اور تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں۔“

”شاید تم ابھی نہ جاسکو۔ میں رتن سین کے ساتھ تمہارے پاس گئی تھی لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔ رتن کسی خاص غرض سے تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ شویتا نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”تو پھر میں ایک دن مزید رک جاتا ہوں۔ لیکن میری دلی خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔۔۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ کی طرح میری درخواست رد کر دو گی لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

شویتا نے اس کی بات نہی میں اڑا دی اور گہری

”لیکن تم تو نہایت صحت مند انسان تھے۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے اسماعیل۔ تمہاری آواز میں بھی ضعف اور نقاہت کی لہر پیدا ہو گئی ہے۔“

”ہاں کبھی میں واقعی صحت مند تھا لیکن جب سے شویتا کا ساتھ ملا اور میں اس کی محبت میں گرفتار ہوا اپنی جوانی اور صحت کو گھن لگ گیا۔“

آصف علی نے تشویش سے پوچھا کیا شویتا بھی تمہیں چاہتی ہے؟“

”نہیں۔۔۔ اسے تم سے تو محبت ہو سکتی ہے مگر مجھ سے نہیں۔“

پھر کچھ سوچ کر بولا:

”اور یہ بات بھی کسے معلوم کہ وہ تم سے واقعی محبت کرتی ہے یا بے وقوف بنا رہی ہے۔“

”تم شویتا کے بارے میں جتنا کچھ بھی جانتے ہو مجھے صاف صاف بتا دو۔ آخر اس کی شخصیت میں اتنی پر اسراریت کیوں ہے؟“

”میں اس کے بارے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ اپنی جوانی اور صحت گنوانے کے بعد مجھے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ شویتا ایک ایسی ناگن ہے جو کسی بھی مرد کو اپنی عنایات اور نوزشوں کے جال میں پھانس کر ڈس سکتی ہے۔۔۔ اس کی سانس، اس کے لعاب حتا کہ اس کے

پورے وجود میں زہر گھلا ہوا ہے۔ اس سے انتہائی قریب رہنے والا کوئی بھی شخص مری طرح کھل کھل کر زرد پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس کا قرب حاصل کیا، اس سے محبت کی اور پھر اکثر راتیں اس کی آغوش میں سو کر گزار دیں۔ اگر مسلمان ہونے کا راز مجھے محتاط ہونے پر مجبور نہ کرتا تو شاید میں کسی موقع پر تمام اخلاقی حدود پار کر جاتا۔۔۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود میں خود کو روز بروز کھلتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ اس کا زہر میرے جسم میں یوں سرایت کر گیا ہے کہ میں اندر سے کھوکھلا ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر شویتا راضی ہو گئی تو اسے اپنے ساتھ غزنی لے جاؤں گا۔ ممکن ہے ماحول بدلنے سے اس کی سوچ بدل

جائے لیکن وہ کسی صورت میرے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔“

آصف علی کا دل اس کی باتیں سن کر دہل سا گیا تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر اسماعیل دوبارہ بولا:

”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں صبح سے پہلے یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ رتن سین میری تلاش میں ہے۔ غالباً اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اپنے سلطان کی طرف سے جاسوسی کی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ صبح مجھے حراست میں لے کر برہنہ کر دیا جائے گا اور جب میرا مسلمان ہونا ثابت ہو جائیگا تو مجھے کسی بت کے سامنے قتل کر دیا جائے گا۔ تمہیں سلطان کے نام جو پیغام دینا ہے اسی وقت دے دو اور یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرو۔“

آصف علی نے کچھ دن پہلے کی مرتب کردہ معلومات اسماعیل کے حوالے کر دیں اور خوفزدہ اسماعیل اسی وقت وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆-

صبح مندر میں شویتا سے ملاقات ہوئی تو اس نے آصف علی نے پہلا سوال یہی کیا:

”رات اجنبی دوبارہ تو نہیں آیا تھا۔“ آصف علی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگی:

”وہ لا پتہ ہے۔۔۔ وہ یقیناً مسلمانوں کا جاسوس تھا اور کہیں بھی بھاگ جائے، آخر پکڑا جائے گا۔“

اسی دوران پروہت بھیم دیو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان دونوں کے قریب آ گیا اور آصف علی سے مخاطب ہوا:

”ارجن لال جی! کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ شویتا سے دور رہو۔۔۔ مجھے تو تم مقرر کے یا تری معلوم نہیں ہوتے۔ کیوں اتنے نادان بننے ہو۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھتے کہ شویتا کے رگ و پے میں زہر دوڑ رہا ہے؟“

آصف علی نے سادگی سے نفی میں سر ہلادیا:

”وشال پروہت میں شکر گزار ہوں گا اگر تم اس

راز سے پردہ اٹھا دو گے۔“

جگہ کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ شویتا الجھے ہوئے لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:

”پروہت جی کو تم پر کچھ شک ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ اس طرح ہرگز بات نہ کرتے۔ خیر اب تم اپنے تلاشی دینے پر آمادہ ہو جاؤ۔۔۔ اس سلسلے میں میں تمہیں کچھ رعایت تو دے سکتی ہوں لیکن معاف نہیں کر سکتی۔“

آصف علی نے بناوٹی بے نیازی سے جواب دیا۔  
”مجھے کوئی رعایت بھی درکار نہیں ہے۔ تم جس طرح چاہو میری طرف سے اطمینان کر سکتی ہو۔“

شویتا مسکراتی: ”اب ہم تم بہت قریب آ گئے ہیں ارجن لال جی! میں تم پر اعتماد د کرتی ہوں۔ اپنے جیون کی سونگہ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔۔۔ لوگوں کو اگر تم پر مسلمان ہونے کا شبہ ہے تو مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے ڈھال بنی رہوں گی۔ میں بہتوں کی جانیں لے چکی ہوں۔ لیکن تمہیں نہیں مار سکتی۔ نہ جانے ایسا کیوں ہو گیا ہے۔“

”نہیں شویتا! میں یہ چاہوں گا کہ تم اپنے فرض میں بالکل کوتاہی مت کرو۔ میں تم سے کوئی رعایت نہیں چاہتا۔ تم دشمال پروہت کو اصل بات سے ہی مطلع کرنا۔“ آصف علی اچھی تک اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔  
”میں کیسے سوچ سکتی ہوں کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ میں اپنی جان داؤ پر لگا کر بھی تمہیں ہر مصیبت سے بچا لوں گی۔“

آصف علی اپنے خوف اور اندیشے چھپائے شویتا کے والہانہ انداز سے ملاحظہ ہو رہا تھا۔

دوپہر کو وہ آصف علی کو رتن سین کے پاس لے گئی۔ رتن سین انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ شویتا نے جاسوسوں کے پکڑے جانے کے بارے میں سوال کیا تو رتن سین نے کچھ خوشی اور کچھ اداسی سے جواب دیا:

”صرف ایک شخص پکڑا گیا، دوسرا نکل گیا۔ ہمارے آدمی اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ امید ہے وہ بھی بہت جلد پکڑا جائے گا۔“

”پکڑا جانے والا شخص کہاں ہے۔“

بھیم دیو نے مشکوک انداز میں آصف علی کو گھورا۔  
لور شویتا سے کہنے لگا۔ شویتا معلوم نہیں یا تری جھوٹ بول رہا ہے یا واقعی کچھ نہیں جانتا۔ اگر یہ تجھ سے واقعی لاعلم ہے تو یہ خود ہم سب کے لئے ایک راز ہے۔ میں چاہوں گا تم اس کی اصلیت جاننے کی کوشش کرو۔“  
”دشمال پروہت تمہارے حکم کی تعمیل ہوگی۔“ شویتا نے سر جھکا دیا۔

”کب تک؟“

”آج شام کو“

”ضرور۔ اگر سومات جی کے باتری کی بے حرمتی اور عذاب کا خوف نہ ہوتا تو میں اس شخص کو یہیں برہنہ کر کے اپنے شیعے کی تصدیق کر لیتا۔ لیکن یہ سوچ کر ڈر جاتا ہوں کہ اگر میرا شبہ غلط نکلا تو مجھ پر سومات جی کوئی عذاب نازل نہ کر دیں۔“ پروہت نے آصف علی کو گھورا۔

”پروہت جی تم سومات کے عتاب کا خطرہ ہرگز مول نہ لو۔ میں شام تک اس کی اصل حقیقت سے تمہیں آگاہ کر دوں گی۔“ شویتا نے اسے تسلی دی۔  
”اور ہاں خیال رکھنا یہ شخص کہیں ادھر ادھر نہ ہو جائے۔“

آصف علی نے نجات اسی میں دیکھی کہ الٹا چور کو تو الٹا کا ڈانٹے۔۔۔ اس نے تیوریوں پر بل ڈال لیے اور ترش لہجے میں پروہت پر چڑھ دوڑا:

”افسوس کہ تم لوگ سومات جی کے ایک مخلص یا تری کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم لوگ مجھے واقعی مسلمانوں کا جاسوس سمجھتے ہو تو میں اسی وقت اپنے غیر مسلم ہونے کا ثبوت دینے کو تیار ہوں۔“

پروہت بھیم دیو کچھ متاثر ہوا اور اپنے شیعے پر پشیمان سا ہو گیا۔ لیکن اس نے شویتا کو منع پھر بھی نہیں کیا کہ اب تم اسے جانچنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔

مندر سے وہ دونوں ساتھ ساتھ نکلے تو باہر ایک

شروع کر دیا۔ جب یہ بت بن کر تیار ہو گیا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت ملال ہوا کہ بت بہت بڑا بن گیا ہے جس کا مطلب تھا کہ میرا یہ بت حاکم وقت کو بہت پریشان اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ پھر وہ باتیں کرتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔

آصف علی کو غصہ آ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو جب رتن سین نے شویتا سے اظہار عشق کیا تھا اسی وقت اس کا منہ توڑ جواب دیتا۔

ابھی اس کا غصہ کم نہ ہوا تھا کہ رتن سین نے ایک نئی حرکت کی۔ وہ آصف علی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر لے جاتے ہوئے بولا:

”ارجن لال جی تم ذرا دیر کے لئے باہر ہی رو۔ مجھے شویتا دیوی سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔“  
لیکن شویتا نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا:  
”نہیں! ارجن لال جی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ ہر بات ان کے سامنے ہی ہوگی۔“

رتن سین نے رشک بھری نظروں سے آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے شویتا سے پوچھا:

”شویتا کیا ارجن لال جی مجھ سے زیادہ تمہاری نوازشوں کے مستحق قرار پا گئے ہیں۔“

”بات یہ نہیں ہے۔ ارجن لال جی کو میں حد سے زیادہ پسند بھی کروں تو بھی میری جاہت فضول ہے۔ تمہیں ان سے خواہواہ ایسا حسد نہیں رکھنا چاہیے۔“

رتن سین اس کی بات سن کر شرمندہ ہو گیا اور آصف علی کے کاندھے پر سے ہاتھ اٹھالیا۔

پھر وہ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا بت دکھانے لے گیا جو اس کے خیال میں حجم میں کافی بڑا ہونے کے باعث قوم کے لئے تباہی کا باعث بن سکتا تھا۔

رتن سین مسلسل اپنی کاوشیں اور خواہشات گنوارا تھا کہ اچانک شویتا نے اس سے کہا:

”رتن سین تم کچھ بھی کر لو میرا دل مجھ سے جدا نہ ہو سکے گا۔۔۔ تم میرا خیال چھوڑ دو۔ اگر نہ مانے تو اسی

شویتا کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ اس کی بات سن کر رتن سین نے انہیں ساتھ لیا اور ایک تہہ خانے میں جا پہنچا۔ جہاں دن میں بھی چراغ کی روشنی درکار تھی۔ شویتا اور آصف علی دونوں نے اس قیدی کو پہچان لیا تھا۔

وہ اسماعیل ہی تھا۔ آصف علی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسماعیل نے اسے اجنبیوں کی طرح دیکھا۔ رتن سین نے آصف علی پر ایک اچھٹی نظر ڈالی:

”اس کے پاس کسی کی تحریر بھی موجود ہی ہے اس نے گرفتاری سے پہلے ہی اپنے کسی دوسرے ساتھی کو دے کر چلتا کر دیا۔“

”اب تم اسے سزا کیا دو گے۔“ شویتا نے پوچھا۔  
”بہت ہی عبرت ناک۔ اس کی موت سے ہمیں کئی فائدہ پہنچیں گے۔“  
”یعنی؟“ شویتا چوکی۔

”ہم اسے سومات جی کے چرنوں میں قربان کر دیں گے۔ ہم سے دو ایسی غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں جن کا اس قربانی سے بہتر علاج ہو ہی نہیں سکتا۔“

شویتا سوالیہ نظروں سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ رتن سین نے شویتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور جذباتی لہجے میں بولا:

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں شویتا۔۔۔ لیکن

تمہارے زہر سے ڈرتا ہوں، میں نے سور یہ دیوتا کے چرنوں میں گھنٹوں اپنا سر رکھ کر پراختہ کیا ہے کہ وہ تمہارا زہر بلا پن زائل کر دیں۔ لیکن میری دعائیں ہمیشہ بے اثر رہیں۔۔۔ پھر مجھے کسی نے بتایا کہ اگر میں سور یہ

دیوتا کی مورتی اپنے ہاتھ سے تراش کر بناؤں تو دل میں جو منت بھی مانوں گا وہ پوری ہوگی۔۔۔ میں نے اس مقصد سے سنگتراشی کا ہنر سیکھا اور جب مجھے اپنے ہنر پر

اعتماد ہو گیا تو ایک دن میں نے یہ منت مان لی کہ اگر سور یہ دیوتا تمہارے جسم کا دھڑ زائل کر دے تو میں اس کا

ایک شان دار بت بناؤں گا۔۔۔ اس منت کے بعد اپنی دعا کا اثر دیکھے بغیر ہی میں نے سور یہ دیوتا کا بت بنانا

## پیارا پاکستان

میری ساری آن بھی تو ہے  
میری ساری شان بھی تو ہے

تو ہی میرے دل کی دھڑکن  
جسم بھی تو اور جان بھی تو ہے

بن حیرے میں کچھ بھی نہیں ہوں  
میری تو پہچان بھی تو ہے

میری آنکھ میں تیرے آنسو  
ہونٹوں کی مسکان بھی تو ہے

تو اقبال کا سچا پنا  
قائد کا فرمان بھی تو ہے

نہیں دریا، صحرا، ساگر  
میرا نخلستان بھی تو ہے

ارشاد کی تو آنکھ کا تارا  
اور دل کا ارمان بھی تو ہے

چاند محمد ارشد، سرگودھا

بندھا ہوا تھا۔

جمع کے لوگ یوں آگے بڑھ کر اسے دیکھ  
رہے تھے جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ اسماعیل  
کا زیریں لباس ہنایا گیا تھا تاکہ لوگ اسے پہلی نظر  
میں پہچان لیں کہ وہ مسلمان جاسوس ہے۔

شوہتا اور آصف علی بھی ہجوم کو چرتے ہوئے اس  
کے قریب پہنچ گئے۔ اسماعیل نے انہیں دور سے آتا دیکھ  
کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وہ رسیوں کی بندش کے کرب  
سے تلملارہا ہو اور اس وقت اپنی مادری زبان میں بڑبڑا  
رہا تھا۔ جس کا مقصد آصف علی کو پیغام دینا تھا:

طرح الجھنوں میں بھستے چلے جاؤ گے۔  
”تم کچھ بھی کہو دیوی! لیکن میں اپنے من کی مراد  
پانے کے لئے ایک کوشش مزید کروں گا۔“ رتن سین  
نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔  
”تم کچھ بھی کر لو لیکن سچ یہ ہے کہ اب میرا اعتماد  
دیوی دیوتاؤں سے اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ میرے دکھوں کا  
علاج کسی دیوتا کے پاس نہیں ہے۔“  
شوہتا کی بات سن کر رتن سین نے اس کے منہ پر  
ہاتھ رکھ دیا:

”شوہتا تم تو ناسک ہوتی جا رہی ہو۔ تمہارے غلط  
خیالات اور جھوٹے وشواس تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑیں  
گے۔۔۔ بھگوان کے لئے مایوس مت ہو۔“  
شوہتا نے آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:  
”ارجن لال جی! تم ہمیں متھرا لے چلو۔ وہاں  
کچھ دن رہ کر میں بدری ناتھ چلی جاؤں گی اور بقیہ  
زندگی گمنامی میں گزار دوں گی۔“  
رتن سین نے چونک کر کہا:

”کیا پاگل ہو گئی ہو تم اپنے بابت اتنا بڑا فیصلہ  
چپ چاپ کیسے کر سکتی ہو تم۔ کیا وشال پر وہت بھیم دیو  
تمہیں یہاں سے آسانی جانے دے گا۔۔۔ تمہیں تو  
ابھی مسلمانوں کے بادشاہ محمود کے لئے موت کا سامان  
کرنا ہے۔ سنا ہے عنقریب سومنات پہنچنے والا ہے وہ۔“  
اس کی بات سن کر شوہتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے  
۔ مجبوری اور بے بسی سے اس کا دل بھرا آیا تھا۔ جب کہ  
آصف علی اس ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا  
تھا۔

-☆-

چاند گرہن پڑ رہا تھا۔ اس برہی ساعت میں  
سارے پجاری پریشان اور مضطرب تھے۔ سومنات جی  
کے سامنے انسانوں کا ہجوم تھا۔ وشال پر وہت بھیم دیو  
سومنات جی کے قدموں میں سگی کے دیے جلا رہا تھا  
۔ سومنات جی کے سامنے کی جگہ خالی تھی۔ اور قریب ہی  
پتھر کی ایک سل رکھی ہوئی تھی۔ سل کے پاس اسماعیل



Banacin Rehmaton  
Ka Maheena, Lazzat Bharra

**Kashmir**  
BANASPATI  
Bus Yehi Hai Achi Zindagi!



بھوی کو ناپاک کرتا رہا۔ شاید اسی وجہ سے مہادیو نے ہم پر یہ عتاب نازل کیا ہے کہ سوم جی گرہن کے وجہ سے سخت مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔۔۔ سوم جی کو اس مصیبت سے نجات دلانے اور اس مسلمان کے ناپاک قدموں کی گندگی کے پرانچٹ کے لئے ہمیں اسے بھینٹ چڑھانا ہو گا۔ سومات جی اس کی بھینٹ چاہتے ہیں۔ جب اس کا گرم گرم خون سومات جی کے چروں میں جائے گا تو انہیں سکون پہنچے گا اور ان کے غصے اور عتاب میں کمی آجائے گی۔“

پھر بھیم چند نے شویٹا کو اشارے سے قریب بلایا۔ شویٹا بھیم دیو کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ بھیم دیو نے آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”شویٹا کیا تم نے تنہا کے اس یاتری کے سلسلے میں اپنا اطمینان کر لیا ہے؟“

”ہاں وشال پروہت جی۔۔۔ یہ یاتری ہندو ہی ہے۔“ بھیم چند نے شویٹا کو گھورا اور کہنے لگا:

”تو پھر اس یاتری سے کہو کہ سومات جی نے اسے اپنی خدمت کا بہترین موقع عطا کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ قدم آگے بڑھائے اور جلاو کے ہاتھ سے گنڈاسا لے کر اس مسلمان کا سرتن سے جدا کر دے۔“

شویٹا اس حکم پر گھبرا گئی تھی لیکن وشال پروہت سے بحث کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ چپ چاپ آصف علی کے پاس گئی اور بھیجی آواز میں بھیم دیو کا حکم سنا دیا۔

آصف علی کو ایسا لگا جیسے شویٹا کی آواز لوہے کی سلاخ بن کر دل میں اتر گئی ہو۔ لیکن انکار یا بحث کا موقع نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچے بغیر آگے بڑھا اور سیاہ قامت دیو سے گنڈاسا لے لیا۔

اسماعیل نے سہم کر آصف علی کو دیکھا اور بین کرنے کے انداز میں غیر ہندی زبان میں پوچھا:

”سلطان محمود ملتان تک آچکا ہے۔ اسے میرے انجام سے مطلع کر دینا۔ میرا خون رائیگاں نہیں جائیگا۔ جب سومات کا قلعہ محاصرے میں لے لیا جائے تو سلطان کو مطلع کر دینا کہ قلعے کے صدر بھانک کے بائیں طرف سے قلعے پر چڑھائی کی کوشش کی جائے۔ وہاں ہاتھیوں کو اوپر لے جانے کی غرض سے قلعے کی فصیل بہت چوڑی کر دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے سلطان کے ہزاروں آدمی اوپر اپنے قدم جما سکتے ہیں۔ سلطان کو یہ بھی بتا دینا کہ سومات کے لوگ اپنی طاقت کے بجائے سومات کی کرامت پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں۔۔۔ اور ہاں ایک بات اور اس زہریلی ناگن شویٹا سے ہوشیار رہنا۔ اور سلطان کو بھی اس کے زہر سے بچانے کی کوشش کرنا۔۔۔ پروہت معلوم نہیں کس طرح اس کی مدد سے سلطان کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔“

اسی لمحے ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر اسماعیل کا منہ کپڑے سے بند کر دیا۔ آصف علی سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا، لیکن وہ فرض کی ادائیگی میں یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور تھا۔ پھر پروہت بھیم دیو کا اشارہ ملتے ہی ایک کرخت مزاج اور سخت خدو خال کا تنگ دھڑنگ، سیاہ دیو قامت شخص گنڈاسا لے کر آگے بڑھا اور اسماعیل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اسی لمحے پروہت بھیم دیو نے گردن اٹھائی اور لوگوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا:

”سومات جی کے پجاریو، اور خدمت گارو یہ ناپاک شخص جو سومات جی کے روبرو بندھا پڑا ہے مسلمانوں کے بادشاہ کا جاسوس ہے۔ اس نے غزنی کے بادشاہ محمود کو سومات کے راز بھیج دے ہیں اور اس کی حریص نظریں سومات کی طرف اٹھ چکی ہیں۔ اس شخص کا جاسوسی کے علاوہ ایک دوسرا سنگین جرم اور بھی ہے۔ یہ مسلمان تھا اور دھوکے سے ہمارے مندروں میں داخل ہو کر ہماری وشال دھرتی اور پوتر



”تو مجھے تم قتل کرو گے۔۔۔ لیکن میری زندگی کے دن تو اس عورت کے زہر کی وجہ سے پہلے ہی کم ہو گئے ہیں۔“

آصف علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس کا گنڈا سے والا ہاتھ اوپر اٹھا اور پوری قوت سے نیچے گر کر اسماعیل کا سر جسم سے الگ کر گیا۔ اسماعیل کا جسم بری طرح پھڑکنے لگا تھا۔ خون کی دھار فوراً کی طرح اچھلی اور سومات جی کے چروں کو تر کرنے لگے۔

کچھ چھیننے آصف علی کی دھوٹی کو بھی تر کر گئے۔ چاروں طرف سے عجیب قسم کا شور اٹھا اور پنڈت زور زور سے اشلوک پڑھنے لگے۔ آصف علی کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے اور شویتا کو ساتھ لئے اس خونی منظر کو چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

☆-

اسماعیل کی موت کے بعد متھرا کے یاتری پر دوبارہ شبہ نہیں کیا گیا تھا۔ شویتا اب اس سے زیادہ قریب آ گئی تھی۔ دوسری طرف رتن سین کیلئے آصف علی ایک مسئلہ بن گیا۔ مگر شویتا کی ناراضگی کے ڈر سے وہ خاموش رہنے پر مجبور تھا اور خاموشی سے سوریا دیوتا کا دوسرا مجسمہ بنا رہا تھا تاکہ دیوتا کی مہربانی سے شویتا کا علاج ہو جائے اور وہ بے ضرر عورت بن جائے۔

ادھر یہ افواہ پھیل چکی تھی کہ سلطان محمود غزنوی سومات کے قریب پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ قلعے کے دروازے بند کیے جا چکے تھے اور اوچی اوچی برجیوں اور فصیلوں سے اہل سومات محمودی لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔ پورے شہر میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور سومات کے فدا یوں کے دلوں میں جوش اور ہیجان کے ساتھ ساتھ محمود غزنوی کی ہیبت اور خوف بھی کارفرما تھا۔

شویتا مختلف قسم کے اینٹوں اور مصالحوں سے اپنے جسم میں مزید نکھار پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ آصف علی سے بھی کم ملتی تھی۔ ہاں البتہ رتن سین کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ سلطان محمود کی آمد سے پہلے ہی آصف علی موقع پا کر سومات سے نکل

جانا چاہتا تھا مگر جانے سے پہلے شویتا سے طویل ملاقات کا خواہش مند تھا۔ ایک دن صبح صبح رتن سین شویتا کو تلاش کرتا ہوا آصف علی کے حجرے میں آن پہنچا۔

تھوڑی دیر بعد شویتا بھی وہیں آ گئی۔ اور ان دونوں سے مخاطب ہو کر بولی:

”رتن سین میں ارجن لال جی کے سامنے تم سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ پتہ نہیں کل کیا ہو جائے۔ اسی لئے میں ایک اہم بات کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔“

رتن سین کے ساتھ ہی آصف علی بھی ہمہ تن گوش متوجہ ہو گیا۔ شویتا کچھ دیر خاموش رہ کر بولی:

”میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں کو اپنے منصوبے سے مطلع کر دوں۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ تم دونوں میں سے کوئی ایک مجھ ابھاگن کو کس طرح اور کس شرط پر حاصل کر سکتا ہے۔ پھر آصف علی کی طرف متوجہ ہوئی:

”لیکن میں رتن سین کی تڑپ اور لگن بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔“ یہ سن کر آصف علی کا دل ڈوبنے لگا اور اس سے خاموش نہ بیٹھا گیا:

”شویتا میں متھرا واپس جانا چاہتا ہوں۔۔۔ اگر

اس سفر میں تم میرا ساتھ دو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔

ورنہ کوئی شکایت نہیں کروں گا۔“

رتن سین سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ آصف علی

کی آواز پر اس نے اپنا سر اٹھایا اور غمزہ آواز میں بولا:

”ارجن لال جی! تم ابھی متھرا واپس نہ جاؤ۔

یہیں رہو۔ غزنی کا بادشاہ کسی بھی وقت پہنچنے والا ہے۔

وہ سومات پر لشکر کشی کرے گا اور اس جنگ کا وہی نتیجہ

نکلے گا جواب تک مسلمانوں سے جنگ کرنے کا ٹکٹا رہا

ہے۔۔۔ سوریا دیوتا کا غلطی سے بڑا بن جانے والا بت

ہمیں بتا چکا ہے کہ ہمیں شکست ہو جائے گی۔ اگر ہمیں

شکست ہو گئی تو میں خود میدان جنگ میں سپاہی کی

موت مر چکا ہوں گا۔ اس وقت شویتا کو تمہاری ضرورت

شدت سے محسوس ہوگی۔“

شوہتا، رتن سین کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی اور کہا: ”تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اگر جنگ میں ہمیں شکست ہوئی تو تم میدان جنگ میں مارے جاؤ گے۔“

رتن سین نے اداس نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا: ”شوہتا تمہیں معلوم ہے کہ میں سورہ دیوتا کا ایک دوسرا بت بنا رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا تناسب قائم رکھوں لیکن ناکام رہا اور سوریا دیوتا بہت چھوٹے بن گئے ہیں اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اگر سوریا دیوتا تناسب سے چھوٹے بن جائے تو بنانے والے پران کا عتاب ضرور نازل ہوتا ہے۔ اور وہ شخص تباہ و برباد ہو کر اپنی جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو چکا ہے۔“

”پھر بھی میری ایک خواہش ہے“ شوہتا نے کہا ”میں عنقریب سومنات سے باہر چلی جاؤں گی اور غزنی کے بادشاہ تک کسی بھی طرح رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ محمود میرے حسن کا گرویدہ ہو جائیگا۔ اور مجھے اپنے حرم میں داخل کر لے گا۔۔۔ بس میرا اس کے ساتھ چند راتیں گزار لینا ہی کافی ہوگا۔ پھر سلطان کو دینا کی کوئی طاقت مرنے سے نہیں بچا سکے گی۔“ آصف علی نے اس کی بات توجہ سے سنی اور بولا:

”تم پہلے اپنی خواہش بیان کرو۔“

شوہتا نے کہا:

”مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ایک مرد کی ضرورت ہے۔ جو مجھے اپنی بیوی بنا کے مسلمانوں کے لشکر کے سامنے سے گزرے۔ مسلمان میرے حسن سے متاثر ہو کر مجھے گرفتار کر لیں اور اپنے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ رتن سین میرے ساتھ رہے۔ گرفتاری سے پہلے تو وہ شور وغل کرے۔ اس کے بعد سلطان سے مرعوب ہو کر مجھے بخوشی سلطان کے حوالے کر دے اور پھر جب میں سلطان کا کام تمام کر کے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں تو رتن سین فرار میں میری مدد کرے۔“

رتن سین نے مایوسی سے مسکراتے ہوئے کہا:

”تم نے سوچ سمجھ کر ایسی خواہش کی ہے جیسے پورا کرنا کم از کم میرے اختیار میں نہ ہو۔ میں سپاہی ہوں۔ اور اس وقت میدان جنگ میں ہوں گا۔ تمہارے ساتھ نہیں۔ تمہارا ساتھ ان حالات میں تمہارا کامیابی ہی دے سکتا ہے۔“ شوہتا نے تکلیف دہ لہجے میں کہا:

”شرط جیت کر مجھے حاصل کر لینا کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔ میں جس کسی کے حصے میں آؤں گی وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی خطرے میں ڈال لے گا۔ میں کسی کیلئے بھی کار آمد نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ تم دونوں مجھ سے محبت کرتے ہو اور میرے طلب گار ہو اس لئے میرا فرض ہے کہ تم دونوں کا دل نہ توڑوں اور ظاہرے مجھے تم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ ویسے ارجن لال جی بہت اچھے آدمی ہیں میں انہیں پسند کرتی ہوں۔“

وہیں وشال پروہت بھیم دیوبھی پہنچ گیا۔ اور یہ بد خبر سنا دی کہ غزنی کا بادشاہ اپنی فوج سمیت دریائے سرستی کے کنارے فیصل کے نیچے خیمہ زن ہو چکا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی رتن سین اٹھ کھڑا ہوا:

”اچھا شوہتا تمہارا مجھے آواز دے رہے ہیں۔ میں چلا زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔ نہ رہی تو تمہاری یاد لئے موت کا سوا گت کروں گا۔“

شوہتا بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بھیم چند اور آصف علی کا ادب لحاظ کیے بغیر ہی رتن سین سے ہم آغوش ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار کیا اور پھر جدا ہو گئے۔

☆-

اب رتن سین ان دونوں کے درمیان سے ہٹ چکا تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں قلعے کی فیصل کے قریب خیمہ زن تھیں ان حالات میں شوہتا کو ایک نہایت اہم کام سرانجام دینا تھا۔

اس وقت تقریباً سناٹا تھا۔ آصف علی سومنات جی کے رو برو کھڑا شوہتا کا انتظار کر رہا تھا۔

پاکستانی وقار  
دارتِ علم و ادب  
یہاں ہے

اچانک اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں تو اس نے ایک مست اور لڑکھڑائی حسینہ کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ جب وہ ذرا قریب آگئی تو آصف علی نے پہچان لیا کہ وہ شویتا ہی ہے۔

لیکن اس وقت شویتا کی شان ہی کچھ اور تھی۔ اس نے گلے میں کالا ناگ لپٹا ہوا تھا۔ جس کا پھن اس کی گردن پر تھا۔ ناگ کی بار بار شعلے جیسی زبان لپکتی اور گردن پر ٹھوکا سالگا کر پھن میں غائب ہو جاتی۔

آصف علی سمجھ گیا کہ اب شویتا بس کچھ ہی دیر کی مہمان ہے۔ لیکن شرایوں کی طرح نشے میں چور وہ آصف علی کے سامنے پہنچ گئی اور ہنسنے لگی۔

”ارجن لال جی! تمہیں میری چاہت کا دعویٰ ہے نا؟“ آصف علی مردان نے جواب دیا:

”ہاں بالکل۔۔۔ کیا تمہیں اب بھی شبہ ہے۔ شویتا نے شرایوں کی طرح جواب دیا آج تمہیں سومات کے سامنے اپنی چاہت کی سوگند کھانا پڑے گی۔ یہاں ہم عہد کریں گے کہ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے کبھی کسی اور سے شادی نہیں کریں گے۔“

آصف علی نے گلے میں پڑے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”لیکن یہ گلے میں سے ناگ تو دور کرو مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔“

شویتا لڑکھڑائی تو آصف علی آگے بڑھ کر اسے سنبھالتے ہوئے کہا:

”کسی وید کو بلاؤں۔۔۔ تمہیں تو سانپ نے ڈس لیا ہے۔“ شویتا نے مست و مخمور نظروں سے آصف علی کی طرف دیکھا اور کہنے لگی:

”تم میری فکر مت کرو۔ یہ سانپ میرا کچھ نہیں لگاؤ سکتا۔ بلکہ اگر میں چاہوں تو اس سانپ کو ہلاک کر سکتی ہوں۔“

وہ کس طرح؟“

شویتا نے سانپ کو گردن سے نکال کر ہاتھ میں لیا

اور اسے کئی جگہ سے دانت سے کاٹ لیا۔ سانپ تڑپا اچھلا اور کئی بار شویتا پر منہ بھی مارا۔۔۔ لیکن بے سود۔ آخر سانپ جھومنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا۔

شویتا نے ناگ دیوتا کو ایک کونے میں رکھا اور واپس آگئی۔ آصف علی یہ منظر دیکھ کر دل گیا تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد شویتا اپنی اصل حالت میں آگئی اور پھر سے ایک معصوم اور خوبصورت دوشیزہ بن گئی۔

آصف علی نے سرگوشی کی سومات جی میں نے شویتا کو دل و جان سے چاہا ہے۔ اور تمہارے سامنے اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ تازہ سیت شویتا کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت سے شادی نہیں کروں گا۔“

شویتا نے بھی لڑکھڑائی ہوئی آواز میں عہد کیا:

”سومات جی! تمہاری یہ داسی بھی اس بات کا عہد کرتی ہے کہ میں تمہارے یا تری ارجن لال جی کے سوا کسی اور کو نہیں چاہوں گی اور ان کے ہوتے ہوئے کسی اور مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گی۔“

جب وہ دونوں ایک دوسرے سے موت اور زندگی کا عہد و پیمان کر کے باہر نکلے تو دونوں کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے۔ شویتا کا تو انگ انگ مسرت و سرشار تھا۔ راستے میں آصف علی نے اس سے پوچھا کہ شویتا تمہاری ہر بات عجیب ہے کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ ناگ والا واقعہ کیا اور کیوں تھا؟

شویتا پھبکی سی ہنسی ہنس دی: ”ناگ تو میری غذا ہیں ارجن لال جی جب میرا جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور اعضا میں ایک قسم کا کھچاؤ اور سستی پیدا ہونے لگتی ہے تو میں ناگ سے ڈسوا کر چاق و چوبند ہو جاتی ہوں۔“

یہ حقیقت سن کر آصف علی کو اس سے شدید خوف محسوس ہوا مگر شویتا کی محبت کا سحر ہر زہر پر حاوی تھا۔

-☆-

آصف علی کے لئے قلعے سے باہر نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن بھیم دیو اور شویتا نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا تو اس کی مشکل بھی آسان ہو گئی۔

اور بے چین ہو گیا۔ ایسا متناسب اور دلکش نسائی روپ اس نے کم ہی دیکھا تھا۔ محمود کے داہنی طرف ملک ایاز کھڑا تھا۔ وہ ملک ایاز جس میں عقل اور حسن یکجا ہو گئے تھے۔ والی کشمیر کا فرزند جسے بردہ فروشوں نے اغوا کر کے بدخشاں میں فروخت کر دیا تھا اور پھر اس کی قسمت نے اسے محمود تک پہنچا دیا تھا۔

محمود نے ایاز کی طرف دیکھا اور حکم دیا: ”ایاز! اس فتنہ خرد و نظر سے پوچھو۔ یہ ہمیں کیا بتانا چاہتی ہے؟“ ”رب سلطانی اور اقبال محمودی نے شویتا کی ساری تیزی و طراری لمحہ بھر میں ہوا کر دی تھی۔

ایاز نے اس سے بیسیوں سوال کر ڈالے اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ حسن و جمال کی یہ ساحرہ اپنے اصل منصوبے کے سوا سب کچھ بتا سکتی ہے۔ ہر سوال کا شویتا نے یہی جواب دیا تھا کہ مجھے جو کچھ بتانا ہے سلطان کو تجھ میں بتاؤں گی۔“

چنانچہ جب ایاز نے سلطان کو اپنی کوشش سے آگاہ کیا تو محمود نے لا پرواہی اور بے نیازی سے حکم دیا۔

”لڑکی کو سخت نگرانی میں رکھا جائے۔ ہم غزنی پہنچ کر اس سے ملاقات کریں گے۔“ اور پھر ایاز سے کہا: ”ملک ایاز تم اس لڑکی سے کہو کہ ہماری کمزوری عورت نہیں ہے۔۔۔ بلکہ نئے اور مضبوط قلعوں کی تعمیر ہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہندی عورتیں ہمیں فتح کر لیں۔“

سلطان کے حکم کے بعد شویتا کو ایک خیمے میں قید کر دیا گیا۔

-☆-

سلطان کے ایما پر ایاز، آصف علی کے پاس پوچھ گچھ کرنے پہنچا اور جب اصل حقیقت کا اظہار ہوا تو اس نے آصف علی کو سلطان محمود سے ملادیا۔

آصف علی نے ساری داستان سلطان کو سنا دی اور آخر میں بتایا کہ شویتا کے بارے میں اسے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے وجود میں زہر شامل ہے۔ اس لئے

اس رات شویتا اور آصف علی قلعے کے مغربی دروازے سے نکلے اور چوری سے بھاگنے کے انداز میں بچتے بچتے محمود کے لشکر کے قریب سے گزرے۔ یہ ۶ جنوری ۱۰۲۶ء کا دن تھا۔

کہر آلود فضا میں محمودی سپاہ دریائے سرستی کے کنارے خیمہ زن تھی۔ مسلمانوں نے شویتا اور آصف علی کو پکڑ لیا۔ انہیں شبہ تھا کہ یہ جوڑا کوئی خاص پیغام یا راز لے کر کسی ہندو راجا کے پاس جا رہا ہے۔ شویتا کے حسن و جمال نے سبھی کو متاثر کیا تھا۔

جہاں یہ لوگ پکڑے گئے تھے وہاں سے محمود غزنوی تقریباً ایک میل دور تھا۔ سپاہیوں نے ان دونوں کو الگ الگ قید کر دیا اور ان سے راز اگوانے کی کوشش کرنے لگے۔ آصف علی نے اپنی بات جو کچھ بتا یا کوئی اس پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔

شویتا یہ کہتی تھی کہ مجھے بادشاہ کے رو برو لے چلو۔ مجھے جو کچھ بتانا ہے اسی کو بتاؤں گی۔ جب کہ آصف علی بے چینی سے اپنے نگران سپاہیوں سے درخواست کر رہا تھا کہ خدا کے لئے اسے محمود سے نہ ملانا وہ بہت خطرناک عورت ہے۔

دونوں کی تضاد بیانی سے محمود کے سپاہیوں کو شبہ ہوا کہ یہ دونوں ہی اہم شخصیات ہیں اور یقیناً کسی اہم منصوبے کے سلسلے میں جا رہے تھے۔ لیکن اب کمزور دل عورت سلطان محمود سے شاید اس لئے ملنا چاہتی تھی کہ جو کچھ اسے معلوم ہو جلد از جلد بادشاہ کو بتا کر گلو خلاصی کر لے۔ اس کے برعکس مرد عورت کو محمود سے یوں دور رکھنا چاہتا تھا کہ ان کا راز راز ہی رہے۔

آخر کار آصف علی ناکام رہا اور شویتا کو سلطان محمود کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ شویتا کے پاس ناز و انداز کے جتنے تیر تھے سبھی محمود پر چلانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ آواز کی کھنک، چال کا مستانہ انداز اور وہ ہنس ہنس کر سلطان محمود کے دل پر بجلی گرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سلطان محمود نے اس پیکر رعنائی کو غور سے دیکھا

سومنا کے سر کردہ لوگوں نے اسے آپ کے پاس بھیج کر آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔

اس موقع پر آصف علی نے سلطان کے سامنے یہ درخواست بھی پیش کی کہ اس لڑکی کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کی درخواست سن کر سلطان محمود نے بے نیازی سے کہا: ”جب بقول تیرے اس عورت کے وجود میں زہر ہے تو پھر تو اس میں دلچسپی کیوں لیتا ہے۔ ناگن کو ڈسنے کے لئے پالنا کون سی دانشمندی ہے۔“

سلطان کا جواب سن کر آصف علی گھبرا کر بولا: ”غلام کی منشا تو یہی تھی، ویسے حضور کی جیسی مرضی ہو اس کا حکم صادر فرمادیں۔“ اسماعیل کی ہلاکت کا سن کر محمود بہت افسوس ہوا تھا۔

سومنا کی برہیوں اور فیصلوں پر ہندوؤں کا ہجوم تھا اور وہ چیخ چیخ کر مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ اے مسلمانوں تم نے اب تک جو گناہ مندروں کو تباہ و برباد کر کے کیے ہیں سومان جی نے ان کی سزا دینے کیلئے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ اب تم واپس نہ جا سکو گے۔

اوپر سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور نیچے مسلمان قلعے کی فیصل تک پہنچ چکے تھے۔ تیروں کی بارش ان کے ارادوں میں حائل ہونے سے معذور تھی۔ سیرھیوں کی مدد سے قلعے پر چڑھنے والے مسلمان زخمی ہو کر نیچے گر رہے تھے اور سیرھیوں کی خالی جگہ دوسرے سپاہی لے لیتے تھے۔

مسلمان تیر انداز بھی تیروں کی بوچھاڑ سے فیصل پر ہندو سپاہ کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اسی جدوجہد میں شام ہو گئی اور دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے گئے۔

دوسرے دن تازہ دم سپاہ پھر فیصل پر چڑھنے لگی۔ اور ہندوں کی زبردست مزاحمت کے باوجود اوپر چڑھ گئی اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ مسلمانوں کی شجاعت اور بے جگری سے خوفزدہ ہو کر سومان کے پجاری مندر میں داخل ہوئے اور اس سے لپٹ کر گریہ و

زاری کرنے لگے۔ محمودی سپاہ مندر کے دروازے تک پہنچی تو ہندو سپاہ مندر سے نکلی اور دیوانہ وار مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی۔

ان کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کئی جگہ مسلمان پسپا ہو گئے۔ لیکن شام تک مجموعی حیثیت سے مسلمان حاوی رہے۔ رات کی سیاہی نے دونوں افواج کو اپنی اپنی جگہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کا پھانگ کھل گیا لیکن ابھی سومان جی محفوظ تھے اور ایک فیصل کن معرکہ باقی تھا۔ محمود نے قلعے کے پھانگ پر ایک طاقتور دستہ بٹھا دیا اور خود بیرون قلعہ لشکر میں واپس چلا گیا۔

اگلے روز صبح سویرے محمود غزنوی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرب و جوار کے ہندو راجاؤں کی فوجیں اسے محاصرے میں لے چکی تھیں۔

اسی دوران آصف علی نے یہ اہم خبر پہنچائی کہ اگر لڑائی فوری شروع نہ کی گئی تو ہندوؤں کو مزید کمک مل جائے گی اور مقابلہ دشوار ہو جائیگا۔

محمود غزنوی سخت پریشان تھا۔ غزنی سے ہزاروں میل دور، تنہی ہوئی سپاہ، واپسی کی راہیں مسدود، دشمنوں کے علاوہ حریف کی کثرت۔۔۔ یہ ساری باتیں محمود غزنوی کو پریشان کر رہی تھیں۔ چنانچہ محمود جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

میدان جنگ میں اترنے سے قبل سلطان محمود غزنوی نے سجدے میں گر کر روتے ہوئے اپنے رب سے فتح کی دعا مانگی تاکہ ان نام نہاد بتوں کو پاش پاش کر سکے۔

اس کے بعد خوزیز جنگ شروع ہوئی تو شام سے پہلے اس کا فیصلہ محمود کے حق میں ہو چکا تھا۔ محاصرین کے بے شمار سپاہی قتل اور بقیہ فرار ہو چکے تھے۔

محمود غزنوی، آصف علی کی راہنمائی میں سومان کے مندر میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر مفتوح اور شکست خوردہ وصال پر دہت بھیم دیو او دوسرے پجاری صف بستہ بت کے سامنے کھڑے رو رہے تھے۔ سلطان محمود اپنے امرا کے ساتھ بت کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے

ہاتھ میں ایک بھاری گرز تھا۔ آصف علی ہندوؤں والے لباس میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بھیم دیو نے اسے حیرت سے دیکھا اور اپنی زبان علاقائی میں بولا:

”تو ہم نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور آصف علی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا:

”ارجن لال جی! ہم تمہارے اصل نام سے واقف نہیں ہیں درنہ اسی نام سے مخاطب کرتے۔ تم سے بنتی ہے کہ اپنے بادشاہ سے ہماری سفارش کر دو کہ وہ جتنی دولت چاہے ہم سے لے لے لیکن سومات جی کو نہ توڑے۔“

انہیں باتیں کرتے دیکھ کر محمود غزنوی نے آصف علی سے پوچھا:

”یہ کیا کہتا ہے۔“

آصف علی نے صاف صاف بتا دیا۔ محمود نے اپنے امرا سے مشورہ کیا کہ ہمیں اس پردہت کا کہا مان لینا چاہیے یا نہیں؟ بعض نے پردہت کی بات ماننے کا مشورہ دیا مگر سلطان محمود غزنوی خود کو بت فروش کہلوانے کا الزام نہیں لینا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود گرز اوپر اٹھایا اور پوری قوت سے سومات پر دے مارا۔

بت ضرب محمودی برداشت نہ کر سکا اور ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر پردہت بھیم دیو اور دوسرے پجاری چیخیں مار کر رونے لگے۔

آصف علی، سلطان سے نظریں بچا کر اس جگہ پر جھکا جہاں اسماعیل کو قتل کر دیا گیا تھا اور کہا:

”اسماعیل تمہارا خون رایگاں نہیں گیا۔۔۔ جس سومات کے قدموں میں تمہیں قربان کیا گیا تھا۔ آج وہیں تمہارے خون پر خود سومات کو قربان کر دیا گیا ہے۔“

-☆-

فتح سومات کے بعد آصف علی محمود غزنوی کی

اجازت سیٹھیتا سے ملنے گیا تو وہ خیمے میں مغموم اور اداس بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھا اور دھیمے لہجے میں مطلع کیا:

”شوینا! سومات فتح ہو گیا ہے۔۔۔ آج مندر اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور اب تمہارے حجروں میں محمودی سپاہ رہ رہی ہے۔“

لیکن اس نے دیکھا کہ شوینا پر اس بری خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ پرسکون انداز میں غمگینی لگائے آصف علی کو دیکھتی رہی اور پھر پوچھا:

”اور کیا ہوا وہاں؟“

”سومات جی کو سلطان کے گرز نے پارہ پارہ کر دیا اور سومات جی کا سر ٹوٹ کر وہیں جا گر ا جہاں اسماعیل نامی مسلمان جاسوس کو قتل کیا گیا تھا۔“

”سومات جی ٹوٹ گئے اور اسے توڑنے والے ابھی بھی زندہ ہیں؟“ بھجہ ابھی تک غیر جذباتی تھا۔

”ہاں۔۔۔ نا صرف زندہ ہیں بلکہ انہیں تو سومات جی کا بیش بہا خزانہ بھی مل گیا ہے۔“ آصف علی نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

”وشال پردہت کہاں ہے؟“ شوینا نے گہری سانس لی۔

”وہ بھی کہیں چلے گئے ہیں۔ کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے ہیں۔“

”اور تن سین؟“

”ابھی تک لاپتہ ہے۔ شاید میدان جنگ میں مارا گیا ہے۔“ آصف علی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”اور تمہارا کیا تری کہاں گیا؟“

شوینا کے اس سوال پر آصف علی پہلی مرتبہ چمکا کر رہ گیا۔ لیکن پھر سنبھل کر جواب دیا:

”وہ تو تمہارے سامنے موجود ہے۔“

”کیا تمہیں گرفتار نہیں کیا گیا۔۔۔ تمہیں کوئی سزا نہیں دی گئی؟“ اس نے خالی نظروں سے آصف علی کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ نہ صرف یہ کہ مجھے کوئی سزا نہیں دی



گئی بلکہ میری وجہ سے تم ابھی عتابِ سلطانی سے محفوظ ہو۔“

کرنے کا ارادہ کیا۔

☆-

اس واقعہ کے بعد آصف علی شویتا سے بارہا ملنے گیا اور ہمیشہ اس کے وجود میں حلولِ زہر کے بارے میں پوچھتا رہا۔ لیکن شویتا ہمیشہ ٹال گئی۔ بقول اس کے: ”میرے اس انکشاف سے ہندو دھرم کے مخالفوں کو یہ اہم راز معلوم ہو جائے گا۔“

جب سلطان محمود غزنوی کی فوج غزنی واپس جانے لگی تو آصف علی شویتا سے الوداعی ملاقات کے لئے گیا:

”شویتا میں غزنی واپس جا رہا ہوں۔“

”اچھا۔۔۔“ مختصر اور جذبات سے عاری جواب ملا۔

”تم یہاں کس کے سہارے رہو گی۔ سومات تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے اور اب یہاں کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا ہے۔ کیا تمہیں اپنے عہد و بیان کا خیال نہیں رہا۔“ آصف علی نے اسے کچھ یاد دلایا۔

”مجھے سب یاد ہے۔ لیکن ایسے عالم میں کیا مجھ پر اس عہد کی پاسداری لاگو ہوتی ہے جب کہ بساط ہی الٹ چکی ہے۔۔۔ ہاں اگر رتن سین زندہ ہوتا تو میں اسی کے سہارے جی لیتی۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی ”اگر تم ایک وعدہ کرو تو میں تمہارے ساتھ غزنی چلنے کے لئے تیار ہوں۔“

”تم جو کہو گی مجھے منظور ہو گا۔“

”میں جنم جنم کی ہندو ہوں اور ہندو دھرم نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔ گو ہندو دھرم نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی اور مجھے زہر آلود کر کے زندگی بھر کی خوشیاں چھین لی ہیں۔ لیکن پھر بھی میں کسی صورت اپنے مذہب سے انحراف نہیں سکتی۔۔۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ غزنی میں تم مجھے مذہب بدلنے پر مجبور نہ کرو، اور مجھے اپنے عقیدے کے مطابق جینے دو۔“

”تم اس کی بالکل فکر مت کرو۔۔۔ مذہب کے معاملے میں تم پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔“

اس پر شویتا پھسکی سی ہنسی ہنسی: ”ارجن لال جی! بہت خوب۔ یعنی اب تم اپنی اصل پر آگئے ہو۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ وہ انجان سا بن گیا۔

”تم ہرگز یہ مت سمجھنا کہ میری نگاہوں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔۔۔ سچی بات ہے کہ یہ تو میرا ناستک اور دل کا جھکاؤ تھا جس نے تمہیں زندہ رکھا۔۔۔ میں اندر سے بہت دکھی ہوں اور اسی دکھ نے مجھے بے حد رحم دل بنا دیا ہے۔۔۔ تم مسلمان ہو، یہ بات میں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔“

آصف علی کے وجود میں سردی کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔ چنانچہ وہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا:

”شویتا میں جس مقصد کے لئے سومات آیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ ہم خدا پرست لوگ سومات والوں کا تکبر اور کفر خاک میں ملانے آئے تھے۔ تم نے مجھ پر جو احسانات کیے ان کا اتارنا ناممکن ہے۔۔۔ پھر بھی تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ میرا اور تمہارا عہد اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ مگر شاید اس صورت میں تم اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکو۔“

”اگر تم کر سکو تو میرا ایک کام کرو۔“ وہ بے دلی سے مسکرائی۔

”بولو؟“

”واپس جانے سے پہلے مجھے قتل کرو۔ یہ بہت بڑا احسان ہو گا تمہارا اس ابھانگن پر۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ آصف علی تڑپ کر رہ گیا۔

”پھر مجھے میرے حجرے میں رہنے دو۔“

”یہ منظور ہے۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے۔“

اور پھر شویتا کو خیمے کی قید سے رہا کر کے اس کے اپنے حجرے میں پہنچا دیا گیا۔ سلطان محمود غزنوی چار ماہ تک سومات میں ٹھہرا اور پھر واپس غزنی کوچ

آصف علی نے اسے تسلی دی تو شویتا کا دل پر سکون سا ہو گیا۔

☆-

واپس غزنی جاتے ہوئے سلطان محمود نے سندھ کا ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو غیر آباد تھا۔ سومات کے چار ٹکڑوں میں سے دو مکہ اور بغداد روانہ کر دیے گئے اور دو غزنی پہنچا دیے گئے تھے۔ محمود نے سومات کا ایک ٹکڑا جامع مسجد غزنی کی چوکھٹ میں اور دوسرا ایوان سلطنت کے صحن میں پیوست کر دیا تھا۔ تاکہ لوگ آتے جاتے انہیں اپنے پیروں تلے روند کر گزریں۔

غزنی پہنچ کر آصف علی کو شویتا کی خواہش پر اس کے لئے سانپوں کا انتظام کرنا پڑا۔ یہیں اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ شویتا کھانے میں سکھیا استعمال کرتی ہے۔ سکھیا ملا ہوا کھانا کھانے کے بعد شویتا خود کو سانپوں سے ڈسوانی اور پھر بے سود ہو کر کسی شرابی کی طرح بستر پر دراز ہو جاتی۔

ایک دن اسے سومات جی کے روبرو کیا ہوا عہد و میمان یاد آ گیا اور وہ آصف علی سے بولی:

”آصف علی کیا میں تمہیں ارجن لال جی کہہ کر مخاطب کر لیا کروں؟“

”جیسا تم چاہو۔“ وہ مسکرایا۔

”ایک وعدہ اور کرو۔“

”بولو؟“

”کہو کہ جب تک میں زندہ رہوں گی تم کسی اور عورت سے شادی نہیں کرو گے۔“

”منظور ہے“

آصف علی نے فوراً عہد کر لیا تو شویتا کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ اسے یوں مطمئن دیکھ کر آصف علی نے بات کو آگے بڑھایا:

”شویتا اب جب کہ میں تمہاری خواہش پوری کر چکا ہوں۔ کچھ میں بھی تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کا صحیح جواب دو گی؟“

شویتا نے نشی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ان میں

سرخ سرخ ڈورے نمایاں تھے اور آواز بھرائی ہوئی تھی: ”پوچھو! میں وعدہ کرتی ہوں جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”ہم دونوں ہی یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے وابستہ نہیں ہو سکتے۔ تم سے شادی نہیں کر سکتیں۔ پھر ان حالات میں اس عہد کیا ضرورت تھی؟“

شویتا کو اس سوال سے بہت دکھ پہنچا:

”ارجن لال جی کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں سومات سے یہاں کیوں لاتا۔“

”پھر تم نے ایسا دل آزار سوال کیوں کیا؟“

اس کی آنکھوں کی نمی گہری ہو گئی تھی۔ چنانچہ آصف علی نے شدت جذبات سے شویتا کو گلے لگا لیا۔

”میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔“

”معافی تو مجھے مانگنی چاہیے ارجن لال جی۔۔۔“

میں بہت خود غرض ہو گئی ہوں اپنی محبت میں۔۔۔ ویسے بھی محبت تو شاید ہوتی ہی خود غرض ہے صرف اپنا مفاد سوچتی ہے۔“

کمرے میں گہری خاموشی تھی جب کہ شویتا کی سسکیاں اس سکوت کو پارہ پارہ کر رہی تھیں۔

☆-

وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ کرب اور اذیت کے باوجود آصف علی اور شویتا ایک دوسرے کو اپنی ذات کا حصہ سمجھنے لگے تھے۔ یہ ایسے عجیب و غریب پریمی تھے جو ہر پل ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور رہنے پر مجبور تھے۔

لیکن پھر سوچوں میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ شویتا نے آصف علی سے جو عہد لیا تھا اب وہ اس پر شرمندہ رہنے لگی تھی۔ آصف علی اداس اداس اس کے پاس آتا۔

دلنشین باتیں کرتا اور سر جھکا کر واپس چلا جاتا۔ ان کی محبت میں احتیاط ہر لمحہ کارفرما رہتی تھی۔

لیکن شویتا کو اب یہ احساس شدت کے ساتھ ہونے لگا تھا کہ اس نے اپنی محبت کی خاطر آصف علی پر بہت ظلم کیا ہے۔

اسی دوران سلطان محمود غزنوی کے دربار کا عظیم سائنسدان اور عالم ابوریحان البیرونی اس عجیب و غریب زہریلی عورت سے ملنے آیا۔ البیرونی نے آصف علی پر یہ انکشاف کیا کہ ہندو قوم اپنے دشمنوں کیلئے جو حربے اور ہتھیار استعمال کرتی ہے یہ زہریلی عورتیں بھی انہیں میں شامل ہیں۔

اس نے بتایا کہ کسی ذہین ہندو نے یہ خطرناک طریقہ دریافت کیا تھا کہ اگر خوبصورت بچوں کو بچپن ہی سے نہایت محتاط طریقے سے سکھایا کا عادی بنا دیا جائے اور انہیں اتنا سکھایا کھلایا جائے جو زندگی کے لئے مہلک نہ ہو تو اس کی مقدار میں بتدریج اضافہ کر کے لڑکی کو جوان ہونے تک زہریلا بنایا جاسکتا ہے۔ اور پھر یہی سکھایا کھاتے کھاتے لڑکا اسے غذا کی طرح استعمال کرنے لگتی ہے۔ یہی نہیں پھر ان لڑکیوں کو سانپوں سے ڈسوا کر ان کے خون میں مزید زہر دوڑایا جاتا ہے۔

جب یہ حسین لڑکیاں پوری طرح زہریلی ہو جاتی ہیں تو انہیں اپنے دشمنوں کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ جو وہاں کے سرکردہ لوگوں کو ڈس کر ہلاک کر دیتی ہیں۔

آصف علی، ابوریحان البیرونی کی باتیں پوری محویت سے سن رہا تھا اور اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اسے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ شویتا کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ آصف علی سب کچھ جان چکا ہے۔ ایک شام جب وہ شویتا سے ملنے پہنچا تو وہ کچھ زیادہ ہی اداس تھی۔

وہ دیر تک بنا کچھ بولے آصف علی کو دیکھتی رہی اور پھر پوچھنے لگی:

”ارجن لال جی! اب ہندوستان کب جانا ہوگا؟“

”جب بھی بادشاہ کا حکم ہوگا۔“ اس نے مختصر

جواب دیا۔

”تو تم جاؤ گے ضرور؟“

”ہاں شاید ضرور؟“

”تم وہاں مت جانا۔۔۔ کیوں کہ وہاں میرے ہی جیسی اور عورتیں موجود ہیں۔ یاد رہے ہر شویتا میری طرح تم سے محبت نہیں کرے گی۔ ان میں سے کوئی بھی تمہیں ڈس کر ہلاک کر دے گی۔“

پھر وہ خاموش رہ کر جواب کی منتظر رہی لیکن جب آصف علی نے کوئی جواب نہ دیا تو دوبارہ بولی:

”ارجن لال جی! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”کیا تم بھول گئیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں شادی نہیں کر سکتے۔“ آصف علی نے نظریں اٹھائیں۔

”ہاں یاد ہے۔۔۔ مگر اب میں ہی اس عہد کو توڑنے کی اجازت دیتی ہوں۔۔۔ مجھے تم سے ایسی قسم نہیں لینا چاہیے تھی۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے۔“

آصف علی نے اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دامن سے پونچھ لیا اور بولا:

”لیکن میں اپنے اس عہد پر شرمندہ نہیں ہوں شویتا۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہ کر کے بھی خوش ہوں کیوں کہ میری محبوبہ میرے پاس ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو ارجن لال جی۔۔۔ تم سچ نہیں بول رہے۔۔۔ تم بہت کرب میں ہو۔“ شویتا کے لبوں پر کر بناک مسکراہٹ تھی۔

”میں تمہیں اس بات کا یقین کیسے دلاؤں شویتا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”بھگوان نے چاہا تو میں تمہیں تمہارے عہد سے نجات دلا دوں گی۔“

شویتا کی آنکھیں بند تھیں اور سر آصف علی کے سینے پر تھا۔ شاید اس وقت وہ سومنات میں تھی۔ اپنے ماضی میں۔۔۔ جہاں بے پناہ چہل پہل تھی، جہاں اس کے

صبح موذن نے اذان فجر کی تو آصف علی بستر سے اٹھ بیٹھا اور فجر کی نماز کے لئے جامع مسجد روانہ ہو گیا۔ مسجد کے دروازے پر نمازیوں کا ہجوم تھا۔ لوگ مشعلیں تھامے روشنی میں کچھ دیکھ رہے تھے۔

آصف علی بھی ہجوم کو چیرتا ہوا وہیں پہنچ گیا۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر مسجد کی چوکھٹ پر پڑی اس کا دھڑکتا دل جیسے رک سا گیا تھا۔۔۔ سامنے شویتا کی سردی سے اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اس نے عمر بھر کے کرب سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنا پیٹ خنجر سے خود ہی چاک کر لیا تھا۔ قریب ہی سومات جی کا وہ ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا جسے سلطان محمود غزنوی نے نمازیوں کے قدموں تلے روندنے کے لئے دروازے کے فرش میں جڑوا دیا تھا۔۔۔ شویتا کے چاک پیٹ سے بہنے والا خون سیاہ لکھڑے کی شکل میں سومات جی کے ٹکڑے پر جما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

آصف علی کی آنکھوں کے سامنے کا منظر دھندلا کر رہ گیا تھا۔ اسی لمحے ہجوم میں سے کسی شخص کی دھیمی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:

”سومات کی دیو داسی تھی یہ بد بخت عورت۔ افسوس کہ مرتے دم تک شرک سے باز نہ آسکی۔۔۔ یقیناً اس پر ہدایت کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اسی لئے آخری سانس تک کافرہ رہی اور پھر حالت کفر میں واصل جہنم ہو گئی۔۔۔“

-☆-☆-☆-

## کہانی کے تاریخی پس منظر۔۔۔

تاریخ فرشتہ  
محمد قاسم فرشتہ  
مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا ایس ایم ناز  
سلطان محمود غزنوی مولوی محمد حبیب  
آئینہ حقیقت نما اکبر شاہ خان  
کتاب الہند البیرونی

عقیدے کو عظمت حاصل تھی، ایک شان تھی۔۔۔ اور اپنے ماضی سے ایک شکوہ تھا۔ سومات جی کا عظیم الشان وجود محمود غزنوی کے ہاتھوں توڑا جانا اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

کافی دیر بعد شویتا نے خواب وہ خیال سے آنکھیں کھولیں اور آصف علی سے مخاطب ہوئی:

”ارجن لال جی تمہیں وہ دن یاد ہیں ناں جب رتن سین اور تم مجھے ناسٹک سمجھنے لگے تھے۔“

”ہاں یاد ہے۔ لیکن اب اس ذکر سے فائدہ۔“

”فائدہ تو کوئی نہیں۔ پھر بھی سومات جی کی تباہ

کاری اور اپنے شاندار ماضی کے شمشان پر نظر دوڑانی ہوں تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے اور مجھے اپنے آپ پر بہت افسوس ہوتا ہے کہ آخر میں ناسٹک کیوں ہو چلی تھی۔۔۔ ارجن لال جی! اب غزنی میں پہنچ کر میں شدت سے محسوس کرتی ہوں کہ میں ہندو تھی۔۔۔

ہندو ہوں۔۔۔ اور ہندو رہوں گی۔ یہ تو میرا جنم جنم کا دھرم ہے۔۔۔ پر یہ بھی افسوس ہے کہ اس دھرم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لینے کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لیکن پھر بھی میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔۔۔ کاش میرا ماضی مجھے واپس مل سکتا ارجن لال جی۔۔۔ مگر یہ بھی سوچتی ہوں کہ تم مسلمان ہو۔ تم سے محبت، ہندو دھرم سے محبت کتنی متضاد محبتیں یکجا ہو گئی ہیں میری زندگی میں۔“

آصف علی نے محسوس کیا تھا کہ شویتا آج کچھ زیادہ ہی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ وہ کچھ دیر مزید اس کے پاس بیٹھا رہا اور پھر اُلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس روز وہ شویتا کے بارے میں اتنا پریشان تھا کہ رات بھر سو بھی نہیں سکا تھا۔ اسے رہ رہ کر شویتا کی باتیں یاد آتی رہیں اور اس کی بے بسی آصف علی کو خون کے آنسو رلائی رہی۔

اس رات آصف علی کو اس پہلے ہندو پر بھی شدید غصہ آیا جس نے لڑکیوں کو زہریلا بنانے کا تجربہ کیا تھا۔ وہ رات بڑی سرد تھی اور برف باری ہو رہی تھی۔ جب

## جنون

بشریٰ مسرور

محبت اگر جنون کا رنگ اختیار کر لے تو عشق  
کی معراج بن جاتی ہے۔ جنون اگر نفرت کا سوا گ  
بھر لے تو ساحل سے لگے سفینوں کو ڈبو دیتا ہے اور اگر  
کوئی غلط خواہش جنون کے روپ میں ڈھلنے لگے تو  
خیر و شر کے بیچ کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔۔

چند ایسے لوگوں کی کہانی جو دوسروں کو اپنا اسیر دیکھنے کے جنون میں مبتلا رہتے ہیں  
اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔





## گزشتہ سے پیوستہ

ماسٹر غلام حسین کے تین بچے ہیں۔ طلال، تابینہ اور بلال۔ طلال تو اپنی پڑھائی مکمل کر کے شہر میں نوکری کی تلاش میں ہے، تابینہ فرسٹ ایئر کی طالبہ جبکہ بلال میٹرک کا طالب علم ہے۔ جبکہ ماسٹر جی کی بیگم انتقال کر چکی ہیں۔ ماسٹر غلام حسین کا چھوٹا بھائی خادم حسین ہے۔ جس کی بیوی بڑی لڑاکا اور فسادی عورت ہے اور اسی کی وجہ سے دونوں بھائی آپس میں نہیں ملتے۔

خادم حسین کی دو بیٹیاں شہناز اور گلناز ہیں۔ جو تعلیم مکمل کر کے اچھے رشتوں کی منتظر ہیں۔ ماسٹر غلام حسین ایک سخت گیر باپ ہیں اور بطور خاص تعلیمی میدان میں بچوں کو سب سے آگے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی نیتوں سے گھبرا کر ان کا سب سے چھوٹا بیٹا بلال گھر سے بھاگ جاتا ہے اور سمجھڑوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہتے ہیں۔

بلال کے گم ہو جانے کا ماسٹر غلام حسین کو اتنا صدمہ ہوتا ہے کہ وہ بستر سے لگ جاتے ہیں۔ طلال کو بلا خر خفیہ محکمے میں نوکری مل جاتی ہے اور وہ گھر والوں سے ملنے گاؤں آتا ہے۔ تابینہ کسی نظیر عرف ظفری نام کے لڑکے سے محبت کرتی ہے اور اس کے بے حد اصرار پر اسے ملنے کے لئے چلی جاتی ہے اور اس سے شادی کی درخواست کرتی ہے مگر وہ لڑکا اسے ٹال جاتا ہے جس پر تابینہ کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔

بلال کے کھو جانے کا صدمہ ماسٹر غلام حسین کو کومے میں لے جاتا ہے اور وہ اسی حالت میں انتقال کر جاتے ہیں۔ ماسٹر جی کے انتقال پر خادم حسین بھی دوڑے چلے آتے ہیں اور بیٹیوں کے سمجھانے پر ان کی تقلید میں ان کی بیگم بھی دوڑی چلی آتی ہیں اور لائق فائق ہونہار سے طلال کو دیکھ کر ان کی رال ٹکینے لگتی ہے اور وہ دل ہی دل میں اسے بطور داماد منتخب کر لیتی ہیں اور اسی وجہ سے اپنا رویہ تبدیل کرتے ہوئے انتہائی شفیق اور محبت کرنے والی چچی کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اور جینٹھ کے انتقال کے بعد بظاہر تابینہ کی تنہائی کے خیال سے اسے اپنے گھر لے جانے کا ارادہ ظاہر کرتی ہیں مگر درحقیقت وہ تابینہ کے بہانے طلال کو شہناز کے لئے قابو کرنا چاہتی ہیں مگر طلال اب اتنا نا سمجھ نہیں کہ وہ ان کے عزائم سمجھ نہ سکتا۔ سو وہ تابینہ کو چچا خادم حسین کے گھر بھیجنے سے منع کر دیتا ہے۔ جس پر چچا چچی بددل ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر چچی اب بھی مایوس نہیں ہوتیں۔ ان کا باپ جادو ٹونے کا ماہر ہے اور وہ کالے جادو کے ذریعے طلال کو شہناز کی طرف راغب کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ماں کی زبانی طلال کی تعریفیں سن سن کر شہناز بھی طلال کو اپنے من مندر میں بسا لیتی ہے۔

باپ کے انتقال کے بعد طلال اپنا آبائی گھر اور زمینیں فروخت کر کے تابینہ کو اپنے ہمراہ شہر لے آتا ہے اور اسے اپنی سنگی خالہ منی کے حوالے کر کے خود اپنی ملازمت پر حاضر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ محکمے کی طرف سے اسے چھٹی ختم ہونے کا نوٹس ملا ہے جس کی وجہ ملک میں ایمر جنسی کی کیفیت ہے۔ ملک دشمن عناصر اپنی کارروائیوں میں مصروف ہیں اور چاروں صوبے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہیں۔ دشمن محبت وطن بن کر وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں اور انہیں بیرونی امداد اور پشت پناہی حاصل ہے۔ پاکستان میں بھائی بھائی نامی تنظیم مذموم کارروائیوں میں مصروف ہے۔ وہ خود ہی آگ لگا کر بجھانے پہنچ جاتے ہیں اور اپنے ہر سیاہ کارنامے کا الزام حکومت پاکستان پر عائد کرتے ہوئے اسے نا اہل ثابت کرتے ہیں۔ مگر در پردہ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کو دنیا بھر میں ناکام ریاست کے طور پر ابھارا جائے اور یہاں ایلوسی راج قائم ہو۔ اعلیٰ صاحب اس تنظیم کے سربراہ ہیں۔ جسے ”را“ کی در پردہ مدد حاصل ہے۔ بظاہر اعلیٰ صاحب ایک پیر کامل ہیں۔ جن کے آستانے پر حاضری دینے کو ”اعلیٰ عہدیداران“ اپنے



لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں اور ان کے دولت کدہ پر چوبیس گھنٹے لنگر جاری رہتا ہے اور پورے ملک سے لوگ جوق در جوق آستانے پر اپنی دلی مرادیں حاصل کرنے حاضر ہوتے ہیں۔

طلال کے ہاتھ کچھ ایسے شاہد لگتے ہیں کہ وہ اعلیٰ صاحب کے چند خفیہ منصوبے نا صرف ناکام بنا دیتا ہے بلکہ ان کے چند اہم ”نہرے“ بھی گرفتار کر کے تشفی شروع کرتا ہے تو کئی قیمتی راز اس کے ہاتھ لگتے ہیں اور وہ بھیڑوں کے روپ میں بھیڑیوں کو بے نقاب کرنے کی مہم سنبھال لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ”اعلیٰ صاحب“ کے کانوں میں بار بار طلال کا نام پڑتا ہے تو وہ اپنے کارندوں کو طلال کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

منی خالہ بے حد محبت کرنے والی ہستی ثابت ہوتی ہیں اور ان کی اکلونی بیٹی قرأت کے ہمراہ تائینہ کی فوراً دوستی ہو جاتی ہے۔ منی خالہ کے شوہر یعنی تائینہ کے خالو فاج کے مریض ہیں اور ان کے کروڑوں اربوں کا بزنس سنبھالنے ان کا ایم بی اے بھتیجا زعیم ظفر آتا ہے۔ خالہ وغیرہ کا ارادہ زعیم کے ساتھ قرأت کو منسوب کر کے اسے گھر داماد رکھنے کا ہے۔ اور جب زعیم ظفر آتا ہے تو تائینہ یہ جان کر بے حد کھی ہے کہ یہ اس کی کھوئی ہوئی محبت ظفری ہی ہے۔ ظفری بھی اسے یہاں دیکھ کر ٹھٹھک سا جاتا ہے۔ مگر دونوں ایک دوسرے کو انجان سمجھ کر نظر انداز کر دینے کی پالیسی پر گامزن رہتے ہیں۔ قرأت اور زعیم کے نکاح کی تاریخ ٹھہر جاتی ہے۔ اور شاپنگ شروع ہو جاتی ہے تائینہ بظاہر ہنسی خوشی اپنی خالہ زاد بہن کی خوشیوں میں آگے آگے ہے اور شادی کے کاموں میں ہنستے مسکراتے مدد دیتی ہے اور دل کی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ مگر اندر ہی اندر خود سے لڑتے تھک جاتی ہے اور اسے بخار ہو جاتا ہے تو وہ زیورات کی شاپنگ کے سلسلے میں قرأت کے ساتھ بازار نہیں جاپاتی اور خالہ کو اپنی جگہ قرأت کے ساتھ بھیج دیتی ہے۔ جب وہ دوا کھا کے اپنے کمرے میں سو رہی ہوتی ہے تو ظفری دبے قدموں کمرے میں آ جاتا ہے اور تائینہ کو پرانی محبت کا حوالہ دے کر اس سے اظہار الفت کرتا ہے اور اسی لمحے قرأت کمرے میں داخل ہوتی ہے تو دونوں کو ایک دوسرے کے بے حد قریب دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا ہے کہ اس نے ان دونوں کی آپس کی تمام گفتگو سن لی ہے۔

ہیجڑوں کے گروہ کے چنگل سے آزاد ہونے کا موقع ملتے ہی بلال وہاں سے فرار ہوتا ہے تو ہیجڑوں سے چھپتا چھپاتا ایک نیک دل آدمی سے جا ملتا ہے جو اسے کرایہ دے کر اپنے سامنے اس کے گاؤں جانے والی بس میں سوار کرا دیتا ہے۔ تاکہ بلال بحفاظت اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائے.....

اب آپ آگے پڑھیے!

☆☆☆

شدید گرمی سے تائینہ کا برا حال تھا۔

کمرے میں دو، دو ایسے چلنے کے باوجود بھاری بھر کم کا مدار لہنگے سوٹ کے ہمراہ شوخ میک اپ اور ہیوی جیولری نے اس کا حشر نشر کر دیا تھا۔

اوپر سے چاروں طرف کزنز کا گھیراؤ، مودی کیسرے کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز روشنی اور معمول سے زیادہ چلنے والی لائٹوں نے گرمی کی حدت کو بڑھا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔

نئے سے گونگھٹ کی آڑ میں اس کے چہرے سے پھسلتی پسینے کی دھاریں دودھیا میک اپ کی دیز تھوں میں دراڑیں ڈالتی، گردن سے ہوتی ہوئی گریبان میں جذب ہو رہی تھیں۔

اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

دودھ پلائی

کھیر چنائی  
آر سی مصحف  
گود بھرائی.....

اور ناجانے کون کون سی شادی بیاہ کی مخصوص رسموں کے بعد بالآخر دلہن کو حجلہ عروسی میں جانے کی نوید سنائی گئی تھی۔

کزنز سے چھٹکارا پانے کے بعد ظفری تو مقامی مہمانوں کو رخصت کرنے ان کے ساتھ گیٹ تک چلا گیا تھا۔ بد  
تائینہ اپنی نندوں کی ہمراہی میں سچ سج قدم اٹھاتی اپرپورشن میں بطور خاص دلہا دلہن کے لئے سجائے گئے کمرے۔ بی  
جانب چل دی تھی۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی ایئر کنڈیشن کی خوشگوار ٹھنڈک اور ایئر فریشنز کی مسور کن خوشبو نے اس کے اندر تازگی  
سی بھردی تھی۔

اگرچہ کمرے میں باقاعدہ بیج نہیں بنائی گئی تھی۔ مگر بیڈ پر ہلکے گلابی رنگ کی چادر پر بڑے بڑے سرخ گلابوں  
کی نسبت سے کمرے کی دیواروں پر بھی جا بجا تازہ گلاب لگائے گئے تھے۔ جن کی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔  
کمرے میں لگے ہلکے گلابی نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی میں ماحول کافی خوابناک سا ہو رہا تھا۔ مگر اس کی نند  
نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کے ساتھ نصب سوچ بورڈ پر لگے ایک مٹن کو آن کیا تو سارا کمر اٹیوب لائٹ کی دودھیا  
روشنی سے نہا گیا۔

”لیجئے بھائی! یہ رہا آپ کا کمرہ.....!“ اس کی نند اسے سہارا دے کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

”کیسے پسند آیا؟“ وہ تائینہ کو ادھر ادھر دیکھتے پا کر مسکرا دی تھی۔

”ہوں.....!“ تائینہ نے شرما کر سر جھکا لیا تو اس کی نند کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ہمارا ارادہ تو باقاعدہ بیج بنوانے کا تھا مگر زعیم بھائی نے منع کر دیا کہ اس گری میں بھاری بھر کم بیج اے سی کی  
کوننگ اور پٹیکے کی ہوا کو بیڈ تک نہیں آنے دے گی تو خواہ مخواہ دل گھبرائے گا۔ البتہ دیواروں پر گلاب سجانے کا  
آئیڈیا بھائی کا ہی تھا۔ اور دیکھئے کمر اکتنا شاندار لگ رہا ہے۔“

اس کی نند اس کا دوپٹہ سیٹ کرتے ہوئے مسلسل بولے جا رہی تھی۔

جبکہ تائینہ بیڈ کے عین سامنے رکھی گئی سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر پریشان سی ہو اٹھی تھی۔

اس کے رونے دھونے اور گرمی کی کرم فرمائی سے اس کے چہرے کا میک اپ خاصا گبڑ کے رہ گیا تھا۔

اچھا بھلا گلابی چہرہ جانی جانی سا ہو رہا تھا۔

آنکھوں کا کاجل خاصا پھیل چکا تھا اور آئی شیڈز کا رنگ خاصا گہرا لگ رہا تھا۔

ایک طرف کے گال کا بلش آن غائب تھا اور دوسری جانب پتک رنگ کافی ڈارک سا لگ رہا تھا۔

ناک کی نتھ بار بار ہونٹوں سے بچھ ہونے کی وجہ سے لپ اسٹک ذرا سی پھیلی ہوئی لگ رہی تھی۔

اور جب وہ نیچے سب کے ہمراہ بیٹھی تصاویر بنوا رہی تھی تو شاید کسی نے ہمدردی میں آ کر اس کی پیشانی پر آیا  
پسینہ، نشو کے ساتھ اتنی بے دردی سے پونچھا تھا کہ اس کے ماتھے کا سارا میک اپ ہی اتر گیا تھا اور اب اس کی  
پیشانی کا رنگ باقی سارے چہرے سے الگ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

بالوں کا جوڑا ذرا سا ڈھیلا پڑنے کی وجہ سے ماتھے کی بندیاں قدرے آگے کو جھول آئی تھی۔

اور تو اور اس کی ایک آنکھ کی مصنوعی آئی لیش ایک جانب سے ذرا سی اکھڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

بس یہی فرق ہے گھر میں دلہن بننے اور بیوٹی پارلر سے تیار ہونے میں۔ بیوٹی پارلر والیاں ہر کام بڑی نفاست اور پکا کرتی ہیں۔ تابینہ نے سوچا۔

اگرچہ خالہ نے تو ایک مشہور بیوٹی پارلر سے تابینہ کے لئے ٹائم بھی لے رکھا تھا۔ مگر اس کی ایک کزن جو کہ بیوٹیشن ہونے کی عویدار بھی تھی، نے یہ کہہ کر تابینہ کو پارلر جانے سے منع کر دیا تھا کہ وہ تابینہ کو خود گھر پر تیار کرے گی اور اتنا اچھا دلہن بنائے گی کہ دیکھنے والے اپنی پللیں تک جھپکنا بھول جائیں گے۔

اگرچہ اس نے تابینہ کا میک اپ بے حد زبردست کیا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ میک اپ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ بالوں کے جوڑے کی پٹنیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور آئی لیش کا گم (گوند) اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا۔

اگر وہ کزن اس وقت یہاں ہوتی تو بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر وہ تو کھانا کھاتے کے ساتھ ہی اپنے گھر والوں کے ساتھ واپس چلی گئی تھی۔ کیوں کہ ایک تو دیے بھی ان دنوں حالات کچھ خراب تھے اور ان کا گھر دیے بھی ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں آئے دن مخالف پارٹیوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

تو..... اب میں کیا کروں!! تابینہ نے بے تابی سے سوچا۔

اف..... میرے خدا..... کیا ظفیری مجھے اسی حلیے میں دیکھے گا آ کر.....؟؟

وہ ایک بار پھر آئینے میں اپنی ہیبت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

کاش عمران کو کچھ خیال آ جائے تو وہ میرا میک اپ ہی فریش کر دیں مگر..... اب یہ بات میں ان سے خود تو نہیں کہہ سکتی ناں کہ بھی مجھے دوبارہ سے ذرا ٹھیک طرح تیار کر دو تا کہ جب میرا دولہا آ کر ٹھونگٹ اٹھائے تو میرے صحن کی تاب نہ لا کر مبہوت رہ جائے۔

اگرچہ وہ ظفیری کو اپنی سادگی و معصومیت کی بناء پر پہلے ہی مسخر کر چکی تھی مگر آج اپنے صحن کے زور پر اسے تسخیر کرنا چاہتی تھی۔

اس نے توجہ طلب نظروں سے اپنی نند کی طرف دیکھا۔

مگر وہ اس سے بے نیاز الماری کے پٹ کھولے اسے بتا رہی تھی۔

دیکھو یہاں بیگمگز میں تمہارے اور زعیم کے لئے میں نے رات کو پہننے والے کپڑے لٹکا دیئے ہیں۔

اس طرف تمہاری نائشی لٹکی ہوئی ہے اگر یہ پہننا چاہو تو.....! البتہ صبح سویرے نہادھو کر تم یہ گوٹے کے کام والا لیمن کلر کا شلوار سوٹ پہن لینا اور زعیم کو یہ کریم کلر والا شلوار سوٹ پہننے کے لئے نکال دینا۔

میں ٹھیک صبح سات بجے تمہارے کمرے میں آ جاؤں گی۔ اس سے پہلے ہی دونوں نہادھو کے تیار ہو جانا۔

وہ اپنی دھن میں مگن اسے احکامات صادر کئے جا رہی تھیں اور تابینہ بڑی بے رغبتی سے سن رہی تھی۔

بھی دروازے پر ہلکی سی ٹک ٹک کی آواز ابھری تو بے اختیار تابینہ کا دل اچھل کر طعن میں آ گیا۔

”یقیناً یہ دستک ظفیری نے دی ہوگی۔“ اس نے بے ساختہ اپنا ٹھونگٹ آگے بٹھانچ لیا اور سمت کر بڑی ادا سے

مگر یہ اس کی دوسری نند تھی سلطانہ..... جو ہاتھ میں اس کا بیوٹی بکس لئے اندر داخل ہوئی تھی۔

”باجی..... امی کہہ رہی ہیں کہ جلدی دلہن کے کمرے سے نکلو..... زعیم بھائی باہر انتظار میں سوکھ رہے ہیں۔“

ماہنامہ ”ریٹیم“ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نسل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کیلئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

اس نے اندر داخل ہوتے ہی بڑی بہن کو ماں کا نادر شاہی حکم سنایا۔  
ابھی آتی ہوں.....

میں کون سا یہاں کھیل رہی ہوں..... دلہن کا سامان ذرا ٹھکانے سے رکھ لوں تو آ جاؤں گی.....! اس کی نند نے  
اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے..... مجھ پر کیوں گرم ہو رہی ہو..... مجھے تو جو امی نے کہا تھا میں نے تمہیں بتا دیا۔“ چھوٹی نند  
نے اس سے بھی زیادہ تنک کر جواب دیا تو بڑی نند منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔

ابھی تاہینہ ان دونوں کے اس آپس کے عجیب و غریب رویے پر غور ہی کر رہی تھی کہ اس کی چھوٹی نند اس کے  
بیوٹی بکس کو مانی کی صندوقچی کی طرح کھڑکھڑاتے ہوئے اس کے بیڈ کی طرف بڑھ آئی۔

”ٹھیک طرح نیکی سے ٹیک لگا کر بیٹھو بھابی۔ اس طرح تو تمہاری کمر اکڑ جائے گی۔“ اس نے خواہ مخواہ تاہینہ  
کی پشت کے پیچھے لگا لگاؤ نیکی ہلا جلا کر دیکھا۔

اور پھر اس کے نزدیک کھڑی ہو کر تنقیدی نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔  
”اوہو..... سارا میک اپ خراب ہو گیا تمہارا۔ اس حالت میں اگر بھابی جان دیکھ لیں تو ڈر ہی جائیں گے  
بیچارے۔“ اس نے عجیب سی ہنسی ہنس کر کہا تو تاہینہ دل میں شرمندہ سی ہو گئی۔

”تمہارے دل میں ڈرنا تمہارا حلیہ سنوار دوں۔ رور و کرتم نے تو بھابی اپنا حشر نشر کر لیا ہے۔“  
یہ کہہ کر اس نے بیوٹی بکس کھولا اور چاب دستی سے تاہینہ کا میک اپ درست کرنے لگی۔

چل اب آ بھی جا..... نیچے چلیں..... رات زیادہ ہو چکی ہے۔ بھابی کو بھی نیند آرہی ہوگی۔ اس کی بڑی نند نے  
تپائی پر رکھے دودھ کے جگ پر پلاسٹک کی پلیٹ ڈھانپتے ہوئے جمائی لے کر کہا تو چھوٹی نند ہنس پڑی۔

”بھابی کو نہیں..... نیند تو دراصل تمہیں آرہی ہے۔ خیر چلو نیچے چلیں۔“ اس نے بھابی کے میک اپ کو فائل ٹیچر  
دیتے ہوئے کہا۔

”میری اس بہن کو میک اپ کرنے کا بڑا ہی شوق ہے..... جب دیکھو ہاتھ میں سرخی پاؤ ڈر لئے کسی نہ کسی کی  
درگت بنا رہی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری مانی کو بھی نہیں بخشتی۔ انہیں بھی بٹھا کے ملکہ قلو پٹھرہ بنا کے دم لیتی  
ہے۔ مانی بے چاری پو پلے منہ سے ہنستی رہتی ہے۔ اور اس کے ہاتھوں جو کر بن جاتی ہے۔“

بڑی بہن نے ہنستے ہوئے چھوٹی کے راز افشا کئے تو چھوٹی بہن کی تیوری پر بل پڑ گئے۔  
”تو بھلا بھابی تم خود ہی دیکھ لو کہ میں کیسا میک اپ کرتی ہوں۔“ اس نے بری سی شکل بنا کر کہا تو تاہینہ نے  
نوراً شیشے پر نظر ڈالی۔

سچ سچ اسے اس وقت اپنا آپ کافی بہتر لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی ممنون ہو گئی۔  
”تھینک یو.....!“ اس نے نظریں اٹھا کر بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی چھوٹی نند کھل اٹھی.....

”اب تم ہی کہو میں کسی کو جو کر بناتی ہوں کہ اپسرا؟“  
اس نے ہنستے ہوئے بھابی کا فیور چاہا مگر تاہینہ صرف زیر لب مسکرا کے رہ گئی تھی۔

”چلو جی نیچے چلیں۔ امی خت ناراض ہو رہی ہوں گی کہ جو بھی جاتا ہے دلہن کے کمرے میں ہی رہ جاتا ہے۔“  
اس کی چھوٹی نند نے بیوٹی بکس کی چیزیں سمیٹ کر واپس بند کیں اور بیوٹی بکس سنگھار میز پر لے جا کر رکھ دیا۔

”اب تو دیر ہو رہی ہے..... مگر میں صبح کو ضرور آپ کے بیوٹی بکس کا سارا سامان نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر بچا  
دوں گی۔“ اس نے خوش دلی سے آفر کی اور بڑی بہن کے تقریباً کھینچنے پر تاہینہ کو گلد نائٹ کہتی ہوئی بوسہ اس کی

جانب اچھال کر باہر نکل گئی۔

ان کے باہر جانے پر تابینہ نے اپنی جگہ سکھ کا سانس لیا اور اپنا لہنگا خوب پھیلا کر بڑے سائل سے بیٹھ گئی..... مگھو گھٹ کانی نیچے تک سر کا لیا۔ وہیں کے اس طرح بیٹھنے کا یہ انداز اس نے ایک فلم میں دیکھا تھا اور اسے بڑا پسند آیا تھا۔ تب سے اس نے سوچا تھا کہ جب اس کی شادی ہوگی تو وہ اسی انداز میں بیٹھ کر پہلی رات اپنے دولہا کا انتظار کرے گی۔

دفعتاً کمرے کے باہر دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تو تابینہ جیسے اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔

اب.....

اب.....

اب.....

وہ بڑی شدت سے دروازہ کھلنے اور ظفیری کے اندر داخل ہونے کی منتظر تھی۔ مگر ظفیری تو جیسے اندر آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

پھر اسے ایسے لگا کہ جیسے دروازے کے باہر دو افراد آپس میں گتھم گتھا ہوں۔

”یہ باہر کیا ہو رہا ہے بھلا.....!!“ تابینہ نے حیرت سے سوچا۔

ابھی وہ باہر کی صورتحال پر غور کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں نیچے والے پورشن سے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ایسا لگتا تھا کہ جیسے نیچے والوں پر یکایک کوئی افتاد ٹوٹ پڑی ہو۔

اچانک تابینہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑی۔

نچلے پورشن سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہاں جیسے اک کہرام سا مچ گیا تھا۔

چیننے چلانے اور رونے دھونے کی آوازیں اور پرتک آ رہی تھیں۔

تڑ..... تڑ..... تڑ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اس کے بعد نیچے مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

”یہ..... یہ..... سب کیا تھا؟“

تابینہ دل میں لرز کر رہ گئی۔

کہیں خدا خواستہ گھر میں ڈاکہ تو نہیں پڑ گیا.....! اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔ نہیں نہیں خدا نہ کرے کہ ایسا

ہو..... یہ بھی تو ممکن ہے کہ ظفیری کے بہن بھائیوں نے نیچے بلند آواز میں ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کوئی مووی چلائی ہو۔ تابینہ نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔

مووی کی آواز تو مسلسل آئی چاہیے پھر یہ اچانک ہی اتنی عجیب و مبہمانک خاموشی کیسے چھا گئی بھلا؟ تابینہ کا دل بے حد گھبرانے لگا تھا۔

ظفیری بھی تو اندر نہیں آ کے دے رہا تھا کہ اسی سے کچھ پتہ چل سکتا۔ اس وقت سچ سچ اسے رونا آرہا تھا۔

پھر اس کے بیڈروم کے دروازے پر ایک زوردار دھکا پڑا اور تابینہ کے منہ سے بے اختیار اک چیخ ابھری تھی۔

دھڑاک کی آواز کے ساتھ ہی ظفیری اندر آ کے پڑا تھا لیکن اس حالت میں کہ اس کی شیر وانی کا گریبان پھنا ہوا، بال بکھرے ہوئے اور باجھوں سے خون بہہ رہا تھا۔

ظفیری کے عین پیچھے دو چھریں بدن کے لڑکے پھرتی سے اندر داخل ہوئے۔

ایک نے ظفیری کو گن پوائنٹ پر لیا اور دوسرے نے اپنے پستل کا رخ تائبینہ کی جانب موڑ دیا تھا۔ اور پھر جیسے ہی اس کی نظر دلہن بنی تائبینہ پر پڑی تو وہ اوسر ہی کھینچا چلا آیا۔  
اس کے لبوں پر خبیث مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔  
”آہ..... عروس من!“ اس نے قریب آ کر تائبینہ کے گال پر چٹکی بھری اور اس کی بے ساختہ ”سی“ کے جواب میں شیطانی انداز میں قہقہہ لگا کے ہنسا۔

اوائے..... ابھی سے لڑکی وڈکی کے چکر میں مت پڑنا۔ ورنہ باقی کے سارے کام دھرے رہ جائیں گے۔ دوسرے ساتھی نے اپنے پہلے ساتھی کو تنبیہ کی تو وہ تائبینہ سے ذرا دور ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ مگر نظریں اسی پر جمی تھیں۔ تائبینہ کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا اندازہ درست تھا اور ان کے گھر واقعی میں ڈاکہ پڑا ہے اور یہ دونوں لڑکے بھی دراصل ڈاکو تھے۔ جو اوپر والے حصے میں لوٹ مار کی غرض سے آئے تھے۔ اب تائبینہ کو نیچے سے آنے والی چیخ و پکار کی آوازیں کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ مگر وہ فائرنگ کی آواز کی وجہ سے پریشان تھی۔ اللہ کرے نیچے سب خیریت ہو۔ اس نے صدق دل سے دعا مانگی تھی اور اب وہ پوری طرح ظفیری کی جانب متوجہ تھی جو ڈاکو کے گن پوائنٹ پر تھا۔

تائبینہ کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ ظفیری کو ان ڈاکوؤں کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوئی ترکیب سوچ رہی تھی کہ ظفیری کے ان الفاظ نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔  
دیکھیں پلیز اٹھل بھائی..... آپ اپنے ساتھیوں کو منع کریں کہ وہ نیچے میری بہنوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کریں اس کے بدلے میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اپنی یہ سچی سچائی اور ان چھوٹی دلہن پیش کرتا ہوں.....!“  
ظفیری اس حد تک بھی گر سکتا ہے..... تائبینہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے ارد گرد جیسے تیز جھکڑ سے چلنے لگے۔

اور..... وہ اس ڈاکو کو بھلا اٹھل بھائی کیوں کہہ رہا ہے..... کیا وہ اسے جانتا ہے!! تائبینہ الجھ سی گئی۔  
”آپ لوگ بے شک اس گھر کا سارا مال و اسباب لے لیں۔ میری دلہن کا سارا زیور اتار لیں اور پھر چاہیں تو رات بھر میرے مہمان بن کر اس نئی نوبلی عروس کے ساتھ خوب عیاشی کریں۔ مگر اس تعاون اور ایثار کے بدلے میری جوان بہنوں کی عزت.....!“

ظفیری کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی پشت پر ایک زوردار لات پڑی تھی۔  
چپ کر سالے..... ہمیں یہاں داد عیش لینے کے لئے تیرے تعاون کی ضرورت ہے اور نہ تیری اجازت کی۔ جو ہمارا دل چاہے گا ہم وہی کریں گے۔ اور اب اگر تو نے اپنی چونچ بند نہ کی تو تیری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا ہاں۔“

اٹھل بھائی کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا تھا۔ اور چہرے پر یکدم سفاکی چھا گئی تھی۔  
ظفیری کا رنگ اچانک ہی پیلا پڑ گیا تھا۔  
مگر وہ لگا تار ان کی منتوں خوشامدوں میں مصروف تھا۔

”دیکھو یار اٹھل بھائی! مجھ سے ایسا سلوک تو مت کرو ناں یار۔“  
آخر میں بھی تو آپ لوگوں کی پارٹی کا ہی بندہ ہوں..... ڈیکیتی کے لئے اس گھر کا پتہ میں نے ہی تو کچھ دن پہلے آپ لوگوں کو دیا تھا کہ یہاں سے بڑا مال ملے گا..... اس بات کا صلہ اس طرح تو نہ دو۔“  
”ظفیری اور ابھی کچھ کہہ رہا تھا مگر تائبینہ کا ذہن تو اس کے اس جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا کہ ”ڈیکیتی کی واردات

## فقار میں متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کیلئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرستی سے محفوظ رکھیں۔

کے لئے آپ لوگوں کو اس گھر کا پتہ میں نے ہی تو دیا تھا۔“

کس قدر نمک حرام تھا ظفری۔ خالہ کی محبتوں اور خالو کے احسانات کا بدلہ کس انداز میں اتار رہا تھا وہ.....! اس کے ذہن میں عجیب دھماکے سے ہو رہے تھے۔

”اے تو نے کیا احسان کیا ہے مجھ پر..... تو اس گھر میں ڈکیتی کی واردات تو اس لئے کرانا چاہتا تھا تاکہ اپنے فائدے کے لئے زہہ تیا کو گولی مروا کے اس قتل پر ڈکیتی کا نام دے کر پردہ ڈال سکے اور تیا کے مرنے کے بعد تمام سیاہ و سفید کا مالک بن جائے۔“ اشل بھائی نے قہقہہ لگا کر نیا انکشاف کیا تو اپنی جگہ کھڑی تابینہ کانپ کر رہ گئی۔

وہ آج تک اتنے گھٹیا اور بہروپے انسان کی محبت میں گرفتار تھی۔ اسے یہ سوچ کر بھی شرمندگی ہو رہی تھی۔ ”نہیں اشل بھائی..... خدا راپوں تو مت کہیے میں آپ لوگوں کا خاص بندہ ہوں اور میں نے ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد پر پارٹی کے مفاد کو ترجیح دی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر اس روز میں آپ لوگوں کو ان دونوں لڑکیوں کے کالج جانے کی اطلاع نہ دیتا تو آپ لوگوں کا کام کیسے آسان ہوتا!“

ظفری نے ایک بار پھر اپنی کارکردگی یاد دلانے کے لئے لجاجت بھرا انداز اختیار کیا تو ناجانے کیوں تابینہ کا دم الجھنے لگا تھا۔

”جانے کون سی لڑکیوں کا ذکر کر رہا ہے وہ؟؟ ابھی اور کونسا انکشاف ہونے کی کسر باقی ہے؟ وہ دم سادھے سن رہی تھی۔

”ہا..... ہا..... ہا.....“ ظفری کی بات کے جواب میں اشل نای ڈاکو نے منہ پھاڑ کے فلک شکاف قہقہہ لگایا۔

بڑا پارٹی کا وفادار بنتا ہے سالے..... مجھری بھی کرتا ہے تو اپنا الو سپدھا کرنے کے لیے ہیں؟ اس روز بھی تو نے غلط مجھری کی کہ چادر والی لڑکی کیپٹن طلال کی بہن ہوگی مگر وہ تو کوئی اور تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کیپٹن طلال کی بہن تو دراصل تیری محبوبہ تھی۔ جسے تو نے غلط اطلاع دے کر اغوا ہونے سے بچا لیا اور دوسری لڑکی جو غالباً تیری ہونے والی بیوی تھی کو چھاپے لگا دیا۔ یوں ایک تیر سے دوشکار کر لئے۔ پارٹی کی وفاداری کا ڈھونگ رچا کر اپنے نمبر بھی بنا لئے اور ناپسندیدہ لڑکی سے چھٹکارا بھی پالیا۔ واہ بھی صدقے جاؤں تیری وفاداریوں کے۔

دونوں ڈاکوؤں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور قہقہہ لگانے لگے۔

تو گویا قرأت کے انغواء میں بھی خود ظفری کا ہاتھ تھا!!

اس انکشاف نے تو گویا تابینہ کو ادھ مواء سا کر دیا تھا۔

وہ اس لمحے خود پر قابو نہ رکھ سکی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگی۔

”چل ری نوٹنگی اس ڈرامے کی ضرورت نہیں فضول میں پلک موتی بنی تو آنکھیں تھیلی پہ دھر دوں گا تیری۔

اشل نای ڈاکو نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے تابینہ کو گھر کا تو وہ سہم کے چپ ہو گئی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی ان صاحب کی وفاداری و محبت کی۔ اشل دوسرے لڑکے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے مسکرایا۔



بھی ذرا اس لنگور کی اپنی محبوبہ سے محبت و الفت اور وفاداری تو ملاحظہ ہو، کہہ رہا ہے کہ میری نئی نویلی دلہن لے لو اور رات بھر عیش کرو۔“ دوسرے لڑکے نے استہزاءیہ نظروں سے ظفری کی طرف دیکھا۔

ابے کتے..... اس کے ساتھ عیش کرنے کے لئے بھلا ہمیں تیری اجازت کی ضرورت ہے؟ وہ تو ہم ویسے بھی کز لیں گے..... کیوں ری بلبل؟؟ اس نے آگے بڑھ کر تائینہ کے سر سے اس کا زربتا دوپٹہ لوچ لیا تھا اور وہ صدے کی سی کیفیت میں بے حس و حرکت کھڑی رہی تھی۔ البتہ اس کے گالوں پر آنسو تو اتار سے بہہ رہے تھے جنہیں دیکھ کر شاید اشمیل بھائی جذباتی ہو گیا تھا۔ ویسے میں نے بڑے بڑے کینے اور بے غیرت لوگ دیکھے ہیں مگر تجھ جیسا گھٹیا انسان آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ تف ہے تجھ پر..... آخ تھو.....!“ اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

میں..... میں یہ تو بین برداشت نہیں کر سکتا اشمیل بھائی۔ دیکھنا جب بھی موقع ملا تو اعلیٰ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک بات بتاؤں گا۔ ظفری اپنی جگہ سے تھٹکا کے اٹھا ہی تھا کہ اس کے جڑے پر اشمیل بھائی کا زور دار گھونہ پڑا اور وہ تیور کے دوبارہ نیچے جا پڑا۔ اور پھر جو ہمیں نقاب میں بھی پہچان لے تو اسے ہم ویسے بھی نہیں چھوڑا کرتے۔

”ابے تو زندہ رہا تو بتائے گا ناں.....!“ اتنا کہتے ہوئے اشمیل بھائی نے اپنی پسل سیدھی کی اور ظفری کی جانب رخ کر کے ٹریگر دبا دیا۔

ظفری کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کی آنکھیں بے یقینی کے عالم میں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھرا گئیں۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ پل بھر کو تائینہ کا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا اور اس نے اپنے حلق سے اٹھنے والی چیخ کو گلے میں ہی گھونٹ لیا اور پھر جب ظفری کا جسم قاتلین پر ترپ رہا تھا اور وہ دونوں ڈاکو چند ثانیے کے لئے اس کے پھڑکتے ہوئے جسم کی طرف متوجہ تھے تو اس کا دھیان بے اختیار اپنے دائیں طرف بنے داش روم کے ادھ کھلے دروازے کی طرف گیا۔ تائینہ نے اپنے ہوش و حواس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اس سے پہلے کہ ان دونوں ڈاکوؤں میں سے کوئی کچھ سوچتا سمجھتا..... وہ اچانک بھاگ کر ہاتھ روم میں داخل ہوئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ دونوں ڈاکو اس وقت چوٹے جب سنہری چڑیا ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

انہیں بے یار و مددگار اور بے حس و حرکت کھڑی سہمی ہوئی لڑکی سے شاید اس جرأت کی توقع نہیں تھی۔ اسی لئے زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہے تھے۔

دروازہ کھول لو لڑکی!

جلدی کرو..... ورنہ ہم چند لمحوں بعد دروازہ توڑ کر تمہیں باہر نکال لیں گے تو پھر تمہارا جو حشر ہو گا وہ تم زندگی بھر نہیں بھول پاؤ گی۔“ انہوں نے پوری طاقت سے دروازہ پیٹا۔

”باہر نکلو احمق لڑکی..... آج تو تمہاری سہاگ رات ہے۔ ذرا دیکھو تو باہر دو، دو دولہا تمہارے منتظر ہیں..... اور تم ہو کہ ایک دولہا کے مرنے پر ادا اس ہو۔“

ان میں سے ایک کو شراب چڑھ گئی تھی۔ اس لئے ہڈیاں بک رہا تھا۔

”جا کر باتیوں کو بھی نیچے سے بلالو..... تاکہ سارے مل کر دروازہ توڑ دیں۔“

دوسرے نے کہا۔

”ارے چھوڑا یارا!“

وہ تو نیچے دو، دو لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں منارہے ہوں گے۔ میں تو انہیں اپنی اس پیاری سی دلہن کو ہاتھ

بھی نہیں لگانے دوں گا۔ ورنہ یہ کالج کی گڑیا میلی ہو جائے گی۔ اب یہ صرف ہماری ہے۔“ شراب کا نشہ سر جڑھ کر بول رہا تھا۔

ابے تو نے ابھی سے چڑھالی۔ پہلے سارا مال و اسباب تو سمیٹ لیتا۔ دیکھتا نہیں وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔

دوسرے ساتھی نے اپنے پہلے ساتھی کو گالی دے کر کہا۔

”ارے جب سامنے شراب کی بوتل ہو تو انسان نشہ کئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے..... ہیں؟“ پہلے کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور وہ نشہ میں بار بار غسل خانے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔

”اری میری گل بکاؤلی..... اب کھول بھی دے دروازہ.....!“

ارے اسے فی الحال چھوڑ اسے اور مال کی فکر کر..... نیچے والوں نے تو لگتا ہے سارا صفایا بھی کر دیا اور ہم سے ابھی تک دہن کا کمرہ اور اوپر والا حصہ نہ سمیٹا جاسکا۔ دوسرے نے گھڑیاں، کاسمیٹکس، زیورات، ٹیپ ریکارڈر اور دیگر قیمتی اشیاء دہن کے بیڈ سے نئی چادر اتار کر اس میں باندھتے ہوئے کہا۔

مگر..... وہ زیورات جو میری دہن نے پہن رکھے ہیں!! پہلے نے نشہ کی وجہ سے بھاری ہوتی ہوئی آواز میں یاد دلایا۔

ارے کہیں نہیں جاتے وہ زیورات اور نہ زیورات سے لدی پھندی ہماری دہن۔ جب دل کرے گا بل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکال لیں گے اس چوہیا کو۔ آخر جائے گی کہاں سالی اس غسل خانے سے۔

پانچ منٹ میں اس کا دروازہ اکھیر کر ایک طرف نہ ڈال دیا تو نام بدل دینا۔“ پہلے نے اتر کر کہا تو دونوں قہقہہ لگائے ہنس دیئے اور بل جل کر سامان سمیٹنے لگے۔

☆☆☆

اعلیٰ صاحب کے حکم کے مطابق دہشت گرد کمپ میں بلال کی لشکری و جہادی تربیت کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ جہاں چلتی گاڑی یا جیپ میں چڑھنے اور اترنے، بلند رکاوٹوں کو بغیر ہاتھ لگائے پار کرنے اور بھاری اسلحے کے ہمراہ بھاگنے، بلندی سے کودنے اور جہاد کے نام پر دہشت گردی کی تربیت دی جاتی تھی۔

اس جگہ رہ کر بلال نے یہ دیکھا تھا کہ یہاں کسی کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اگر مخالف پارٹی کا کوئی فرد ہاتھ لگ جاتا تو اس کے ساتھ انتہائی بے رحمانہ برتاؤ کیا جاتا۔

اس کی مشکیں کس کے اسے جیپ کے پیچھے باندھ کر نوکیلے پتھروں پر گھسیٹا جاتا۔

بدن پر تیز دھار آلے سے چیرے لگائے جاتے۔

اور خوب تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا کاٹ کر اسے مار دیا جاتا تھا اور ذبح کرنے کے بعد لاش کا سرتن سے جدا کر کے اسے درخت سے لٹکا دیا جاتا تا کہ لوگ آ کر دیکھیں تو ان کے دل پر دہشت گردوں کی ہیبت طاری ہو۔

اگر انہیں کسی پر حکومت یا خفیہ ادارے کے جاسوس ہونے اور مخبری کرنے کا شبہ ہو جاتا تو پھر اس کی خیر نہ رہتی۔ چاہے اس شک کا نشانہ بننے والی عورت ہی کیوں نہ ہوتی۔ اسے بھی چوک میں ڈال کر کوڑے برسائے جاتے اور یہ سب تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔

یہی نہیں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں انہیں لڑکیوں کے سکول جانے حتیٰ کہ گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔

اگر کسی گھر کی کوئی لڑکی ان کے حکم کی خلاف ورزی کرتی تو اسے سرعام گولی مار دی جاتی۔

کسی گھر کی کوئی لڑکی پسند آنے کی صورت میں اس گھر کے سربراہ کو اطلاع دے کر زبردستی اسی لڑکی سے نکاح پڑھا کر اسے اپنی بیوی بنالیا جاتا۔

کیمپ کمانڈر نے کئی بار بلال سے بھی شادی کے لئے کہا تھا۔ مگر بلال ابھی ایسے کسی بندھن میں بندھنے کے لئے وقتی طور پر تیار ہی نہیں تھا۔

بے شک بظاہر بلال ان لوگوں کے رنگ میں رنگ چکا تھا مگر اپنے گھر والوں کی یاد کئی بار اس کے دل میں اس بری طرح چٹکیاں لیتی تھی کہ وہ بے چین سا ہوا اٹھتا تھا۔

مگر اب اسے اپنے گھر والوں سے ملنے کی کوئی آس نہیں تھی۔

اور وہ اب ان سے مل کر انہیں اپنی وجہ سے کسی مصیبت میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

مگر جب بھی وہ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو بے اختیار ایک ہی تمنا اس کے دل میں مچل اٹھتی تھی

کہ.....!

یا اللہ..... وہ سب بخیر و عافیت ہوں اور کوئی بھی گرم سرد کبھی انہیں چھو کر بھی نہ گزرے۔

بالآخر کیمپ کمانڈر نے بلال کی تربیت ختم ہونے کی نوید سنا لی اور ساتھ ہی اعلیٰ صاحب کا حکم نامہ بھی۔ جس کے مطابق بلال کو کچھ عرصہ پڑوسی ملک میں گزارنے کے بعد بالآخر خرسات سمندر پار چلے جانا تھا اور وہاں جا کر نئے حکم کا انتظار کرنا تھا۔

”حکم حاکم مرگ مناجات“ کے تحت بلال پڑوسی ملک کی ایک خفیہ تنظیم کے زیر تحت چلنے والے ”دہشت گرد“ کیمپ میں اپنی صلاحیتوں کو لوہا منوانے کے لئے وہاں جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

طلال بھائی فون پر بتائی گئی جگہ پہ وقت مقررہ پر تنہا پہنچے تھے کیوں کہ بلال کے انواء کنندگان کا ان سے یہی مطالبہ تھا کہ وہ کسی کو اپنے ہمراہ لائیں اور نہ کسی کو یہاں اپنی آمد کے بارے میں کوئی اطلاع دے کر یا کچھ بتا کر آئیں ورنہ بلال کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

اس دھمکی کے زیر اثر تلال بھائی نا صرف تنہا بلکہ نہتے ہی چلے آئے تھے کہ کہیں ان کے پاس سے ہتھیار برآمد ہونے کی صورت میں بلال کو انواء کرنے والے غصے میں آ کر اپنے وعدے سے مکر ہی نہ جائیں اور اس طرح وہ اپنے بھائی کے حصول سے محروم نہ رہ جائیں۔

ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کرنے کے بعد انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔

اس جگہ وہ پہلے بھی مختلف کاموں کے سلسلے میں آچکے تھے اور یہ سڑک ان کے لئے نئی نہیں تھی۔

وہ جانتے تھے کہ یہ آگے جا کر ایک مین بازار کو لنک کرتی ہے اور اس سڑک کے دونوں جانب نیچے کاروباری مراکز اور اوپر دفاتر موجود تھے۔

جہاں اس وقت وہ کھڑے تھے وہاں سے کچھ دور آگے جا کر لڑکیوں کا ایک ویکیشنل سکول تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک مشہور و معروف قومی بینک کی شاخ اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک فاسٹ فوڈ سنٹر موجود تھا۔ جو کہ عموماً رات بارہ ایک بجے تک کھلا رہتا تھا۔

اس شاہرہ کو مین شاہراہ نہ ہونے کے باوجود کافی مصروف سمجھا جاتا تھا کیوں کہ دن کے اوقات میں اس طرف

کاروں اور موٹر سائیکلوں کا کافی رش رہتا تھا۔

البتہ رات کو آٹھ بجے تک باقی کاروباری مراکز اور دفاتر بند ہونے کے باوجود یہاں رش کم تو ضرور ہو جاتا تھا مگر فاسٹ فوڈ ریسٹوران کی وجہ سے بالکل ختم نہیں ہوتا تھا اور رات گئے تک کچھ نہ کچھ رونق ضرور رہتی تھی لیکن ان دنوں حالات اس قدر غیر یقینی اور سنگین تھے کہ اس وقت تک فاسٹ فوڈ بھی بند ہو چکا تھا اور دور تک پھیلے اندھیرے و سناٹے کا راج تھا۔ البتہ سڑک پر پھرتے چند آوارہ اور بے گھر کتے پاس سے گزرتے ہوئے بھونک کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تو ماحول کی وحشت کم ہونے کی بجائے اور بھی بڑھ جاتی۔

طلال بھائی کی رسٹ وائچ کی سوئیاں رات کے ساڑھے بارہ بجے کا پتہ دے رہی تھیں۔

اس وقت ریسٹوران بھی بند پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے دور تک ہو کا عالم طاری تھا البتہ رات کی تاریکی کا سینہ چیرنے کی ناکام کوشش کرتی کھمبوں پر نصب بلبوں کی زرد روشنی..... اور دور سے آنے والے علاقے کے چوکیدار کی آواز شب کے مہیب سناٹوں کی شدت کو کم کرنے میں کافی معاون ثابت ہو رہی تھی۔

طلال بھائی اس وقت ایک پرائیویٹ ہسپتال کے سامنے کھڑے تھے اور انہیں اسی پرائیویٹ کلینک کے نیچے انڈر گراؤنڈ کار پارکنگ میں آنے کے لئے کہا گیا تھا۔

طلال بھائی کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے اور پھر ایک نئے اعتماد کے ساتھ بھرپور انداز میں نیچے تلے قدم اٹھاتے کار پارکنگ کے ”آؤٹ“ گیٹ سے ”ان“ ہو گئے۔ پارکنگ ایریا میں لائیس تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔

اسی لئے طلال بھائی نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈیا نکال کر اک دیا سلائی جلائی اور اس کی روشنی میں نیچے سمیٹ کے بنے ہوئے فرش کو غور سے دیکھتے ہوئے چلے پھر ایک جگہ ریڈ پینٹ سے کراس کا بڑا سا نشان دیکھ کر وہاں رک گئے۔ چند لمبے کھڑے کچھ سوچتے رہے اور پھر اللہ کا نام لے کر اس نشان زدہ جگہ پر دونوں پاؤں جما کر رکھ دیئے کہ انہیں ایسا ہی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

جیسے ہی انہوں نے ریڈ فلر سے بنے کراس پر قدم جمائے تو انہیں اچانک یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہاں کی زمین اپنی جگہ سے سرکنے لگی ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے انہوں نے اپنے آپ کو ایک لفٹ میں موجود پایا جو شاید انہیں مزید نیچے کسی گہرائی میں لئے جا رہی تھی۔

طلال بھائی نے خالہ کی نصیحت کے مطابق تین بار آئینہ الکرسی کا درد کر کے خود پر پھونک ماری اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

لفٹ رکی تو طلال بھائی نے باہر نکل کر دیکھا اک روشن سرنگ نما گیلری دور تک جا رہی تھی۔

طلال بھائی ابھی کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں، اسی اثناء میں سرنگ کی دیوار پر لگا لال رنگ کا اک تیر تیزی سے جلنے لگا جو غالباً آگے کی جانب بڑھتے رہنے کا اشارہ تھا۔

طلال بھائی اس اشارے پر آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھنے لگے۔ اور جہاں جا کر یہ سرنگ نما راستہ ختم ہوا، وہاں جا کر رک گئے اور اگلے کسی اشارے کے انتظار میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

گمراس کے ساتھ ہی جیسے کسی نے ان کے قدموں تلے سے گویا زمین کھینچ لی تھی۔

انہیں اچانک یوں لگا تھا کہ جس طرح وہ کسی جھولے میں سوار ہوں اور جھولا ٹوٹ کر نیچے گرنے لگا ہو، بالکل اسی طرح وہ جس جگہ کھڑے تھے اس جگہ سے زمین کا تختہ اکھڑ کر انہیں لئے تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے اور کرنے کے قابل ہوتے یہ تختہ کسی اڑن کھٹولے کی طرح اڑتا ہوا انہیں

اٹھائے ایک خالی کمرے میں جا اتر!.....! جیسے ہی یہ تختہ زمین پر لگا، طلال بھائی نیچے اتر آئے اور نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”عجب الف لیلوی سا ماحول ہے!.....!“ انہوں نے فرنیچر سے خالی کمرے میں فرش پر بچھے ایرانی قالین اور کھڑکیوں پر لگے حریرے پردے دیکھتے ہوئے سوچا۔

کوئی یہاں ہے؟ کیپٹن طلال نے زور سے پکارا  
میں کیپٹن طلال!..... آپ لوگوں کے بلاوے پر یہاں پہنچ چکا ہوں..... پلیز اب آپ لوگ فوری طور پر حسب وعدہ بلال کو میرے حوالے کر دیجئے!.....“ انہوں نے کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ بلند آواز میں چلا کر اپنے ان دیکھے میزبانوں کو مخاطب کیا تھا۔

مگر جواب اب بھی دوسری جانب سے خاموشی برقرار تھی۔  
”ارے کوئی ہے؟“

”بولتے کیوں نہیں آپ لوگ؟“ کیپٹن طلال نے انتہائی بے زاری کے ساتھ تیسری بار پکارا۔ تو دیوار میں نصب ایک پسٹیکر آن ہوا اور اس میں سے ایک بھاری مردانہ آواز ابھری۔

ویلم کیپٹن طلال!..... ہم معذرت چاہتے ہیں کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ بس چند لمحوں کی بات ہے آپ کے کچھ میزبان آپ کو خوش آمدید کہنے اور آپ سے مذاکرات کرنے آپ کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ شکریہ۔ کیپٹن طلال کو لگا کہ جیسے اس کے لئے یہ پیغام ان لوگوں نے پہلے سے ہی ریکارڈ کر رکھا ہو۔

طلال کے صبر کا پیمانہ ہر گز رتے لمحے کے ساتھ لبریز ہوا جا رہا تھا۔  
اسے جلد از جلد بلال کو دیکھنے اور اسے ساتھ لے جانے کی پڑی تھی مگر اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ لیکن اسے بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور جلد ہی دو آدمی ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھائی دیئے۔

انہوں نے آتے ہی طلال سے بڑے پتاک کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔  
طلال نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی جانب باری باری دیکھا۔ مگر ان کے پتھریلے چہروں پر اس کے کسی سوال کا جواب درج نہیں تھا۔ سو طلال نے مجبوراً ان کی ہمراہی میں قدم آگے بڑھا دیئے۔  
وہ اسے مختلف کیلریوں اور کمروں سے گھماتے ہوئے ملا خرا ایک بڑے سے آفس نما کمرے میں لے گئے۔  
جہاں ایک بڑی میز کے پیچھے ایک گنجا سا کرخت صورت آدمی بیٹھا تھا۔

طلال نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ان دونوں اشخاص کو (جو اپنی معیت میں طلال کو یہاں تک لائے تھے) باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس موٹے اور گنجانے آدمی کے نظر انداز کرنے پر طلال نے جھل سا ہو کر اپنا مصافحے کو بڑھا ہوا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

معاف کرنا..... میں صرف اپنے دوستوں سے ہاتھ ملانے کا عادی ہوں اور یہ بات ابھی ہمارے درمیان طے نہیں ہو پائی کہ آیا ہم واقعی ایک دوسرے کے دوست ثابت ہو سکتے ہیں کہ نہیں؟؟

ان دونوں آدمیوں کو کمرے سے باہر بھیجنے کے بعد وہ کرخت صورت موٹا مسکرایا اور طلال کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

طلال سنجیدہ صورت لئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”معافی چاہتا ہوں مگر میں بھی یہاں خود کو کسی کا دوست یا دشمن ثابت کرنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ میں تو.....!“

”اپنے بھائی بلال کو لینے آیا ہوں ہے ناں؟“ طلال کی بات کاٹ کر وہ گنجا آدمی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔  
”جی ہاں..... بجا فرمایا آپ نے۔“ طلال بھائی کا کھویا ہوا اعتماد واپس لوٹ رہا تھا اور وہ کرسی پر جم کر بیٹھے تھے۔

”ہاں مگر تمہارے بھائی کی واپسی بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تم خود کو ہمارا دوست ثابت کر سکو۔“ سمجھنے آدمی نے سنجیدہ شکل بنا کر اپنی ٹھوڈی کھجائی۔  
”کیا مطلب؟“ کیپٹن طلال حیران رہ گئے۔

”ہم چاہتے کہ تم نوکری تو خفیہ محکمے کی کرو مگر حق وفاداری ہم سے نبھاؤ۔“ وہ آدمی معنی خیز انداز میں بھنویں چڑھا کر بولا۔

”میں سمجھا نہیں.....“ طلال نے سنجیدگی سے کہا تو وہ شخص قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔  
اس کا قہقہہ بالکل ایسا تھا جیسے گھڑے میں جامنیں ڈال کر ہلائی جا رہی ہوں۔  
طلال سنجیدہ بیٹھا رہا۔

تم اتنے ناجبھ تو نہیں ہو کیپٹن طلال..... مگر خیر اگر نہیں سمجھتے تو سنو ہمیں تمہارے محکمے کے اہم راز اور بے حد اہمیت کے حامل کچھ پلان درکار ہیں۔ اس کے بدلے بلال کے ساتھ ساتھ اور جو بھی مانگو گے ملے گا۔  
اس نے اپنے تئیں کیپٹن طلال کو دانہ ڈالنا چاہا۔  
”کس طرح کے اہم راز اور پلانز؟“ کیپٹن طلال نے بے اختیار پوچھا۔

اور جواباً اس سمجھنے آدمی نے کھل کر جو کچھ بتایا تو طلال حیران رہ گئے۔ وہ ملک دشمن لوگ جو کچھ جاننا اور جو معلومات اور قیمتی راز حاصل کرنا چاہ رہے تھے ان کا بتانا کسی طور ملکی اور قومی مفاد میں نہیں تھا۔ اور اس ملک کی سلامتی کے لئے تو کیپٹن طلال اپنی جان تک قربان کر سکتے تھے سو انہوں نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔  
”سوچ لو کیپٹن..... زبان تو تمہیں ویسے بھی کھولنی پڑے گی۔ مگر اس صورت میں تم اپنے بھائی اور دیگر فوائد سے محروم رہ جاؤ گے۔“ سمجھنے آدمی نے کڑوی سی شکل بنا کر یاد دلایا۔

مگر کیپٹن طلال نے پھر بھی اس قسم کے تعاون سے انکار کر دیا۔ تو اس آدمی کو طیش آ گیا اور اس نے گھٹنی بجا کر دو آدمیوں کو اندر بلایا اور طلال کو ان کے سپرد کرتے ہوئے اس کی خاطر تواضع کی ہدایت کی۔  
تب وہ دونوں بڑے پیار سے طلال کو اپنے ہمراہ لے کر چلے اور کیپٹن طلال فوراً سمجھ گئے کہ اب یہ ان پر تشدد کریں گے اور راز اگلوانے کی کوشش کریں گے۔

اور پھر ان کا شبہ درست ثابت ہوا۔

## اہم انتباہ

مجلد اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتمل ہر کیلئے ادارے کی معرفت آنیوالی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے۔ قارئین رابطے یا معلومات کیلئے براہ راست مشتملین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں ماہنامہ ریشم ڈائجسٹ کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

وہ دونوں انہیں ساتھ لئے ایک کال کوٹھڑی میں چلے آئے۔

اس کال کوٹھڑی کو دیکھتے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جگہ مخالف پارٹی کے انواء کنندگان قیدیوں اور دیگر ناپسندیدہ افراد کو رکھنے، ان پر تشدد کرنے اور راز اگلوانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ کمرے کے عین بیچوں بیچ ایک مخصوص انداز کی کرسی پڑی تھی۔ جسے دیکھتے ہی طلال بھائی فوراً سمجھ گئے تھے کہ یہ بجلی کی کرسی قیدیوں کو کرنٹ لگانے اور بجلی کے جھکے دینے کے لئے بنائی گئی ہے۔

انہیں افسوس ہونے لگا کہ وہ بلال کی سلامتی کے خیال سے دوستانہ طور پر ملتے جلتے کے لئے بالکل ہی خالی ہاتھ چلے آئے تھے اور اب انہیں دشمنوں سے خالی ہاتھ ہی نمٹنا پڑے گا۔

وہ یہ بات بھی سمجھ چکے تھے کہ بلال ابھی بھی ان کی پہنچ سے بہت دور تھا اور انہیں محض بلال سے ملانے اور ساتھ لے جانے کا جھانسدہ دے کر ٹریپ کیا گیا تھا۔ اور دشمن اپنی اس چال میں کامیاب بھی رہا تھا۔ کیوں کہ وہ بھائی کی محبت میں اندھا دھند دوڑے چلے آئے تھے۔ البتہ ہسٹل کی بجائے چند لاکھ روپوں کا چیک ان کی جیب میں پڑا تھا جو وہ بلال کی رہائی کے بدلے انہیں آفر کرنا چاہتے تھے مگر مخالفین کو روپے پیسے کی نہیں محض چند قیمتی رازوں کے حصول کی ضرورت تھی۔ جو کہ طلال بھائی دینے پر رضا مند نہیں تھے اور اب دشمن کے تشدد کو سہنے اور ان سے نمٹنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر رہے تھے۔

اگرچہ طلال بھائی نے ان دونوں آدمیوں کو قابو کرنا چاہا مگر ایک تو وہ تنہا تھا اور دوسرے نہتے تھے اس لئے باسانی انہیں زیر نہیں کر سکے۔ اور ان دونوں دشمنوں نے مل کر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔

ان کے کپڑے اتروا کر ان کے جسم پر مختلف آلات سے چیرے لگا کر زخموں پر نمک مریچ چھڑکا گیا۔ پھر اس کے بعد ان کا منہ پانی سے بھری ہوئی بالٹی میں ڈبو کر رکھا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے حکمانہ خفیہ کارروائیوں کے راز افشا کریں گے تو ان کا منہ بالٹی کے پانی سے باہر نکالا جائے گا۔ اس حربے سے ناکام ہو کر ان کے بدن پر دنو جینوں کی ماش کر کے اے سی آن کر دیا گیا۔

انہیں بھوکا پیاسا رکھا گیا۔

کمرے کا درجہ حرارت یکدم ناقابل برداشت حد تک بڑھا دیا گیا یا پھر انتہائی کم کر دیا گیا۔ مار پیٹ اور ہیمنانہ تشدد سے کام لیا گیا مگر کیپٹن طلال کے پائے استقلال میں ذرا برابر لغزش نہیں آئی۔ تو انہیں بجلی کے جھکے دیئے گئے اور زہور سے ہاتھ پاؤں کے ناخن نوچے گئے۔ اور پھر جب ان کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی تو زیڈ شان اور کے ڈی نے آکر چیک کیا اور فی الحال تشدد روک کر کیپٹن طلال کو کھانا کھلانے اور انہیں آرام کرنے دینے کی ہدایات جاری کیں۔

اور یوں اگلا سارا دن قدرے سکون سے گزر گیا۔

شام کے وقت شینا نے تنہا یہاں کا چکر لگایا اور اتنے کڑیل اور مضبوط انسان کو نیم غشی کی حالت میں دیکھ کر افسردہ سی رہ گئی۔

اس نے یہاں پہرے پر موجود چوکیدار کو سوسور دپے کے نوٹوں کی ایک پوری گڈی نکال کر دی اور چٹ پر چند دوائیں اور ٹانک لکھ کر دیئے اور ہدایت کی کہ جب سب لوگ یہاں کا راؤنڈ لگا کر واپس چلے جائیں تو چند جومز اور بسکٹوں کے علاوہ یہ تمام دوائیاں اور ٹانک لا کر اس قیدی کو ترتیب سے استعمال کرائی جائیں ان دواؤں کے نام اور ہر ایک کی ترکیب استعمال شینا نے چوکیدار کو سمجھا دی اور خود نیم بے ہوش کیپٹن طلال کے پاس بیٹھ کر اس کے خون اور خاک میں لتھڑے بلکہ اکڑے ہوئے بالوں میں بڑے پیار سے انگلیاں پھیرنے لگی۔ اگرچہ اس وقت کیپٹن



طلال کے ہونٹ سو جے ہوئے، بند آنکھوں کے پچوٹے متورم، گال تشدد سے کٹے پھٹے، شیو بڑھی ہوئی اور چہرے و جسم پر بے تحاشا نیل پڑے ہوئے تھے مگر اس حالت میں بھی وہ ہینا کے دل میں اتر گیا تھا۔

آج تک اس نے مختلف لوگوں کی زبانی کیپٹن طلال کی ذہانت و بہادری کے قصے ہی سنے تھے مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ واقعی اس قدر تشدد کو سہتا بھی تو بڑی بہادری کا کام تھا۔ اگر کیپٹن طلال کے بجائے کوئی اور ہوتا تو کب کا اس ظلم و ستم کی تاب نہ لا کر گزر گیا ہوتا۔ سچ ہینا کو ایسے ہی بہادر انسان کی بانہوں میں پکھلنے کا اشتیاق تھا۔ بس جلدی سے کسی طرح یہ ٹھیک ہو جائے!!

ہینا طلال کے پاس بیٹھ کر اسے ہوش دلانے کی تدابیر کرتی رہی اور جیسے ہی اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے ملازم کا لایا ہوا جوس اور دو امیں آہستہ آہستہ اس کے حلق میں ٹپکا میں۔

طلال میں شاید بات کرنے کی ہمت نہیں تھی مگر جب اس نے سوالیہ نظروں سے ہینا کی جانب دیکھا تو ہینا نے مسکراتے ہوئے اپنے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے کسی قسم کا سوال کرنے سے منع کر دیا۔ اور طلال نے بھی چپ چاپ اس کی بات مان کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ دیر وہ ننگے فرش پر پڑے کیپٹن طلال کے پاس زمین پر اکڑوں چلی رہی اور جب وہ دوبارہ دواؤں کے زیر اثر گہری نیند کی وادیوں میں اتر گیا تو ہینا دواؤں اور جوسز چوکیدار کے حوالے کرتے ہوئے اس سے اپنی یہاں آمد کے بارے میں راز داری کا وعدہ لیتے ہوئے سرخ نوٹوں کی ایک گڈی اس کے حوالے کر کے وہاں سے چل دی تھی۔

ہینا کے وہاں سے جانے کے کچھ ہی دیر بعد مسٹر کے ڈی اور زیڈ شان نے یہاں کا چکر لگایا۔ اس بار ایک ڈاکٹر بھی ان کے ہمراہ تھا۔ جس نے نیم غنودگی کے عالم میں ہی طلال کو ٹھوک بجا کر چپک کرنے کے بعد صحت مندی کا شوقیت دیتے ہوئے اسے اگلے دن شام تک دوبارہ تشدد سہنے کے قابل قرار دے دیا تھا۔

”سسر..... جب تک اپنی زبان نہیں کھولے گا تو اس کے بدن میں چھید بننے رہیں گے۔“ کے ڈی نے دواؤں کے زیر اثر زمین پر بے حس و حرکت پڑے کیپٹن طلال کو بے رحمی سے ٹھٹھا سید کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر کے ڈی، ڈاکٹر اور زیڈ شان کے جانے کے بعد چوکیدار نے کیپٹن طلال کی کوٹھڑی کی آہنی گرل بند کر کے اسے تالا لگایا اور اس کوٹھڑی کے سامنے کچھ چار پانی پر بیٹھ کر بیڑی سلگالی۔

آج شام سے ہی گہرے سیاہ بادل گھر کے آ رہے تھے اور اب گیلری کے جالی دار روشندانوں سے اندر آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں شامل بارش کی باس اور نمی بتا رہی تھی کہ باہر موسلا دھار مینہ شروع ہو چکا ہے۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج اس کے خیال کی تصدیق کر رہی تھی۔

بھیکے بھیکے موسم نے چوکیدار کے بدن کو اس کی بیڑی کی طرح ہی سلگا دیا تھا اور چھمی کی یاد کا نشہ جسم و جان کی طلب بن کر اس کا انگ انگ توڑ رہا تھا۔

بالآخر جب اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے کرتے کی جیب سے اپنا موبائل نکال کر چھمی کا نمبر ڈائل کیا اور اسے اس برسات پھری رات کی ملاقات پر راضی کر ہی لیا۔ ابھی اسے فون کئے بہت دیر نہیں گزری تھی کہ گیلری کے ماربل فرش پر اسے چھمی کے جوتوں کی کھس کھس سنائی دی اور پھر چند لمحوں بعد ہی وہ اٹھلائی، اتراتی اپنے دوپٹے کا پلوٹھماتی اور مسکراتی دانت نکالتی اسے اپنی طرف آتی نظر آ گئی۔

جانو چوکیدار نے چار پانی پر بیٹھے بیٹھے ذرا سا سرک کر اس کے لئے جگہ بنائی اور چھمی بے تکلفی سے آ کر دھپ سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

پیار و محبت کے چند ابتدائی ”مظاہروں“ کے بعد ہی چھمی کو اچانک یاد آیا کہ اسے تو دراصل بہت زور کی بھوک

لگی ہوئی ہے کیونکہ جانو کے بلانے پر وہ جلدی میں کھانا کھائے بغیر ہی چلی آئی تھی۔  
 ”ہائے رے غلاما! بھوک میں تو مجھ سے پیار بھی نہیں کیا جائے گا۔ استریاں قل پڑھ رہی ہیں میری.....!“ اللہ  
 جانے وہ سچ بھوک سے بللا رہی تھی کہ اداکاری کر رہی تھی مگر یہ درست تھا کہ جانو واقعی میں اسے یوں بلکتا دیکھ  
 کر پریشان ہو گیا تھا۔

پھر اب تو کیا کھائے گی؟ باہر تو بارش لگی ہوئی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آج مجھی پر گزارہ کر لے، جانو نے  
 شرارت سے اسے آنکھ ماری۔  
 ”میں وڈا جنناور نہیں کھاتی۔ اور بطور خاص حرام شے کھانا تو بالکل بھی پسند نہیں کرتی۔“ اس کے اس طرح کہنے  
 پر جانو کچھ چل سا ہوا مگر پھر فوراً ہی ڈھٹائی سے ہنس دیا تھا۔

”ارے میں تو اس وجہ سے کہہ رہا تھا کہ صبح کو ایک ہی بار تجھے طلوہ پوری اور میٹھی لسی کا مزیدار ناشتہ کراؤں گا  
 جب تیری بھوک بھی خوب چمکی ہوگی۔“ جانو نے اس کے بازو میں چنگی بھر کے اپنی جھینپ منانے کی کوشش کی۔  
 چل پرے ہٹ..... کنبوس کنبوس چوس نا ہو تو..... مجھ پر تو ایک آنہ بھی خرچ کرتے تیرا دم نکلتا ہے..... میں ہی  
 بے وقوف ہوں جو تیرے بلاوے پر کھائے بنے بغیر دوڑی چلی آئی..... سوچا تھا جاؤں گی تو میری قدر کرے گا۔ سو  
 طرح کے ناز اٹھائے گا، خاطر مدارت کرے گا مگر یہاں تو نے سوکھے منہ پانی بھی نہ پوچھا..... بس خود غرضیوں کی  
 طرح اپنے جذبات ٹھنڈے کرنے کی پڑی ہے۔“ ذرا سی بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لانا مجھی کی خاصیت تھی اور  
 انہی آنسوؤں کے بل بوتے پر وہ اپنے مد مقابل کو چند ہی لمحوں میں چپ کر ڈالتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا اور جانو  
 اسے باقاعدہ رونے پر آمادہ دیکھ کر اپنی ساری مستی بھول گیا تھا۔ اور اس کا موڈ بحال کرنے کی خاطر فوراً سے پیسٹر  
 اپنی چھتری سنہال مار چ اٹھا، برساتی پہن کر باہر سے کھانا لانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔  
 سن پھیمی اگر ”بھٹی تیکہ“ کھلا ہوا تو تیرے لئے چپل کباب اور نان لیتا آؤں گا ورنہ پھر خالی پکڑوں پر گزارا کر  
 لینا..... سچی؟؟

جانو نے نارچ جلا کر اس کے سیل چپک کئے اور مطمئن ہو کر باہر جانے کے لئے قدم آگے بڑھا دیئے۔ تو  
 مجھی کو بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ اتنی بارش برسات میں جانو کو اپنی فرمائش پر باہر جاتا دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ  
 سکی اور نزدیکی آ کر لاڈ سے اس کے گلے میں بازو حائل کر دیئے۔  
 ”تو کتنا اچھا ہے جانو..... میری ہر بات مان لیتا ہے۔“ وہ اس کے کرتے کے بنوں سے کھیلتے ہوئے بولی تو

جانو ہنس پڑا۔  
 ”اور تو کتنی بری ہے..... میری ایک بات بھی نہیں مان سکتی۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں شرارت سے کہا تو مجھی  
 نے مصنوعی تنگی سے اس کا سینہ پر ہلکا سا مکار سید کیا۔

”چل ہٹ راستہ دے..... ورنہ اگر اس موسم میں کچھ دیر مزید مجھ سے بونہی چمکی رہی تو..... میرا باہر جانے کا  
 ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔“ اس نے مجھی کو خود سے مزید قریب کرتے ہوئے دھمکی دی تو مجھی نے خود کو اس کی  
 گرفت سے چھڑاتے ہوئے اسے دور دھکیل دیا۔  
 چل اب جا..... یہ چونچلے واپس آ کر کرنا۔

اچھا سن مجھی..... وہ سامنے نارچر سیل..... میرا مطلب ہے کہ کوٹھڑی میں زمین پر پڑے اس آدمی کو دیکھ رہی  
 ہے؟ بس ذرا اس پر نظر رکھنی ہے۔  
 یہ لے اس کوٹھڑی کی چابیاں..... اگر شینا نام کی کوئی بی بی آ جائیں اور کوٹھڑی میں جانا چاہیں تو انہیں تالا کھول

## روزہ جن باتوں سے ٹوٹ جاتا ہے وہ یہ ہیں:

☆ روزے کی حالت میں جان بوجھ کر کچھ کھالینا یا پھر جماع کرنا۔  
☆ دانتوں میں کوئی چیز چبنے کے برابر یا زیادہ ہو، اسے جان بوجھ کر نگل لینا۔  
☆ روزہ دار ہونا یا نہ ہونا اس کے باوجود منہ بھر کر قے کرنے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔  
☆ اگر دانتوں سے خون نکلے اور حلق میں پہنچ جائے کہ اس کا ذائقہ محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔  
☆ کلی کرتے ہوئے پانی حلق سے نیچے چلا جائے جبکہ روزہ دار ہونا یا نہ ہونا تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کلی میں پانی حلق تک نہیں لے جانا چاہیے۔  
☆ اگر کھانے پینے کے دوران سحری کا وقت ختم ہو جائے تو منہ کا نوالہ اگل دینا چاہیے۔ اسے کھالینے سے روزہ نہیں ہوگا۔

☆ جھوٹ، غیبت، گالی، چغلی، بیہودہ گفتگو یا کسی کو تکلیف دینے سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔  
☆ روزے میں بار بار تھوکنے یا منہ میں تموک جمع کر کے نگل لینا اور کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کرنا بھی مکروہ ہے۔

☆ اگر بھول کر کچھ کھالیا بے اختیار قے آجائے یا کان میں پانی چلا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح اگر حلق میں دھواں، گرد، کھسی چلی جائے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔

☆ روزے میں تیل یا سرمہ کا جل لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر اس کا مزا حلق میں محسوس ہو اور یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا قصداً کھالیا یا تو اس روزے کی قضا لازم ہے، کفارہ نہیں ہوگا۔  
☆ اگر کسی عورت کا حیض روزے کے رکھتے ہی شروع ہو گیا تو روزہ نہیں ہوگا۔ اس روزے کی قضا لازم ہے۔ مگر آدھا دن گزرنے کے بعد ایسا ہو تو روزہ رکھے رہنا چاہیے۔

☆ اگر روزہ جان بوجھ کر توڑ دیا تو پھر اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک روزے کے بدلے لگاتار ساٹھ روزے رکھے ہوں گے۔ اگر بیمار یا کمزور ہو تو ایک روزے کے بدلے میں ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہوگا۔  
(صوفیہ اصغر، لاہور)

دینا، میرا پوچھیں تو بتا دینا کہ پاس والی دکان تک ذرا موبائل کا کارڈ لینے گیا ہے اور اگر تیرا پوچھیں تو بتا دینا کہ تو میری بیوی ہے جانو اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”مگر ابھی تو میں تیری بیوی نہیں ہوں..... بس وہ ہوں کیا کہتے ہیں اسے..... گرلز فرینڈ.....!“ پھمکی نے اپنے تئیں جانو کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ہاں..... وہ بھی بیوی جیسی ہی ہوتی ہے۔

”مگر بیوی تو نہیں ہوتی ناں.....؟“ پھمکی نے بحث کی۔  
”ہاں مگر بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے میری جان۔“ جانو نے اسے بہلانا چاہا۔  
”کتنا فرق؟“ پھمکی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اوں..... بس یوں سمجھ لے کہ جتنا میڈ ان اور میڈ ایز میں ہوتا ہے۔ جانو نے اپنے میٹرک پاس ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے سمجھایا۔  
”وہ کیا ہوتا ہے؟“ پھمکی نے پھر پوچھا۔

دیکھو اگر کوئی کار جاپان سے منگوائی جائے تو اسے جینوزن اور میڈ ان جاپان کہا جائے گا لیکن اگر باہر سے ہرے منگوا کر لوکل طور پر جوڑے کار تیار کی جائے گی تو اسے میڈ ایز جاپان سمجھا جائے گا۔ بس یوں سمجھو کہ جو گرل

فرینڈ ہوتی ہے وہ میڈائز جیسی ہوتی ہے۔ جانو نے اپنے طور پر مثالیں دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر جھمی محض پلکیں جھپکا کے رہ گئی۔

”تو اچھی والی کوئی ہوتی ہے؟“ اس نے مصومیت سے پوچھا۔

”جی ہاں اچھی والی تو ظاہر ہے کہ جینون ہی ہوتی ہے۔ مگر وہ منگی پڑتی ہے تو لوگ میڈائز سے کام چلاتے ہیں، کارکردگی تو اس کی بھی شاندار ہوتی ہے اور سستی بھی پڑتی ہے مگر اتنی مضبوط نہیں ہوتی۔ ایک ہلکے سے ایکسٹنٹ سے ٹوٹ سکتی ہے۔“ جانو نے ایمانداری سے بتایا۔

”تو پھر بس مجھے تو تمہاری مضبوط والی بیوی ہی بننا ہے۔“ جھمی نے سر ہلاتے ہوئے فوراً فیصلہ سنایا۔ تو جانو ہنس پڑا۔

”اچھا میری ماں..... اب مجھے جانے تو دے۔“

”تیری نہیں تیرے ہونے والے بچوں کی ماں۔“ جھمی نے ہنستے ہوئے تصحیح کی۔ تو جانو مسکراتا ہوا اپنی ٹارچ

اور چھتری سنبھالتا باہر کی جانب چلایا۔

کتنی پاگل اور بے وقوف ہوتی ہیں یہ لڑکیاں بھلا ”جس کی سرے یوں، وہ کھیتی کرے کیوں؟“ بھی جس مرد کی تمام ”ضروریات“ شادی کے جھجھٹ میں بڑے بغیر ہی پوری ہو رہی ہوں تو اسے کسی لڑکی کو بیوی بنانے اور شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر آج جھمی میری بیوی ہوتی تو بھلا میں کبھی اس جھم جھم برستی بارش میں یوں چھتری لگائے اس کی فرمائش پر چپل کباب اور نان لینے کے لئے باہر نکلتا؟ بلکہ الٹا اس کے ہاتھوں کا پکا کھانا کھا کر اس سے اپنی طلب پوری کرنے کے بعد خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہوتا اور وہ میری پاپتی بیٹی میری پنڈلیاں دبا رہی ہوتی۔ ہر بیوی کا مقدر ایک جیسا ہوتا ہے..... مگر ہر محبوبہ بڑے مزے میں رہتی ہے لیکن یہ بات ابھی اس پاگل جھمی کو نہیں پتہ۔ اس نے سوچا۔

دوسری طرف جانو کے جانے کے بعد جھمی نے بستر کی چادر کی سلوٹیں درست کیں اور بستر پر بیٹھ کے جانو کا انتظار کرنے لگی۔ جانو کی دی ہوئی کوٹھڑی کی کنبیاں اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لی تھیں اور اب روشندان سے آنے والی بارش کی نمی اور ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ دفعتاً کوٹھڑی سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا تو اک زخمی نوجوان اچھ کر بیٹھنے کی کوشش میں بری طرح کراہ رہا تھا۔

”ہا..... پانی..... پلینز..... نی پلا دیں۔“ اس نے جھمی کو اپنی طرف متوجہ پا کر آواز دی۔

جھمی کچھ دیر سوچتی رہی مگر پھر اس پر انسانیت غالب آ گئی۔ اور اس نے سٹیل کے کنورے میں مکے سے پانی انڈیا اور کوٹھڑی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ کوٹھڑی کی آہنی سلاخوں میں گیپ کم تھا جبکہ پیالہ گول اور چوڑا تھا اس لئے وہ سلاخوں سے اندر نہیں جاسکتا تھا۔

”تم دونوں ہتھیلیوں کو پیالے کی شکل میں جوڑ کر اوک بناؤ میں اوپر سے پانی ڈالتی ہوں۔“ جھمی نے اجنبی نوجوان کی پیاس بجھانے کا حل پیش کیا۔

”مگر میرے تو دونوں ہاتھ پشت پر ڈوری کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ میں بھلا کیسے اس طرح پانی پی سکتا ہوں؟“ زخمی نوجوان نے نحیف آواز میں کہا تو جھمی نے دیکھا کہ واقعی اس کے ہاتھ پیچھے کر کے نالکون کی مضبوط ڈوری سے باندھے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دونوں پاؤں بھی جوڑ کر ڈوری سے کس دیئے گئے تھے البتہ ہونٹوں پر لگی ٹیپ کسی نے اس خیال سے اتار دی تھی کہ جب اسے ہوش آئے تو اس کے ہونٹ ہلانے یا بلوٹنے سے پتہ چل جائے۔“

جھمی کو اس جوان کی حالت پر بڑا ترس آیا۔

میں تالا کھول کر تمہیں پانی پلا دیتی مگر مجھے تالا کھولنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

خیر..... تم یوں کرو کہ کروٹیں لینے کے انداز میں لڑھکتے ہوئے آہنی سلاخوں کے قریب آ جاؤ تو میں تمہارے پشت پر بندھے ہاتھ کھولنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ پھر جب تم پانی پی لو گے تو میں دوبارہ رسی سے تمہارے ہاتھ پہلے کی طرح باندھ دوں گی۔ اگر اس طرح منظور ہے تو میں پانی پلا سکتی ہوں ورنہ پڑے رہو اسی طرح۔“ جھمی نے چوٹی ہلاتے ہوئے کہا تو طلال فوراً ہی کراہتے ہوئے پوری جان کا زور لگا کر کروٹیں بدلنے کی کوشش میں لڑھکتا ہوا اس کی جانب آنے لگا۔

نزدیک آ کر اس نے اپنی پشت جھمی کی طرف کی تو جھمی گرل میں سے ہاتھ ڈال کر بڑی مشکل سے اس کی کلائیوں پر بندھی رسی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

اور پھر جیسے ہی طلال کے ہاتھوں کی گرہ کھلی تو طلال نے فوراً سیدھے ہوتے ہی اس رسی کا پھندہ بنا کر لوہے کی سلاخوں سے گزار کر جھمی کے گلے میں کس دیا۔ جھمی کی آنکھیں باہر کی طرف اٹنے لگیں۔

میں نے تمہارے دوپٹے کے پلو میں بندھی چابیاں دیکھ لی ہیں۔ اب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً اس کو ٹھڑی کا تالا کھول دو ورنہ میں ابھی اس رسی کے شکنجے کو تمہارے لئے پھانسی کا پھندہ بنا دوں گا۔

”واہ جی..... یہ اچھا صلہ ہے نیکی کا۔“ جھمی گھٹے گھٹے انداز میں غرائی۔

”جلدی کرو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ کپتن طلال نے اس کے گلے میں بندھی ڈوری کو کچھ اور زور سے کسا۔ تو جھمی لڑھکرا کے رہ گئی اور پانی کا پیالہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا پڑا۔

اس نے جسم کا ساتھ چھوڑتی سانسوں کو جمع کیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے دوپٹے کے پلو سے بندھی چابیوں میں سے ایک چابی لگا کر تالے میں گھمائی تو کھٹ سے تالا کھل گیا۔

ایک ہاتھ سے جھمی کے گلے کی رسی تھامے، دوسرے ہاتھ سے کیپٹن طلال نے اپنے پیروں کی رسی کھولی اور آہنی دروازہ کھسکا کر باہر نکل آیا۔ مگر جھمی پر اس نے ابھی تک اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔

”چلو اندر.....!“ اس نے جھمی کو کوٹھڑی میں جانے کا اشارہ کیا۔

”مگر.....!“ جھمی نے کچھ کہنا چاہا مگر مارے خوف کے اس کی کھمبھی بندھ گئی۔

”جلدی کرو.....!“ طلال نے اسے گھر کا۔ تو وہ چپ چاپ شرافت سے اندر چلی گئی۔

تب کیپٹن طلال نے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور پھر اس سے معذرت کرتے ہوئے اس کے سر پر کھڑی ہتھیلی کا ایسا کرارہ کیا کہ وہ بے ہوش ہو کر طلال کی بانہوں میں جھول گئی تو طلال نے اسے آرام سے فرش پر لٹایا اور کوٹھڑی کے دروازے کو تالا لگا کر چابیاں اپنی مٹھی میں دبا لیں اور جس راستے سے جانو چوکیدار اپنی محبوبہ کی فرمائش پر نان کباب لانے نکلا تھا۔ اسی راستے سے باہر نکل گیا۔ مگر جانے سے قبل اس نے نالکوں کی وہ رسی اپنے پاس سنبھال لی تھی کہ جس سے اس کے پاؤں باندھے گئے تھے۔

کیپٹن طلال کے کپڑوں کی حالت اس وقت سخت ناگفتہ تھی۔

پینٹ بری طرح مسکی ہوئی اور شرٹ گلے میں سرے سے تھی ہی نہیں۔

البتہ سفید بنیان جس پر خون کے دھبے موجود تھے، سخت میلی حالت میں اس کے بدن پر موجود تھا۔ کہیں کسی کو شک نہ ہو جائے یہی سوچ کر اس نے چوکیدار کے بستر پر بھی چادر اتار کر پلٹ لی تھی۔

وہ باہر نکلا تو ایک بار پھر رات کے اندھیرے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ مگر آج یہ اندھیرا اس کے لئے مددگار

ثابت ہو سکتا تھا۔

اور اوپر سے چھاجوں برستائینہ اسے سچ سچ اللہ تعالیٰ کی رحمت معلوم ہو رہا تھا۔ کیوں کہ اتنی بارش میں کسی کے اس طرف آنے کا امکان نہیں تھا۔

لیکن یہ وہ جگہ تو نہیں تھی کہ جہاں سے پہلی باریکبین طلال دشمنوں کے بتائے ہوئے پتے پر ہسپتال کے نیچے بنے اندر گراؤنڈ کار پارکنگ ایریا میں گیا تھا۔

اندر ہی اندر سڑکوں کے ذریعے پتے نہیں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ درختوں پودوں کی آڑ لیتا اور ستونوں کے پیچھے چھپتا چھپاتا بالآخر سڑک پر نکل آیا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اب تک تو چوکیدار کھانا لے کر واپس آ چکا ہوگا اور طلال کے فرار کی اطلاع سب کو دی جا چکی ہوگی اور دشمن اب شکاری کتوں کی طرح اس کی بوسو سگھٹے پھر رہے ہوں گے۔ لہذا خود کو بچانے کے لئے اس کے پاس ٹائم بہت کم تھا۔ اور ابھی تو انہیں سب سے پہلے اپنا لباس بدلنے کی ضرورت تھی مگر کیسے؟ اس سوال کا جواب فی الحال ان کے پاس موجود نہیں تھا۔

خالہ کے گھر واپس جانا، اپنے ساتھ سب کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔

جبکہ اپنے ہیڈ کوارٹر جانا بھی مصلحت کے خلاف تھا۔

”کیا کیا جائے آخر؟“ ان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

کاش اس وقت موبائل پاس ہوتا۔ مگر وہ تو گھر سے چلتے وقت اپنا موبائل جان بوجھ کر وہیں چھوڑ آئے تھے کہ اگر انہیں کڈنیپ کیا گیا تو موبائل میں محفوظ خفیہ فون نمبرز کے ذریعے دشمن یا سانی ان کے محکمے کے اہم افراد تک رسائی حاصل کر لے گا اور ان کا یہ خیال بعد میں ان کی دوراندیشی ثابت ہوئی تھی۔

اچانک سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر طلال کی چھٹی حس انہیں کسی خطرے کا الارم دینے لگی..... اور وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے خود کو جی طور پر تیار کرنے لگے.....!

☆☆☆

ڈاکو لوٹ مار کے کاموں سے فراغت پاتے ہی اس ہاتھ روم کی جانب متوجہ ہوئے تھے جس میں اندر گھس کر تابینہ نے خود کو لاک کیا ہوا تھا۔

اور اب اس کے دروازے پر بے شمار آہنی ضربیں اس بات کا اشارہ دے رہی تھیں کہ چند ہی لمحوں میں لکڑی کا یہ ہلتا اور کپکپاتا دروازہ ٹوٹ کے گرنے والا ہے.....

ہاتھ روم کے اندر کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتی اور کانپتی تابینہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لمحے کسی جیونی کا روپ دھار کر ننھے سے بل میں سما جائے اور خود کو ان بے رحم درندوں کی غلیظ نظروں سے چھپالے جو عنقریب دروازہ توڑ کر اس کی بوئیاں نوچنے کے لئے اندر آنے والے تھے۔

وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی اور روتے ہوئے صدق دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حفاظت کی دعا مانگ رہی تھی۔

دروازہ کسی بھی لمحے ٹوٹ کے گرنے والا تھا۔ اور تابینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو ان بھوکے بھیڑیوں سے بچانے کے لئے آخر کیا کرے.....!!

(باقی آئندہ)

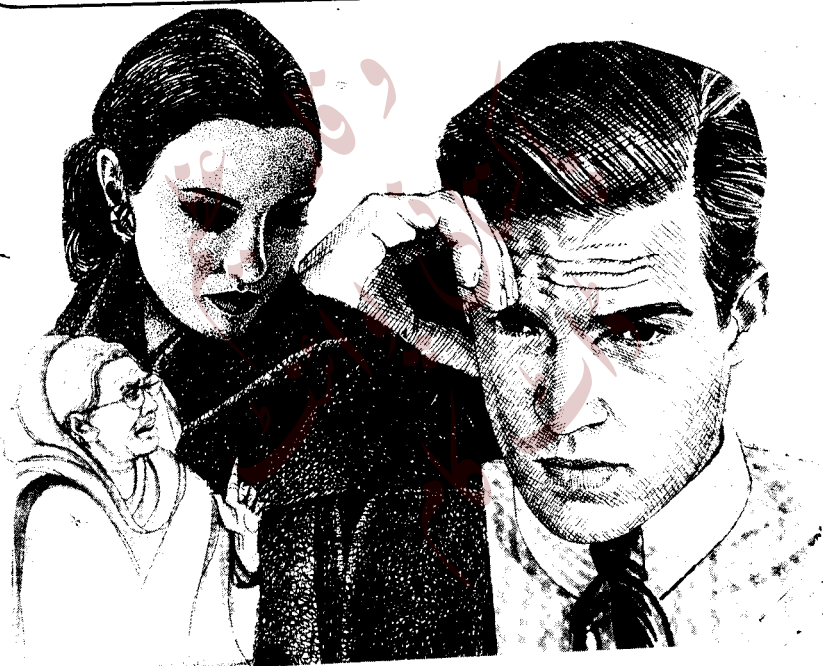
☆☆☆

# اکھورا خواب

عذرا فردوس

ان آزاد فضاؤں کی قیمت چکانے والے آج  
 بھی غلامی کے تاریک زندانوں میں قطرہ قطرہ پکھل رہے ہیں۔  
 اپنا سب کچھ لٹا کر ہمیں آزادی کی نوید سنانے والے  
 تاحال اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں پر منزل کی تلاش میں محسوس ہیں۔

تاریخ کی غلامی گردشوں میں نوحہ کنٹاں ایک لہرز خیز سچائی صرف قارئین ریشم کیلئے



دکھائی دیتا نہیں کچھ بھی دور دور تک  
 یہ ہاتھ آنکھ سے اپنے ہٹا لئے کس نے

افسانہ لکھتے لکھتے لمبے بھر کو فضیلہ بیگم کے ہاتھ رکے  
 قلم کو ہاتھوں میں لیے کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے اپنی  
 تھکی۔ انہوں نے قلم، کاغذ کو فائل میں رکھ کر ایک طرف  
 رکھ دیا اور سرتیکے سے لگا کر کچھ سوچنے لگیں۔  
 بیگم صاحبہ! چائے لے آؤں۔ ماسی زربینہ نے  
 دروازے سے جھانک کر کہا۔  
 سورج کی روشنی اب ڈھل کر سرمئی شام میں تبدیل ہو گئی



جاؤ زرینہ دروازہ کھولو لگتا ہے وہ لوگ آگئے ڈور  
بیل کی آواز سن کر فضیلہ بیگم خوشی سے سرشار ہو گئیں۔  
ہائے دادو آپ کیسی ہیں؟ آپ یہاں بالکونی میں  
بیٹھ کر انجوائے کر رہی ہیں۔ دیکھا آج کتنی رونق ہے۔  
فضیلہ بیگم بغور اپنے پوتا، پوتیوں کا معائنہ کر رہی  
تھیں۔ تینوں کے حلیے عجیب تھے۔ حسن کے گلے میں دو  
تین قسم کی چین پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کان میں بانی،  
کندھوں تک لمبے بال، حیا اور فضا جنیز کی اونچی پینٹ  
اور ٹاپ میں ملبوس تھیں۔ سر پر بالوں کا عجیب سا چھتا  
تھا۔

تم لوگ اکیلے آئے ہو؟ می، ڈیڈی کہاں ہیں؟ وہ  
کیوں نہیں آئے۔ فضیلہ بیگم نے پوچھا۔  
می، ڈیڈی کسی کے گھر ڈنر پر انوائٹ ہیں۔ ہم  
لوگ میوزک کنسرٹ میں جا رہے ہیں۔ ہمارے فرینڈز  
نیچے کار میں انتظار کر رہے ہیں۔ اچھا دادو ہم چلے ہیں۔  
تھوڑی دیر بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔  
ہمیں دیر ہو رہی ہے کھانے کا وقت نہیں ہے۔  
چلو واپس پر کھالینا میں تمہارا انتظار کروں گی۔  
اوہ دادو آپ ہمارا انتظار نہیں کیجئے گا۔ ہمیں بہت  
دیر ہو جائے گی۔ ہم وہیں کچھ کھالیں گے۔ ہم کنسرٹ  
سے واپس گھر جائیں گے۔ آپ آرام کریں۔ فضا اپنے  
بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے بولی۔

بیٹا اتنی رات گئے تم اکیلی سمندر کے کنارے  
میوزک سنو گی ایسے پروگرام تو ساری، ساری رات چلتے  
ہیں۔ لڑکیوں کا اس طرح رات گئے گھومنا اچھی بات  
نہیں۔ فضیلہ بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔  
دادو آپ بات سمجھیں نا! ہم اکیلی نہیں ہیں۔  
ہماری سہیلیاں بھائی اور ان کے دوست بھی ساتھ ہیں۔  
اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔

اوکے ”بائے بائے.....“

ان تینوں کے نکلنے ہی ان کا دماغ کہیں اور پرواز  
کرنے لگا اور دماغ کی پرواز جب ہوتی ہے تو ماضی  
حال بن جاتا ہے۔ سن 47ء کا وہ ہنگامہ خیر وقت پورے

ہاں لے آؤ سر میں درد ہو رہا ہے۔  
فضیلہ بیگم کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ کر بیٹھ  
گئیں۔ دور سے وہ سمندر کا نظارہ کرنے لگیں۔ آج  
معمول سے زیادہ رونق تھی۔ ہولوں، دکانوں، مکانوں  
پر روشنیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ عجیب شور برپا تھا  
نوجوان بغیر سائیکسز کے موٹر سائیکل بھگائے پھر رہے  
تھے اور اونچی آواز میں بے ہنگم گانے بچ رہے تھے۔  
یہ لیں بیگم صاحبہ چائے ساتھ میں گرما گرم سمو سے  
زرینہ نے ٹرے لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔  
آپ کو اس عمر میں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ خود کو  
بلا وجہ تھکانا ہیں۔

خود کو مصروف رکھ کر تو وقت گزر جاتا ہے۔ درندہ  
پورا دن کس طرح گزرے گا۔ سمو سے تو تم نے بہت  
مزے کے بنائے ہیں۔ آج کوئی خاص بات ہے جو اتنا  
غل غپاڑہ مچا ہوا ہے اور ساحل سمندر پر غیر معمولی رش  
ہے اتنا شور شرابہ تو خاص موقعوں پر ہوتا ہے۔  
بیگم صاحبہ آج چودہ اگست ہے اور لوگ خوشیاں منا  
رہے ہیں۔ آپ تو آج کا دن ہی بھول گئیں۔

”اچھا آج یوم آزادی ہے میں تو بھول ہی گئی  
چودہ اگست کی تاریخ آتی ہے اور گزر جاتی ہے وہ افسردہ  
لہجے میں بولیں۔

آپ کو کیا لگتا ہے نئی نسل کے لوگ یہ دن بھول  
گئے ہیں۔ کتنے جوش و جذبے سے وہ یہ دن منا رہے  
ہیں زرینہ نے سمندر کی اٹھلائی ہوئی لہروں کو دیکھتے  
ہوئے کہا۔

فائق اور ماریہ ابھی تک نہیں آئے ان کا ارادہ تو  
دوپہر میں میرے ساتھ لچ کرنے کا تھا اب تو رات کا  
وقت آ گیا۔

بیگم صاحبہ آج چھٹی ہے۔ آپ کچے بیٹے اور بہو  
کہیں ملنے ملانے چلے گئے ہوں گے۔ آج پارٹیاں  
وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ بچوں کی مصروفیات بھی بڑھ گئی  
ہیں۔ ہفتوں ان کی شکل نظر نہیں آتی فاخر صاحب تو  
آپ کی وجہ سے روز چکر لگا جاتے ہیں۔

## آرزوئے دعا

کل رات میں ڈری ہوئی تھی ایسے  
میں گھری ہوئی تھی چار سو کے اندھیر میں جیسے  
میرے ضمیر نے زندگی کو قریب سے محسوس کرایا  
کہ تم اس حسین زندگی کی حقدار نہیں ہو

یہ سن کر مجھے بہت ندامت ہوئی  
میں دل میں بولی نہیں آرام مجھے ان موسموں میں  
ایسے ملتے جلتے کئی موسمی گھنٹوں میں  
میں کیوں بے مقصد خیالوں میں ہوں  
حسین زندگی کی ذمہ داری کو کیوں پورا نہیں کر رہی  
میرا ابھرتا ایسے جیسے افق پر آفتاب کا  
میں اندر کے ضمیر زندگی کی ضیاء سے ڈری  
سوئے اندھیر میں کودی میں بستر کے اندر  
ایسے میں چمکتا ہوا ایک حسین نقطہ دکھائی دیا  
یہ روشن راستہ تھا میرے خدائے رشید کا  
خود کو یکجا کر کے عاجزی سے پیش کیا  
اس لرزتی ہوئی آرزوئے دعا میں  
کہ اے خدائے رشید مجھے!

بخش دے اپنی قوت طاقت کے ساتھ  
تاکہ میں ذمہ داری کو پورا کر سکوں  
جس مقصد سے تو نے مجھے پیدا کیا ہے  
اس حسین زندگی کا فریضہ عطا کیا ہے  
جسے دنیا میں رہ کر خوبصورتی سے ادا کر سکوں  
اے رحمن درجیم بخش دے یہ سب کچھ مجھے  
یہ لرزتی ہوئی آرزوئے دعا ہے  
اے میرے رب کریم میری دعا کو  
تو ضرور قبول فرما، تو ضرور قبول فرما۔ (آمین)

ہام بشری سید، کراچی

احساسات کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ اس روز سب  
کام کاج معمول کے مطابق ہو رہے تھے۔ مرد باہر  
کاموں پر جا رہے تھے اور عورتیں گھروں میں باہر کے  
حالات سے بے فکر مشغول تھیں۔ چند دن پہلے شہر والوں  
کو تو پتہ لگ گیا تھا کہ فلاں فلاں شہر پاکستان میں نہیں  
جائیں گے۔ مگر دیہات میں رہنے والے لوگوں کو خبر  
نہیں تھی۔

فضیلہ کے تایا جو شہر گئے ہوئے تھے۔ دوسرے  
شہروں، محلوں کو دیکھ کر آئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ سنایا  
کہ کل رات سارا خاندان چپکے سے نکل جائے گا۔ سب  
تیاری میں لگ گئے اور دوسرے روز رات ایک بجے  
جانے کا وقت طے ہو گیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی  
خاندان کے سارے افراد اپنا سامان باندھے ایک جگہ  
جمع ہو گئے۔

ابا ٹرک کا انتظام کرنے اور حالات دیکھنے کے  
لئے نکلے۔ گاؤں میں بالکل امن تھا۔ فضا میں خوف و  
ہراس تو تھا لیکن یہ آثار نہیں تھے کہ چند گھنٹوں بعد ہی  
یہاں قیامت برپا ہونے والی ہے۔ دروازے پر ہلکی  
سی دستک ہوئی۔ بڑے بھائی نے دروازہ کھولا اور ابا  
اپنا سینہ تھا سے اندر داخل ہوئے۔ اندر آتے ہی  
دروازہ بند کر دیا ان کی حالت دیکھ کر سب کے ہوش و  
ہواس گم ہو گئے۔ ان کے کپڑے خون سے تر تھے۔  
بے اختیار نکلتی چیخوں کو منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بند کر  
دیا گیا۔

تم لوگ جلدی نقدی اور زیور لے کر نکل جاؤ۔  
گاؤں پر حملہ ہو چکا ہے۔ ابا انک کر کہہ رہے  
تھے۔ چہرے پر موت کا پسینہ آ رہا تھا۔ ہم بھی انتقام لیں  
گے۔ فضیلہ کے چچا بولے۔

عورتوں کی عزتیں بچاؤ۔ انتقام سب سے بڑا یہی  
ہے کہ پاکستان کو پاک بناؤ۔ ایسے کلمہ پڑھا اور دم توڑ  
دیا۔ فضیلہ سات سالہ معصوم بچی تھی۔ سب کو روتا دیکھ کر  
وہ بھی رونے لگی۔ اتنے میں شور کی آوازیں سنائی آنے  
لگیں۔ گاؤں کے لوگ باہر نکل کر ایک دوسرے سے

پوچھ رہے تھے کیا ہوا؟ کیا ہو رہا ہے۔

سب لوگ چھتیس پھلانگ کر گئی کے دوسرے سرے پر کود گئے اور بغیر سوچے سمجھے بھاگنا شروع کر دیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر ہی دوڑنا شروع کر دیا۔ خوف و دہشت سر پر سوار تھی۔ راستے کی خبر نہیں تھی حلق میں پیاس سے کانٹے چھ رہے تھے۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ مجمع میں سے کسی نے کہا۔ بھائیو! اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف چلو یہاں سے واگہد قریب ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ دھڑکتے دلوں سے سب نے ادھر کارخ کر لیا۔

راستے میں جگہ، جگہ لاشیں، ڈنڈی سسکتے کراہتے نظر آئے۔ مگر وہ ان سب سے بے نیاز بھاگے جا رہے تھے اور دوسرے دیہاتوں سے قافلے آتے جا رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کا چاند زرد زرد سوگواری سے لرزتی کانپتی روشنی لیے ان کے حال پر افسردہ سا تھا۔ مگر نشان منزل وہ بھی نہ بتا رہا تھا۔ رات کے سانے کو چیرتی ہوئی موزن کی صدا ”اللہ اکبر“ خوفزدہ و پریشان حالوں کے کانوں میں بڑی۔ لوگ آواز کی سمت بھاگے۔ شاید اس کے قریب کوئی بستی ہو تو ذرا سستالیں۔

اس خانہ خدا کے قریب پہنچ کر چند لوگ دیوانہ وار اس میں ٹھس گئے۔ وہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا ان کی روحوں کو تڑپا گیا۔ وہ مسجد جو کل تک آباد تھی۔ آج ویران و شکستہ ٹھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گاؤں کا کوئی شخص بھی وہاں نہ تھا۔ تنہا موزن تھا جو اپنا فرض انجام دے کر نماز پڑھ رہا تھا۔ کچھ لوگ نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

اگر ترسے پھر یہ قافلہ چل پڑا۔ دن کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن جگہ جگہ سرسبزیدہ لاشیں، اجڑے جلے گھر، سلکتی کھیتیاں، دھواں اٹھتے ہوئے گاؤں انہیں راستہ بدل بدل کر چلنے پر مجبور کرتے تھے۔ جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی۔ قافلے والوں کی تعداد گھٹ رہی تھی۔ عمر رسیدہ پیدل چلتے چلتے دم توڑتے جا رہے

تھے۔ وہ معصوم بچے تیس گھنٹوں سے جن کے حلق میں پانی کا ایک قطرہ تنگ نہیں گیا تھا۔ وہ ماؤں، بہنوں کی گود خالی کر رہے تھے۔ راستے میں بلوائیوں سے جھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہی تھیں۔ جب وہ سرحد عبور کر کے پاک سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے تو دلوں کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ دل غم سے چور، لیکن منزل پر پہنچنے کا سرور بھی تھا، بے اطمینانی، خوف، گھر بار چھوٹنے کا غم، عزیز و اقارب، بال بچوں کی لاشوں کو درندوں کے حوالے کرنے کا خیال لیکن پاکستان بن جانے اور پھر اس میں پہنچنے کی خوشی کا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

لوگ دیوانہ وار پاک زمین کی مٹی اٹھا کر آنکھوں پر لگا رہے تھے، چوم رہے تھے اس پر سجدے کر رہے تھے۔ یہ زمین ان کی پناہ گاہ تھی۔ ان کی عصمتوں، جان و مال کی محافظ تھی۔ اب یہاں انہیں کسی بات کا ڈر نہ تھا۔ نہ جانوں کا اندیشہ نہ عصمتوں کی برابادی کا خوف۔

ذرا امن نصیب ہوا سب نے اپنے عزیزوں کو سینے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ ہزاروں کے قافلوں میں سے بمشکل چند سو انسان بچ سکے ہیں۔ خود اس کے خاندان کے ستائیس افراد پاکستان کی بنیاد میں کام آ گئے تھے۔ تاپا، چچا، چچی ان کے بچے اس کے بیٹوں بھائی ایک اس کی تم رسیدہ ماں اور تانی بس زندہ رہ گئی تھیں۔ یہ تین تین سخت جاں نثیں۔ جو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی تھیں۔

جب مہاجر کمپ میں چند روز کی امداد کے بعد لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے نکلے تو کوئی ایک کے پاس دکانوں، مکانوں کھیتوں، زمینوں کی الاٹمنٹ کے کاغذات اور پیش کش بھی تھی۔

فضیلہ کی اماں کو بھی مکان، زمین کی پیشکش کی گئی تھی اور اس وقت تو یہ الاٹمنٹ اتنی آسان تھی کہ مہاجر لوگ جس جگہ جا بیٹھتے پاکستان کے سپاہی عاجزی کے ساتھ ان کے لئے دیدہ دل فروش راہ کئے ہوئے تھے۔ کچھ دنوں بعد جب مکان الاٹ ہو گیا تو اماں اور تانی

کیپ سے ادھر منتقل ہو گئیں۔ اماں نے سلائی شروع کر دی۔ یوں وہ اپنا خرچ اٹھانے لگیں۔

فضیلہ نے انٹر کر لیا تو اماں نے اس کی شادی کر دی کیا خبر کب ان کا بلاوا آ جائے تو اس کا پرسان حال کوئی تو ہو۔ فاخر علی کی شرافت کو دیکھتے ہوئے فضیلہ نے اسے قبول کر لیا۔

مگر وہ نیک شوہر اتنا شریف نکلا کہ تین سال بعد ہی اس سے علیحدہ ہو گیا اس لئے کہ اس سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی بیوی اس کے گھر میں رہتے ہوئے اپنی ماں اور تائی کی کفالت کرے۔ دو سالہ بیٹے کو اس کے حوالے کر کے وہ چلتا بنا۔

فضیلہ! تم نے اچھا نہیں کیا۔ فاخر علی تمہارا شوہر تھا۔ تم نے میری خاطر اس کو چھوڑ دیا۔ میں تو چراغ سحری ہوں میری زندگی کا کیا بھروسہ تمہارے آگے تو پوری زندگی پڑی ہے۔ اماں فضیلہ کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کی وجہ خود کو سمجھ رہی تھیں۔

اماں! فاخر علی سے شادی کر کے مجھے بیٹے کے سوا کیا حاصل ہوا ہے۔ وہ ایک نکما شخص تھا جو صرف بیوی کی کمائی پر عیش کرنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے شوہر کو بیٹھا کر کھلانا ہے تو میں اکیلی بہتر ہوں۔

مگر بیٹا زندگی کا سفر طویل ہے کیسے گزرے گا؟

اماں! آپ فکر مند نہ ہوں میں اپنے بیٹے کے سہارے یہ سفر طے کر لوں گی۔ فضیلہ پر امید لہجے میں بولی۔

سکول کی نوکری کے ساتھ ساتھ اس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی۔ تین افراد کی کفالت اس کے ذمے تھی۔ ضروریات زندگی اکٹھا کرنے میں اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ کب اس کا بیٹا فائق جوان ہو گیا۔

امی! مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔ فائق کی آواز سن کر اس نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔

بولو بیٹا کیا بات ہے۔

امی میں اپنی کلاس فیلو ماریہ سے شادی کرنا چاہتا

ہوں۔ فائق نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

مگر میں نے تو تمہارے لئے سمیعہ کو پسند کیا ہے۔ بہت نیک بچی ہے۔ اس کی ماں نے پڑوسن ہونے کے ناطے میرا بڑا خیال رکھا ہے۔ پھر میں ان لوگوں کو جانتی ہوں نئے لوگوں کو پرکھنا بہت مشکل ہے۔ لوگ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔

اوہو امی! آپ کس بیک درڈ لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کسی بھی طرح میرے ساتھ نہیں چل سکتی۔ مجھے ایسی لڑکی سے شادی کرنا ہے جو سوشل ہو ماریہ سے میری انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ پھر مجھے پتہ ہے میری شادی کس سے ٹھیک رہے گی۔ فائق کے قطعی لہجے کے آگے فضیلہ بیگم نے چپ سادھ لی۔

بیگم صاحبہ آپ کب تک ادھر بیٹھی رہیں گی اندر چل کر آرام کریں۔ زرینہ کی آواز سن کر وہ چونکیں۔ جیسے خواب سے جاگ گئی ہوں۔ پاکستان بننے کا خواب کیسا تھا؟ جس کی تعبیر اتنی بھیانک نکلی ہے۔

زمانہ وقت، دن رات کا ہیر پھیر زخموں کا بہت بڑا مرہم تھا۔ ہندوؤں، سکھوں کے لگائے ہوئے زخموں کی ٹیسیں تو کم ہو گئی تھیں۔ مگر لوگوں نے مکانوں، دکانوں، زمینوں کے پیچھے اپنا ایمان بیچ ڈالا۔ سب کو اپنے مستقبل کو بنانے کی فکر تھی اور اولاد کے لئے کچھ کما کر چھوڑ جانا تھا۔ رہ گیا ”مقصد پاکستان“ تو وہ اسی پیٹ و تن کے پیچھے ادھل ہو گیا۔ پوری قوم بحران کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ سیاست دان اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لئے نئے نئے تماشے کرنے کے لئے تیار رہتے۔

جوان خون سڑکوں پر بہہ رہا تھا۔ ہڑتالوں اور احتجاج نے عوام کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ مائیں، بہنیں اپنے سہارے کھو رہی تھیں۔ یہ خواب کیوں ادھورا ہے؟ فضیلہ بیگم کو اس لمحے اپنی اماں شدت سے یاد آئیں۔ کتنے جوش و جذبے سے وہ یہ دن مناتی تھیں۔ اپنے گھر کے باہر نیم کے درخت کی سب سے ہری اور اونچی شاخ پر وہ پاکستان کا پرچم لہراتی تھیں۔ اس لمحے اماں یہ دعا مانگا کرتی تھیں۔ خدا اس جھنڈے کو ہمیشہ قائم رکھے

تا ابد تاقیامت سلامت رکھے۔ میرے ملک، میری قوم، میرے ہم وطنوں کو ایسی عنایتوں سے نواز دے کہ ان کے دلوں سے لالچ حرص و ہوس ختم ہو جائے۔

فضیلہ بیگم بالکونی سے اٹھ کر اندر کمرے میں آ کر نماز پڑھنے لگیں۔ اور گزرگڑا کر خدا کے حضور وہی دعا کرنے لگیں۔ جو اماں جشن آزادی کے روز کیا کرتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کھڑکی سے گزرتے ہوئے بجوم کو دیکھنے لگیں۔ باہر گزرتی کاروں اور اسکوڑوں پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ کاش ہماری قوم اس پرچم کی عزت اور وقار کا خیال کر لے اور اس مقصد کو سمجھے جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ فضیلہ بیگم باہر شور شرابے کو دیکھتے ہوئے پھر سوچنے لگیں۔ آج ان کے پرانے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔

بیگم صاحبہ کھانا لگا دیا ہے۔ آ کر کھالیں زرینہ کی آواز نے ان کی سوچوں کو منتشر کر دیا۔

بھوک نہیں لگ رہی۔ طبیعت عجیب سی بے چین ہو رہی ہے۔

بیگم صاحبہ! تھوڑا سا کھالیں آج میں نے آپ کی پسندیدہ ڈش کوفتے اور پلاؤ بنایا ہے۔ میری خاطر کھالیں زرینہ کے اصرار پر وہ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئیں۔

بیگم صاحبہ! پاکستان تو رمضان کی ستائیس تاریخ کو بنا تھا۔

ہاں زرینہ پاکستان برکتوں والی رات میں خدا نے برصغیر کے مسلمانوں کو انعام کے طور پر دیا تھا۔

پھر تو جشن آزادی ستائیس کو منانا چاہیے۔

بی بی شکر کرو ہم ستائیس رمضان کو جشن آزادی نہیں مناتے۔ اس رات جو تھوڑی بہت عبادت کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں وہ برکتوں والی رات بھی اسی ہلہ

مگھ کی نذر ہو جاتی۔ جشن آزادی کے نام پر شور ہنگامہ ہی ہمارا نصب العین بن گیا ہے۔ ہماری قوم فکری اور

سیاسی آزادیوں سے بے پروا اور غافل قوم بنا دی گئی ہے۔ حالانکہ آج کے دن ملت کو اس کی غلطیوں سے

آگاہ کیا جانا چاہیے۔

زرینہ نے کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلادیا۔

فضیلہ بیگم چپ چاپ کھانا کھانے لگیں۔ دل ہی دل میں وہ خود کو کوس رہی تھیں۔ یکسر دینا بہت آسان

ہے۔ انہوں نے خود کیا کیا ہے۔ اپنے بچوں کو نہ بتا سکیں۔ پیسہ کمانے کی دھن میں لگی رہیں۔ پاکستان

بنانے کا مقصد ہی بھول گئیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی یاد نہ رہا۔ پاکستان بنے ہوئے 65 سال ہو گئے۔ مگر وہ

خواب ابھی تک پورا نہیں ہوا جو اس وقت کے لوگوں نے دیکھا تھا۔ اس خواب کی تعبیر ہنوز سامنے نہیں آئی۔

جس کی خاطر بے پناہ تباہی مول لی گئی تھی۔ فضیلہ بیگم کھانے سے فارغ ہو گئیں۔ تو زرینہ نیند

کی ٹیبلٹ لے آئی۔ جب سے انہیں دل کا عارضہ ہوا تھا۔ نیند کی دوا لیے بغیر وہ نہیں سوتی تھیں اور آج تو ان

کی طبیعت خاصی بے چین تھی ٹیبلٹ کھاتے ہی وہ نیند کی گہری وادی میں اتر گئیں۔

رات بیت چکی تھی۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ ٹیلی فون بیل کی آواز سن کر ان کی آنکھ کھلی۔ اس سے پہلے

کہ وہ زرینہ سے کچھ پوچھتیں۔ بیگم صاحبہ! فائق صاحب کا فون ہے۔

فائق بیٹا خیریت تو ہے اتنی صبح فون کیسے کر لیا۔ امی! حیا اور فضا گھر نہیں پہنچیں۔ دس بج گئے ہیں

کیا وہ آپ کے پاس ہیں؟ حسن نے بتایا ہے جب وہ میوزک کنسرٹ سے نکلا تو وہ وہاں نہیں تھیں۔ فضیلہ بیگم

نے چکراتے سر کو پکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولیں۔ ریسیوران کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

امی، امی بولیں۔ کچھ جواب تو دیں دوسری طرف سے فائق احمد پوچھتے رہے۔ فضیلہ بیگم کچھ جواب دیئے

بغیر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔ ان کے خاندان کی ناموس ختم ہونے کے بعد اب ان کے پاس بچا ہی کیا

تھا۔ جس کی وجہ یقیناً آزادی کے منہوم کو سمجھنے میں غلطی تھی۔ اپنی معاشرتی روایات اور اسلامی تعلیمات سے

انحراف تھا۔

☆.....☆.....☆

## صبح آزادی

فصیحہ آصف خان

آزادی کے نام پر اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان  
 پہنچنے والے لوگ عام نہیں ہو سکتے  
 کیونکہ وہ تاریخ عالم کے اس اہم ترین باب  
 کا حصہ ہیں جنہوں نے نظریاتی بنیاد پر ہجرت کی۔۔۔۔

ایک لمبورنگ کہانی جس کا ہر کردار تاریخ کا حصہ ہے۔۔۔۔



دھیمے سروں میں چینی رہتی ہیں خواہشیں  
 کمرے میں اک سکون ہے کہرام کی طرح

سب سے گرا رہے تھے۔ اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں،  
 دوپٹہ الگ آنسو پی پی کر داستانِ رنج و الم سنار ہاتھا۔  
 کے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سفید آنچل بوڑھی، آنکھوں  
 پہ رکھ کر سسک اٹھیں۔ یہ تو اک آسرا تھا۔ بہانہ تھا جینے کا  
 تنہائی، یادیں، دکھ، بے چینی، یہ سب ان کا سرمایہ کل تھا۔  
 آنکھیں خشک کرتی وہ ماحقہ غسل خانے میں گئیں۔  
 دھک کی گہری کاٹ نے ان کے پورے وجود کو جھجھوڑ

جھریوں بھرا چہرہ آئینے میں انہیں ماہ و سال کی گردشیں دکھارہا تھا۔

کتنا وقت بیت گیا تھا۔ چھینے مار کر وہ تو لیے سے چہرہ خشک کرتی آہستہ آہستہ چلتی بستر پر آ گئیں۔ ذہلی عمر نے جیسے توانائی نچوڑ کر دم، خم، حوصلہ ختم سا کر دیا تھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے کہ ملازمہ ان کے لئے کھانا لے آئی۔

ابلے ہوئے چاول، شوربہ، ایک کیلا پر ہیڑی کھانا۔ کمال ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ سفینہ بھی اچھی بہو ثابت ہوئی تھی۔ نہ فالتو بات کرتی نہ بھٹکتی..... جہاں آرا کے لئے یہی کافی تھا۔

زندگی کے دن ہی تو گزارنے تھے، سو خدا کا شکر ادا کر کے گزارے جا رہی تھیں۔ کمال تو ان کی ایک اولاد تھی اور تھا ہی کون پوری دنیا میں..... ایک لمبی داستان تھی۔

کھانا کھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور لیٹ گئیں۔ کمال کو خدا نے نین سچے دیئے تھے۔ بڑی بیٹی عمیرا، پھر فواد اور بیٹی سدرہ.....

عمیرا شادی شدہ تھی..... اور دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ پھر فواد اور سدرہ تھے۔ وہ جڑواں تھے۔ عمیرا سے آٹھ سال چھوٹے تھے۔ فواد ایم بی اے کر رہا تھا اور سدرہ ایم ایس سی۔

کمال کی پرورش جہاں آرا نے بہت مشکل حالات میں کی۔ مگر اسے کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔ بہت ناز و نعم میں پالا سب سے بڑھ کر انہوں نے یہ کوشش کی کہ اسے دین کی دولت سے بھی بہرہ ور کریں۔ جس کی وجہ سے وہ ماں کا بے حد احترام کرتا تھا مگر جو تیر لگنا تھا۔ دل پہ وہ تو لگ چکا تھا۔ کمال نے اپنی پسند کی شادی کی، بہت امیر اور ماڈرن لڑکی سے جس میں دین کی سمجھ کا فقدان تھا۔ یوں کمال بھی سفینہ کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ سونے پہ سہاگہ سب بچے ماں کی تقلید میں پیش پیش تھے۔

نماز کا احساس ختم..... قرآن کی سمجھ بوجھ سے دور، بے پردگی، ماڈرن ازم..... باقی رہی سہی کسر میڈیا نے

پوری کر دی۔

ہمسایہ ممالک کی ثقافتی یلغار نے سب کچھ ملایا میٹ کر دیا، دُش، کیبل، نیٹ، موبائل بے حیائی عروج پر تھی۔ دن رات ٹی وی پر بے حیائی مل بیٹھ کر دیکھنے والے اس احساس سے یکسر عاری کہ شرم و حیاء تو مسلمانوں کا زیور ہے۔

جہاں آرا کرہتی رہتیں۔ یوں بھی پچھلے کئی سالوں سے وہ گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔

کمال کو بزنس سے فرصت ہی کم ملتی تھی۔ بہو کی اپنی سوشل لائف تھی۔ ویسے بھی آج کے دور میں کسی کے پاس اتنا ٹائم نہیں کہ وہ بوڑھوں کے پاس آ بیٹھے۔ جہاں آرا کسی سے کچھ نہ کہتیں، بس اللہ اللہ کرتی رہتیں۔

☆☆.....☆☆

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو عمیرا بچوں سمیت آ گئی۔ اس کے دو بچے تھے سات سالہ شاہانہ اور پانچ سال کا اسد۔

عمیرا بہت غرے والی لڑکی تھی۔ پہلی اولاد تھی ماں باپ نے بہت لاڈوں میں پالا، اسے آج آئے تیسرا دن تھا۔

سب نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا..... جہاں آرا بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ ٹی وی الگ اپنی سنارہا تھا کہ شاہانہ کی حرکت نے جہاں آرا کو ششدر سا کر دیا۔

وہ پلیٹ میں ڈرائی فروٹ، اور کچھ کھانے کا سامان ڈال کر اپنے سامنے اسد کو کھڑا کر کے ڈرامے کا سینہ کرنے لگی۔

میں اپنے بھائی کی ”آرتی“ اتار رہی ہوں، اے بھگوان..... جہاں آرا کے کانوں میں گویا سیسہ انڈیل دیا گیا ہو۔

سات سال کی بچی اور یہ..... کام..... ان کا دماغ چکرانے لگا۔

آؤ..... اب میں تمہارے بازو پہ رکھی باندھ



دوں.....

وہ اپنی پونی اتار کر اس کی کلائی پہ باندھنے لگی۔

آپنی کل ”ہولی“ کھیلیں گے..... اسد بھی پیچھے نہ

رہا۔

بچے کھیل رہے تھے۔ والدین بس مطمئن تھے کہ وہ

کھیل رہے ہیں، کیا ”کھیل“ رہے ہیں اس سے بے

نیاز۔

یہ ہماری نسل کس طرف جا رہی ہے؟ ایک نسل بگڑ

چکی تھی۔ دوسری بگڑ رہی ہے۔ تب ان کی نگاہ سامنے چلتے

پلازما پر پڑی۔ جہاں کسی فلم میں مندر کا سین فلما یا ہوا

تھا۔

ایک لڑکا اور لڑکی ہاتھ باندھے پتھر کی مورتی کے

سامنے کھڑے گڑگڑا رہے تھے..... سب بھارتی ثقافتی

غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔

کیا میں پاکستان میں ہوں؟ ان کے بوڑھے دماغ

میں سوال کلبلا یا؟ یا ہندوستان میں..... یا کہیں اور.....

جہاں آرا کا دل متلانے لگا..... وہ آہستہ سے اٹھ

کھڑی ہوئیں۔

کیا ہوا اماں جی..... کمال جلدی سے ان کے پاس آیا۔

تھک گئی ہوں بیٹا، آرام کروں گی..... وہ اپنا دوپٹہ

درست کرتے ہوئے آہستہ سے بولیں..... تو نگاہ بانی

بیٹھے نفوس پر پڑی۔

سفینہ جار جٹ کا سوٹ پہنے کئے ہوئے بالوں

سمیت اپنی عمر سے بہت کم عمر دکھائی دے رہی تھیں۔ عیرا

اور سدرہ بھی جدیدیت کا نمونہ لگے۔ سدرہ تو خاص طور پر

جینز اور سیلوں شرٹ میں، دوپٹے سے بے نیاز تھیں۔

جہاں آرا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ اپنے دوپٹے کی بکل

کستی کمرے میں آگئیں۔ کمال انہیں بستر پر بٹھا کر

ملازمہ کو ضروری ہدایات دیتا باہر چلا گیا۔ پاکستان ایک

آزاد مملکت خدا داد ٹھہری۔ مگر آج بھی بھارتی ثقافتی یلغار

کی غلامی میں جکڑی ہوئی ہے۔ کونسا گھر ہے جہاں فی وی

نہیں۔ ڈش ویکیل نہیں۔ بھارتی چینل سے دل نہ بہلایا

جاتا ہو..... موبائل کی میموری بھارتی واہیات گانوں سے

پر ہے۔ ایک ہمارا اور تھا..... آہ ہمارا اور.....

جہاں آرا کے اندر تنک دکھ کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور پاکستان کے حالات

بگڑتے جا رہے تھے۔ اخبارات میں نت نئی خبریں.....

گینگ ریپ، اغواء اولاد کی نافرمانی، مغربی ممالک کی

اندھی تقلید..... وجہ..... دین سے دوری پاکستان اللہ کے

نام پر قائم کیا گیا تھا۔ 63 سال گزر جانے کے باوجود

اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس مملکت خدا داد کو اب

تک اسلام کی کج رہ گاہ نہیں بنایا جا سکا۔ جو اصل نظریہ تھا۔

اسلام کا، اس کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔

☆☆.....☆☆

”اماں یہ دیکھو..... دیکھو تو ہمیں، ہمارے زرق

برق لباس، لذیذ کھانے..... یہ شہد سے زیادہ میٹھا اور

دودھ سے زیادہ سفید پانی..... یہ خوشبو تو محسوس کرو.....

ہمیں دیکھو..... ناں..... ہمارے چہرے..... میں جمال

الدین..... یہ ابا اور یہ آمنہ ہم کتنے خوش ہیں یہاں.....

اور تم کتنی خوش قسمت عورت ہو..... شہید کی بیوہ اور شہداء

کی ماں.....

جمال الدین کی معصوم ہنسی گونجی اور..... یک لخت

جہاں آرا کی آنکھ کھل گئی۔

برسوں سے وہ یہی خواب دیکھتی چلی آرہی تھیں۔

سردی کے باوجود انہیں پسینہ آ گیا۔

میرے شہیدو..... میرے سر کے سائیں.....

میرے بچو..... بے اختیار آنکھیں اور دل بھر آیا۔

☆☆.....☆☆

گھر میں سدرہ کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

آج اس کی منگنی کی تقریب تھی..... مقامی ہوٹل میں لڑکے

لڑکیوں کے مغربی لباس و اطوار و انداز..... فیل والیم سے

چلتا ڈیک کانوں کے پردے چیرتی آوازیں اس پر

بانہوں میں بانہیں ڈالے انڈین گانوں پر پرفارمنس

دیتے نوجوان جوڑے۔ جہاں آرا کی آنکھوں میں حیا

کے آسوا گئے۔

سب سے الگ تھلک بیٹھی وہ حیرتوں کے سمندر میں

تب ایک دم ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ  
لجابت بھرے انداز میں بولیں۔

بیٹا اس کو بند کر دو..... ان کی گلوگیر آواز پر سفینہ اور  
سدرہ بھی جھکیں۔

تب ماں کے اشارہ کرنے پر سدرہ نے ریموٹ  
کنٹرول کی مدد سے ٹی وی آف کر دیا۔ کیا ہوا بڑی  
اماں..... فواد گھنٹوں کے بل بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر  
پریشانی سے بولا۔

یاد آگئی تھی بیٹا..... وہ ساری المناک کہانی۔  
یہ ہندو، سکھ، جنہوں نے ہمارے گھر اجاڑے،  
تمہارے تایا جمال الدین، آمنہ پھپھو..... اور تمہارے  
دادا اسلام دین، یہی نہیں ہزاروں، لاکھوں شہیدوں کا لہو  
آج بھی آنکھوں میں آنسو بھر دیتا ہے۔ جگر تڑپاتا ہے۔  
پیاروں کی یاد میں۔  
جہاں آرا کی بوڑھی آنکھوں سے روانی سے ندیاں  
بننے لگیں۔

جانے کیا اشتیاق ہوا کہ سدرہ بھی ان کے قریب  
آگئی سفینہ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔  
جہاں آرا کے سامنے ماضی کا دلخراش، جگر پاش منظر  
کھڑا ہوا۔

☆☆.....☆☆

جہاں آرا بہت خوبصورت تھیں۔ وجیہ تو اسلام  
دین بھی تھے۔ اس پر بچے بھی حسن و وجاہت کا شاہکار  
تھے۔ آٹھ سالہ آمنہ، 6 سالہ جمال اور ایک سال کا  
کمال۔

اسلام دین بہت نیک انسان تھا، اپنی دکان تھی  
کریانہ کی اور موذن بھی تھا۔ محلے کی کئی بچیاں جہاں آرا  
کے پاس قرآن پاک پڑھتی تھیں۔ بہت دیندار اور معزز  
گھرانہ تھا۔ لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کافی  
عرصے سے ایک ہی بات سننے میں آرہی تھی کہ مسلمانوں  
کا الگ وطن کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ قائد اعظم اور  
دوسرے کئی عظیم رہنما اسی کوشش میں سرگرداں ہیں،  
فسادات کا اندیشہ ہے۔ کافی علاقے لڑائی و خونریزی کا

غوطے کھا رہی تھیں۔ اگرچہ کچھ پتا نہ تھا۔ ہر طرف یہی  
کچھ ہو رہا تھا۔

یہاں تک کہ سدرہ اور اس کا منگیتر بھی بغل گیر ہو کر  
مغربی انداز میں ڈانس کرنے لگے۔ کچھ نہ سوچا تو کمال کو  
بتا کر گھر آ گئیں۔ ڈرائیور موجود تھا وہ ان کے ہمراہ گھر  
آ گئیں۔

روزانہ کتنے ہی زخم لگتے تھے..... سیدہ تو پہلے ہی فگار  
تھا۔

بے راہ روی کے شکار آج کے لوگ جنت اور دوزخ  
کو بھول چکے تھے۔ دنیا کی لذتوں میں کھو کر گناہ و ثواب  
کے معنی فراموش کر بیٹھے تھے۔

اس روز وہ دوپہر کے کھانے کے بعد حسب عادت  
تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ فواد آ گیا۔

بڑی اماں ادھر آئیں..... آپ کو ایک چیز  
دکھاؤں..... وہ انہیں زبردستی لاؤنج میں لے آیا.....  
جہاں سفینہ، سدرہ شارپلٹ کے ڈراموں سے لطف  
اندوز ہو رہی تھیں۔

جہاں آرا حیران تھیں کہ فواد انہیں یہاں کیوں لایا  
ہے۔ جبکہ نہ وہ ٹی وی کی شوٹین تھیں کجا بھارتی ڈراموں  
کی.....

فواد نے انہیں عین پلازمہ کے سامنے آٹھایا۔  
سفینہ کے برابر..... وہ بھی حیرت سے سب دیکھنے  
لگیں۔

یہ دیکھیں..... بڑی اماں..... آپ سے کتنی شکل ملتی ہے۔  
ڈرامے میں کسی عمر رسیدہ خاتون ماتھے پہ بندیا  
لگائے۔ سفید ساڑھی باندھے بچوں میں گھیری بیٹھی تھی اور  
واقعی اس بوڑھیا کی صورت جہاں آرا سے بے حد مشابہہ  
تھی۔ سفینہ بھی مسکرا دیں۔

مگر جہاں آرا کے اندر ایک ناگوار لہر اٹھی، خون ابل  
سار ہا تھا۔

وہ تو ایک غیر مسلم تھی۔ فواد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔  
دونوں کو، جہاں آرا کے ماتھے پر ناگواری کے باعث  
لکیریں نمایاں تھیں۔

شکار ہو چکے تھے۔  
تھیں..... نعشیں..... اف یہ تو چا چا خیرو ہے..... لہو میں  
لت پت ایک طرف اوندھا پڑا..... معمر فقیر..... اللہ لوک  
بندہ تھا۔

جہاں آرا تم کمال کو گود میں لے لو..... میں آمنہ اور  
جمال کو پکڑتا ہوں۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کوئی آکر انہیں  
موت کی نیند سلا دے گا۔  
عورتوں اور لڑکیوں کی چیخیں، گھروں سے بلند ہو  
رہی تھی۔

چلو بھاگو..... دوڑو..... مگر قدم تھے کہ من من کے  
ہور ہے تھے۔ کہ یکدم تین بلوائی سامنے آ گئے.....  
خون آلود کرپائیں لہراتے مکروہ چہروں پر ہنسی لے  
ان کی جانب بڑھے آمنہ اور جمال سہم کر باپ سے چپکے  
ہوئے تھے۔ آمنہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی  
تھیں..... قریب آنے لگے تو اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔  
جہاں آرا اس طرف بھاگو..... اور جہاں آرا کو کچھ  
نہ سوجھا تو دائیں طرف چودھری صاحب کے گھر کے کھلے  
گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی..... کمال سینے میں بھینچا ہوا  
تھا۔ کہاں جا رہی تھیں۔ مارے خوف کے دل پھڑ پھڑا رہا  
تھا۔ چادر اڑی جا رہی تھی..... چودھری صاحب کے کھلے  
گیٹ کے اندر کوئی دکھائی نہ دیا..... وہ دروازے کے  
پیچھے چھپ کر جھری میں سے دیکھنے لگیں۔ کہ ابھی اسلام  
دین آمنہ اور جمال کو لیکر آجائیں گے۔ وہ تو بے یارو  
مددگار لرزتی ناگوں کمال کو اندر چھپائے دھک دھک  
کرتے دل کھڑی تھیں۔ کہ سامنے کے منظر نے انہیں ہلا  
کے رکھ دیا۔ اسلام دین نے آمنہ کی طرف بڑھتے قدم  
دیکھ کر بلوائیوں سے کوئی اچھی امید نہ رکھی اور.....

اگلے ہی لمحے انہوں نے بائیں جانب بنے اندھے  
کنویں میں اپنی لخت جگر کو اٹھا کر پھینک دیا۔ اک معصوم  
چیچ.....  
او یہ تو نے کیا، کیا..... تب ان میں سے ایک نے  
اسلام دین کی گردن پر وار کیا اور انہیں موت کے گھاٹ  
اتار کر شہادت کا رتبہ دے ڈالا اور جمال کے سینے پر  
کرپان اتار کر اسے بھی شہداء میں داخل کر دیا۔

بہن نیک بخت سامان کی فکر چھوڑ..... بچوں کو  
سنجھال اور نکلنے کی کر..... اسلام دین نے آج صبح ہی  
اسے کہہ دیا تھا۔ تب وہ ضروری سامان باندھنے لگی۔ کیا  
لے جائیں اور کیا چھوڑیں..... بھرپرا گھر قیمتی چیزیں بھی  
تھیں اور..... انہوں نے کچھ کپڑے زور..... اور کھانے  
کا سامان رکھا کہ دو چہر کے بعد پھل مچ گئی۔ اسلام دین  
نے تینوں بچوں کو سنبھالا..... جہاں آرا نے ٹھڑی اٹھائی  
اور گھر سے باہر نکلے پڑے..... کہاں جانا ہے کچھ پتہ  
نہیں..... بس جان بچانی ہے۔ سسکیاں لیتی..... رونی  
آنکھوں گھر پہ نگاہ ڈالی..... ہر چیز جو کی توں پڑی تھی۔  
بس کھانے کا کھوڑا سا سامان ساتھ تھا یا خدا کی مدد.....

بے سرو سامانی کے عالم میں چل پڑے.....  
کہاں جاتے..... چیچ و پکار تھی..... لہو کی ندیاں

جہاں آرا کی آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ کمال گود سے گرتا جا رہا تھا۔ اور آواز سینے میں دب کر رہ گئی۔  
ہر طرف..... لہو..... لاشیں..... سسکیاں، چیخ و پکار تھی۔

بہن جی..... آپاجی..... جلدی ادھر آ جاؤ.....  
پیچھے سے یکدم چوکیدار کی بیوی زرینہ کی آواز آئی..... ذری ہوئی کبھی ہوئی۔ اس کا لباس خون آلود تھا اور آنکھیں لہو رنگ۔

کہاں..... جہاں آرا نے کمال کو سینے سے لگاتے ہوئے کھٹی کھٹی آواز میں پوچھا..... وہ دیکھو زرینہ..... مولوی صاحب..... میری آمنہ اور جمال..... کیسے انہیں چھوڑ کر جاؤں.....

ہاں..... جانتی ہوں بی بی..... کس، کس کا نام لوگی سب شہید ہو گئے۔ آؤ کہیں میں اور تم بھی ان کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں۔

بے گور و کفن لاشیں آزادی کی قربانی دیتی نشانیاں..... دے پاؤں وہ کمال کو مضبوطی سے تھامے زرینہ کے پیچھے چلے لگیں۔

☆☆☆☆

وہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ شہید کی بیوہ..... آمنہ اور جمال دو معصوم بچوں کی ماں..... شہیدوں کی ماں..... اور شہید کا درجہ کیا تھا۔ وہ سب جانتی تھیں، پر جو غم تھا وہ پہاڑ برابر تھا۔ کہاں جانا تھا۔ کس کے پاس..... ٹھکانہ کہاں ملے گا..... پر خطر موت کا راستہ تھا۔ سب سے پہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی..... انہوں نے کمال کو اندر تک سمو لیا..... یہاں تک کہ شام ہو گئی..... بھوک پیاس..... تیل گاڑیاں اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی تھیں۔ لاہور کی جانب راستے میں خون آلود، کٹی پھٹی..... لاشیں..... کھلی آنکھوں آزادی کی داستان سنا رہی تھیں..... رات بھر سفر جاری رہا۔ خون کے سائے تلے۔ قدم قدم پر موت کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ مگر سب خاموش تھے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں وقفے

وقفے سے ارتعاش پیدا کر دیتیں۔ مائیں تھپک کر سلا دیتیں۔ یہاں تک کہ پو پھٹنے کا ناٹم ہو گیا بھوکے پیٹ سب نے روزہ رکھ لیا۔ آج ستائیسواں روزہ تھا۔

صبح ہو گئی۔ 14 اگست کی صبح، آزادی کی صبح، آزادی کا سورج طلوع ہو رہا تھا..... ہزاروں نے لہو کا خراج دیا تھا۔ تب کہیں جا کر یہ دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ وہ سب لاہور بارڈر پر پہنچ گئے تھے۔ خدا کی حفاظت کے ساتھ..... جو ساتھ نہ تھے۔ اب ان کی یادیں، ساتھ تھیں۔ پاکستانی سپاہیوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور کیمپوں میں لایا بیٹھایا۔

☆☆☆☆

کچھ دنوں بعد ایک سیٹھ صاحب آئے اور سب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مکان الاٹ کئے گئے..... خیر حضرات نے راشن..... برتن اور ضروری سامان فراہم کر دیا۔ جہاں آرا کو بھی تین کمرے کا کشادہ گھر مل گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔

زندگی کے دن گزرنے لگے..... کئی خدا ترس لوگ آتے اور کچھ نہ کچھ دے جاتے..... جہاں آرا نے سلائی مشین کا تقاضا کیا۔ کچھ دنوں تک وہ بھی مل گئی..... یوں وہ آس پاس کے لوگوں کے کپڑے سلائی کرنے لگیں۔

سویر، کر دشا، اور کڑھائی کا کام بھی ملنے لگا..... اور گزر بسر ہونے لگی۔ کچھ عرصے بعد سب کے حالات معمول پر آ گئے۔ سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ نئے حالات سے، ایک نئی منزل مل گئی تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ کمال پڑھتے پڑھتے ایم اے کر گیا..... جہاں آرا کی سکت ختم ہو رہی تھی..... ذہنی اور جسمانی ہمت کم ہونے لگی۔ کمال ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ خدا کے بعد یہی ماں تو تھی۔ جو اسے اپنے سینے میں چھپا کر یہاں تک لائی اور یہ مقام دلویا تھا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی اسے بہت اچھی نوکری مل گئی۔

☆☆☆☆

اب تیری شادی ہونی ہے۔ بس میں نے کہہ دیا..... کب سے ٹال مٹول کر رہا ہے۔ کمال کو اپنے پاس

کی بنی سفینہ پسند تھی۔ جہاں آرا خوشی خوشی رشتے لے کر گئیں۔ یوں سال بعد سفینہ دہن بن کر آگئی۔ اچھی لڑکی تھی۔ جہاں آرا بھی خلوص و محبت کا پیکر تھیں۔

آج گھر میں ملازمین تھے، پیسہ تھا، سکون تھا، مگر جہاں آرا کا دل پیاروں کی جدائی میں آج بھی روتا تھا۔ جہاں آرا دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھیں۔ پاکستان سے محبت دلوں سے مٹی جاری تھی لوگوں کی۔ کیا پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ آئے دن قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا جائے۔ وہ تو غیر مسلم تھے، جنہوں نے پاکستان جانے والوں سے انتقام لیا۔ یہ کون ہیں؟ جو آپس میں ہی دست و گریباں ہیں۔ حکمران سب کچھ دیکھتے ہوئے نگاہیں چرائے بیٹھے تھے۔ کون سی کرپشن تھی جو پاکستان میں نہ ہو رہی تھی۔ ماضی کی داستان غم سناتے سناتے جہاں آرا کی بوڑھی آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی تیز تر ہو گئی۔

بس کریں بڑی اماں..... بس کریں.....

فواد نے سر ہٹا لیا..... سدرہ الگ ادا اس صورت بنائے بیٹھی تھی۔ وہ اٹھی اور جہاں آرا کے گلے لگ کر رونے لگی۔ فضا میں عجب اداسی اور بو جھل پن پھیل گیا۔ سفینہ اندر آئیں تو حیران رہ گئیں۔ خاموشی سے آ کر ایک جانب بیٹھ گئیں۔

تب فواد اور سدرہ جہاں آرا کو ان کے کمرے میں لے آئے۔ وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا..... وہ انتہائی لاغر اور کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔

بڑی اماں ہم کتنی غفلت میں ہیں۔ پلیز ہمیں معاف کر دیں۔ آج آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ہم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ جان سکیں..... ہمیں تو بس موج مستی ہلے گلے کی پڑی رہتی ہے۔ ملکی چیزوں کو مستر کرنا ہمارا مشغلہ بن چکا ہے۔ اپنی ثقافت کا مذاق اڑانا ہمارے لئے باعث دلچسپی ہے۔ یہ بتاتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم پاکستانی مصنوعات استعمال

کرتے ہیں۔ غیر ملکی اشیاء پر فخر کرنا ہمارے لئے غرور کا باعث ہے۔ خود پر دوسروں کے پہناوے ہمیں خوشی دیتے ہیں، دوسروں کی تقلید کرتے کرتے ہیں، پاکستان کی اقدار کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔

فواد بولتے بولتے بھرائی آواز میں خاموش ہو گیا۔ جاؤ بچوں آرام کرو..... تمہارا قصور نہیں..... جیسا دیں ویسا بھی، میں ذرا ستا لوں..... وہ کمر سیدھی کرتے ہوئے بولیں۔

بڑی اماں کل سے اگست کا مہینہ شروع ہو رہا ہے۔ ہم بھی اس بار اپنے گھر کو سجاائیں گے جھنڈوں اور جھنڈیوں سے۔ سدرہ کی آواز میں جوش مبادا تھا۔ جہاں آرا مسکرا دیں۔

آنے والے دنوں میں جہاں آرا کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ کمزوری، بڑھاپا، عمر کا تقاضا، ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ کبھی جی جان سے ان کی خدمت کر رہے تھے۔ مگر خدا کے حکم کے سامنے کس کی مجال ٹھہری ہے۔

سدرہ، فواد نے گھر کے ملازمین کے ساتھ مل کر گھر کو آرائشی قہقروں اور جھنڈے، جھنڈیوں سے سجایا۔

☆☆.....☆☆

آج 14 اگست تھا۔ جہاں آرا کی روح صبح ہونے سے قبل ہی نفسِ عضری سے پرواز کر گئی تھی..... جب ملازمہ نے صبح انہیں بیدار نہ پایا..... تو بھاگتی ہوئی آئی اور روتے ہوئے سب کو آگاہ کیا۔ سدرہ اور فواد کے اشک نہ ٹھہم رہے تھے۔

گویا۔ انہوں نے آج 14 اگست کے دن جان سپرد آفرین کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس دن کی لاج رکھ گئیں۔ ان لوگوں میں شامل ہو گئیں جنہوں نے اس دن پاکستان کے حصول کے لئے جان قربان کی..... تاکہ سب 14 اگست کو انہیں بھی یاد رکھیں۔

سوئی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد  
قدم ، قدم آباد تھے، قدم قدم آباد تھے

☆☆.....☆☆

## ناسور

ایم۔ اے راحت

ان گنت اجڑے خواب جو کوئی کسی کو نہیں سنا تا۔ انا کے مقبروں میں  
مدفون زندہ لاشیں جو خود پرستی کا شکار ہو کر زندگی کی ہر خوشی گنوا دیتی ہیں۔  
ان کے زندہ مزاروں پر نہ چراغ جلتے ہیں نہ گل پاشی ہوتی ہے۔ ایسے  
ہی دو کرداروں کی داستان جن میں ایک انا کی قبر میں دفن رہا اور دوسرا  
وقت کے باریک تاروں پر زندگی کا خوبصورت سفر طے کر گیا۔

ایسی پراثر تحریر جو قارئین ریشم کو منتوں اپنے سحر میں جکڑے رکھے گی









## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

خورشید بیگم اپنے دو بیٹوں رفعت حسین اور طلعت حسین کے ہمراہ پھول گڑھی میں رہتی ہیں۔ بڑے بیٹے رفعت حسین کی شادی وہ بھانجی ندرت سے کر چکی ہیں۔ جب کہ چھوٹے بیٹے کی شادی دوسری بھانجی نگہت سے کرنا چاہتی ہیں۔ طلعت حسین اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کرتے لیکن ماں کے اصرار پر ہاں کر دیتے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد نگہت سے تعلقات کشیدہ رہتے ہیں اور کوئی اولاد بھی نہیں ہوتی چنانچہ طلعت حسین گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں اور وہاں دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ دوسری بیوی سے ان کی بیٹی منال پیدا ہوتی ہے مگر بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی رفعت حسین کے اصرار پر طلعت حسین منال کو لے کر پاکستان آ جاتے ہیں مگر نگہت کے ناروا سلوک کے باعث جلد ہی واپس جانا پڑتا ہے۔ منال جوان ہوتی ہے تو طلعت حسین کا بھار کر لیش ہو جاتا ہے۔ جب کہ تایا رفعت حسین بھی ایک حادثے کے باعث کوڑے میں چلے جاتے ہیں۔ اب منال تنہا رہ جاتی ہے اپنی دادی خورشید بیگم کے پاس پاکستان جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسی دوران خورشید بیگم کے ایک عزیز حمید اللہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مل کر ان کے کاروبار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور انہیں چاہتے کہ منال واپس آئے چنانچہ وہ اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اسے پاکستان پہنچنے ہی انکار دیا کہ ایک کنھڑ میں قید کروا دیتے ہیں جہاں سے منال جنات کے ایک خاندان کی مدد سے نکل کر پھول گڑھی پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

حمید اللہ کے دونوں بیٹے رفعت حسین اور طلعت حسین کی دولت پر بچے گاڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ سازشوں کے جال بچھا دیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف خورشید بیگم کے ہمدرد حامد علی ان لوگوں کی مدد کے لئے سرگرم ہیں وہ اپنی بیٹی کے دیور عادل شاہ کو ہاؤس کیپر بنا کر رفعت حسین کی کوٹھی میں بھیج دیتے ہیں۔ عادل شاہ بے حد ذہین اور نو جوان پولیس آفیسر ہے جو یہاں آ کر ان لوگوں کی سازشوں کا سراغ لگا رہا ہے۔ وہ بڑی ذہانت سے اپنے جال پھیلاتا ہے اور رفعت حسین کو ہسپتال سے غائب کر کے ایک محفوظ جگہ پہنچا دیتا ہے۔ حمید اللہ کا سازشی بیٹا جمال منال کو اغواء کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اپنے ایک دوست فرہاد سے کسی ایسی جگہ کے بارے میں بات کرتا ہے جہاں منال کو قید رکھا جا سکے۔ فرہاد اپنے ایک فارم ہاؤس کے بارے میں بتاتا ہے جو آسپ زوہ ہے۔ جمال منال کو اغواء کر کے اس آسپ زوہ فارم ہاؤس میں رکھنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ یہ لوگ رفعت حسین کی گمشدگی سے پریشان ہیں اور اس صدمہ میں وہ سب خورشید بیگم کے پاس جاتے ہیں۔

حمید اللہ خاندان نے خورشید بیگم کو رفعت حسین کے ہسپتال سے گمشدگی کی اطلاع دی تو خورشید بیگم نے اداکاری کرتے ہوئے حیرت اور غم کا اظہار کیا نگہت اور ندرت بھی برگشتہ ہو گئیں اور جمال نے منال کو چالاکی سے اغواء کر کے فارم ہاؤس پہنچا دیا جہاں منال کو انتہائی بھیا یک واقعات سے واسطہ پڑا۔ یہاں اسے ایک خوفناک عورت ناگ وٹی ملی جس نے چالاکی سے منال کے جسم پر قبضہ کر لیا، اس نے بتایا کہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ پھر وہ منال کو آسپ زوہ گھر سے نکال لائی اور اس کا چہرہ بدل کر اسے ایک شریف مسلمان گھرانے میں بیٹھا دیا جہاں اسے عظمیٰ کے نام سے مخاطب کیا گیا۔ بد نصیب منال آسپی جال میں پھنس گئی تھی اس وقت اسے جن زادے سمنان کی مدد بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سمنان کو اس کے باپ نے قید کر دیا تھا۔ اس شریف گھرانے میں ایک نئی کہانی کا آغاز ہو گیا جس کے بارے میں جاننے کے لئے آگے پڑھیے۔



نیلے رنگ کی مرسیڈیز بینز کے ڈرائیور نے گھبرا کر بریک لگائے اور برابر بیٹھا ہوا قوی بیکل ملازم، ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی پردقاری عورت چونک پڑی۔

تقریباً اٹھائیس، انتیس سال کی حسین و جمیل عورت، کچھ لمحے قبل آنکھیں بند کئے مرسیڈیز کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مرسیڈیز کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ اپنے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہلکورے تک نہیں دیتی۔ اس طرح زمین پر تیرتی ہے کہ پانی پر بھی سکون سے نہ تیرا جا سکے۔ لیکن بریک لگانے کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ پیچھے بیٹھی ہوئی حسین عورت کے دونوں ہاتھ سیٹ سے جاٹکے اور اس نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔

پھر اس کی ریسکی آواز ابھری۔

”کیا بات ہے غیثت کیا ہو گیا ہے، خیر تو ہے؟“

”ایکسیڈنٹ میڈم!! ایکسیڈنٹ۔“ ڈرائیور کے حلق سے بھرائی ہوئی سی آواز نکلی۔ برابر بیٹھا ہوا ملازم نما آدمی جلدی

سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا تھا۔ وہ بدحواسی میں ادھر دوڑتا چلا گیا تھا۔ جہاں سے ایک کار ڈھلوان میں جا گری تھی۔ کار کا ایک ٹائر تو ڈھلوان ہی میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔ لیکن دوسرا سڑک کے پتھوں و بچ پڑا ہوا تھا۔ خوبصورت عورت بھی اپنی سمت کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ تو وہ ڈرائیور جس کا نام غیاث لیا گیا تھا۔ اپنے ساتھی کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ جو آگے بڑھ کر اس جگہ پہنچ گیا تھا۔ جہاں سے کوئی کار ڈھلوان میں جا گری تھی۔

کار کافی گہرائی میں گری تھی اور اب دھڑا دھڑا جل رہی تھی۔ پٹرول ٹینک نے پھٹ کر آگ پکڑ لی تھی اور پوری کار شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ چند لمحوں کے بعد عورت بھی قریب پہنچ گئی اور ڈھلوان میں جھانکنے لگی۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔

”اوہ، میرے خدا..... نجانے کار میں کتنے انسان تھے۔ ارے ذرا تم لوگ نیچے تو جا کر دیکھو..... ذرا احتیاط سے..... بشیر کیا کھڑا منہ دیکھ رہا ہے۔ غیاث کے ساتھ نیچے جا۔ آہ، کاش کوئی زندہ بچ گیا ہو..... ارے، ارے وہ دیکھ..... وہ ایک انسانی جسم آہ، شاید یہ کار کے دروازے سے نکل کر گر پڑا ہے۔ دیکھ ذرا جلدی سے دیکھ۔ بزدل ہو، تم دونوں۔ نیچے جاتے ہو یا میں دھکا دوں۔“ اس بار عورت کے لہجے میں ناگواری پیدا ہو گئی۔

مرسیڈیز بنیز کا ڈرائیور اس قوی ہیکل آدمی کے ساتھ پھونک پھونک کر نیچے قدم رکھنے لگا۔ حالانکہ ڈھلوان ایسے خطرناک نہیں تھے۔ جن پر پیدل نہ اتر جائے۔ لیکن وہ لوگ بڑی احتیاط برت رہے تھے۔ دونوں اس انسانی جسم کے پاس پہنچ گئے۔ جو ایک طرف بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور بدن پر بھی لاتعداد خراشیں تھیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ ڈرائیور غیاث نے بشیر سے کہا۔

”تو ذرا..... نیچے جا کر گاڑی میں دیکھ اگر کوئی زندہ بچا ہو تو اسے کھینچ کر باہر نکال۔“

”اور اگر ٹینک پھٹ گیا تو.....؟“

”کوئی بات نہیں تو بھی پھٹ جائے گا۔“ ڈرائیور نے اس خوفناک ماحول کے باوجود کسی قدر پر مزاح لہجے میں کہا اور قوی ہیکل آدمی اسے گھورتا ہوا نیچے اترنے لگا..... ادھر ڈرائیور اس زخمی جسم کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ ایک خوبصورت سا خوشنما نوجوان تھا۔ جس کا لباس بھی بہت نفیس تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے جب کار ڈھلوان میں گر رہی تھی۔ تو وہ جدوجہد کر کے کار کا دروازہ کھول کر نیچے گر پڑا ہوگا۔ لیکن پتھروں اور چٹانوں سے ٹکرا کر شدید زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ زندگی سے محروم ہو جائے اور اس کا احساس فوراً ہی ڈرائیور غیاث کو ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی چیخ چیخ کر اوپر منہ اٹھا کر آوازیں لگائیں۔

”زندہ ہے میڈم جی! زندہ ہے۔“

”تو، تو اسے اٹھا کر اوپر کیوں نہیں لے آتے۔“ اوپر سے عورت کی چیخ سنائی دی۔ جو اس وقت بھی اپنی نفیسی نہیں کھوسکی تھی۔ ڈرائیور نے اس نوجوان کو اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ تصور ہی اس کے لئے جان لیوا تھا۔ کہ اتنے اونچے ڈھلان پر اس وزنی جسم کو لے کر چڑھے گا۔ ادھر بشیر گاڑی میں جھانک کر کچھ بولتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ غیاث کے پاس پہنچ گیا۔

”گاڑی خالی ہے۔ یہ اکیلا ہی اس میں تھا۔“

”اٹھا یا بشیر اسے اٹھا۔ میری عزت رکھ لے۔ تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

”اسے اٹھانے میں تیری عزت رکھی جاسکتی ہے۔“

”ابے میں کہتا ہوں اسے اٹھا۔ یادوں دو چار گالیاں۔“

”اوں..... تو تو ہے ہی سدا کا نکما۔“ بشر نے کہا اور اپنی مضبوط جسامت سے کام لیتے ہوئے۔ بے ہوش نوجوان کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ غیاث کے تو شاید فرشتے بھی اتنے وزنی جسم کو اٹھا کر اوپر نہ چڑھ پاتے۔ لیکن بشر کو شاید قدرت نے اسی وقت کے لئے اتنی قوت عطا کی تھی۔ وہ اوپر پہنچا تو اس کے سانس میں ہلکی سی تیزی تھی اور بس۔“

ادھر نوجوان عورت۔ ان دونوں کی کارروائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر افسوس کے آثار تھے اور اس نے چیختی آواز میں کہا۔“

”زندہ ہے ناں.....؟“

”ہاں..... میڈم جی!“

”تو منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اسے کسی سیٹ پر لٹا دے۔“ عورت نے کہا اور بشر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ غیاث نے فوراً ہی پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ عورت رحم آمیز نگاہوں سے نوجوان کے زخمی جسم کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک ہی اس کی نگاہ نوجوان کے چہرے پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک تیز چیخ نکل گئی۔

”عارض..... عارض..... یہ تم ہو عارض۔ ارے بھٹو! دیکھ کیا رہے ہو۔ یہ عارض ہے جلدی کرو او..... بشر گاڑی میں بیٹھ غیاث میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جلدی سے ڈرائیونگ سنبھال، اوہ، میرے خدا۔ عارض..... میرے عارض..... تو آگے جا بکھٹ۔ تو آگے جا۔“ عورت انتہائی بے چینی کے عالم میں بولی۔

”یہ الفاظ اس نے بشر سے کہے تھے۔ بشر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ابھی تو اس نے اسے پیچھے بیٹھنے کو کہا تھا۔ اور اب آگے جانے کو کیوں کہہ رہی تھی۔“

تب اس نے دیکھا کہ عورت خود دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور اس نے زخمی نوجوان کا خون میں ڈوبا ہوا سر، اپنے زانوں پر رکھ لیا۔

”چلو..... چلو..... جلدی کرو..... سیدھے کلینک چلو۔“ عورت نے کہا اور بشر جلدی سے غیاث کے پاس بیٹھ گیا۔

غیاث نے کار اشارت کر کے آگے بڑھادی۔ عورت زخمی شخص کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”ہائے، عارض..... ہائے عارض..... ہائے بھی تو اس حال میں۔ ہائے تمہارا کیا حال ہے۔ ارے، ارے..... کوئی کپڑا، کوئی کپڑا۔“ عورت نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ انتہائی خوبصورت لباس میں ملبوس تھی۔

انتہائی قیمتی لباس تھا اس کا۔ لیکن دوپٹے والا لباس نہیں تھا۔ اسی وقت بشر نے اپنے کندھے پر پڑا ہوا رومال جوتھوڑا سا خون میں ڈوب گیا تھا۔ اتار کر پیچھے کیا اور عورت نے جلدی سے رومال لے لیا۔ اس نے وہ رومال زخمی نوجوان کی پیشانی پر کس دیا تھا اور پھر ہولے ہولے اس کے رخسار کو سہلاتی ہوئی آہستہ آہستہ بولے جارہی تھی۔

”آ نکھیں کھول دے عارض! آنکھیں کھول دے۔ میں نہ کہتی تھی سب پاگل تھے..... سارے کے سارے پاگل تھے۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ تم دیکھ لینا۔ ایک دن مجھے خبر ملے گی کہ میرا عارض زندہ ہے۔ وہ واپس آ جائے گا۔ میں تمہیں بچے بنا دوں۔ ارے بھٹو! سن رہے ہو میری آواز..... دیکھو! میرا عارض واپس آ گیا ہے ناں.....؟“

”جی..... جی میڈم جی!“

”تو چل..... جلدی، چل..... جی، جی کے بچے، گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتا۔“

”میڈم جی، ایک سوئس کی اسپید ہے۔“

”فل اسپید پر چلا گاڑی۔ فل اسپید پر۔“

”جج..... جی..... جی میڈم جی۔“ غیاث نے کہا اور تھوڑی سی رفتار اور تیز کر دی۔ حالانکہ مرسیڈیز تھی۔ اسے

سنبھالنا مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن گاڑی تیز دوڑانا بھی دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ غیاث پھر بھی اپنی اوقات بھر گاڑی کی

رفتار تیز کر رہا تھا۔ اور عورت مسلسل عارض، عارض کہے جا رہی تھی۔ کبھی اس کے سینے پر ہاتھ کر اس کی دھڑکنوں کا جائزہ لیتی۔ کبھی اس کے بازوؤں کو ٹوٹتی اور اس کے جسم پر لگی ہوئی ہر خراش کو جیسے اپنے دل پر محسوس کرتی تھی۔

اس کے منہ سے بڑبڑاہٹیں نکل رہی تھیں۔ ”ہائے کتنا خون بہہ گیا ہائے..... بچانے کتنا خون بہہ گیا۔ اے پازینو تھا اس کا خون۔ دینا پڑے گا۔ تم لوگوں کو معلوم ہے۔ میرا خون بھی اے پازینو ہے۔ جیسے وہ جنون کے عالم میں بول رہی تھی..... اور وہ دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مرسیڈز شہر میں داخل ہو گئی اور پھر مختلف راستے بدلتی ہوئی آخر کار ایک بہت ہی خوبصورت کلینک کے سامنے رک گئی۔

جنرل کلینک تھا۔ بڑی خوبصورتی سے بنایا گیا تھا۔ پورچ میں جا کر کارر کی تو کچھ اور ملازم دوڑ پڑے جن میں دو نرسیں اور دو آئی میں تھیں۔“

”اسٹریچر..... اسٹریچر.....“ عورت نے چیخ کر کہا اور ایک وارڈ بوائے جلدی سے واپس دوڑا اور وہ ایک اسٹریچر لے آیا اور پھر بڑے اہتمام کے ساتھ نوجوان کو اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ عورت تیز تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

”آپریشن روم..... آپریشن روم میں لے آؤ.....“ آپریشن روم میں لانے کے بعد نرسیوں نے اس کی مدد شروع کر دی اور عورت۔ جس نے اپرن پہن لیا تھا اور ڈاکٹر معلوم ہو رہی تھی۔ نوجوان پر جھک گئی۔ سب سے پہلے اس نے نوجوان کے دل کی دھڑکنیں چک کیں۔ پھر اس کے سر کے زخموں کا جائزہ لینے لگی اور اس کے بعد نرسیوں کو مختلف ہدایات دینے لگی۔ کئی انجکشن دیئے گئے اور پھر بلڈ منگوا لیا گیا۔ بلڈ کی بوتل لگائی گئی۔ سر کے زخموں پر بینڈیج کی گئی اسٹینچک کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی شاید۔ اس نے چیک کر لیا تھا۔ اور کافی دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ نرسیں اور دوسرے لوگ اس کی محویت دیکھ رہے تھے۔ غالباً ابھی تک کسی نے کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ زخمی ہونے والا نوجوان اس نوجوان ڈاکٹر کے لئے کوئی بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مسلسل اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ ایک بار ایک نرس کسی مریض کے بارے میں اسے بتانے آئی۔ اس نے کہا۔

”ڈاکٹر زریا..... بیڈ نمبر ستہ کامریض شاید کچھ تکلیف محسوس کر رہا ہے۔“

”اسے انجکشن دے دو، پین کلر لگا دو..... میں ابھی مصروف ہوں۔ نہیں دیکھ سکتی اسے بلکہ ایسا کرو..... ڈاکٹر سدرہ سے کہو وہ اسے چیک کرے۔ ڈاکٹر سدرہ موجود ہے ناں؟“

”جی میڈم موجود ہے۔“ نرس نے کہا اور واپس چلی گئی۔ کافی دیر کے بعد نوجوان کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ تو ڈاکٹر کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے نوجوان کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”عارض.....“

اور نوجوان نے آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

مولوی حیات ناظمہ بیگم اور حیدر علی کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئے۔ دونوں میاں بیوی سخت متحس تھے اور مولوی حیات خود کافی الجھے الجھے نظر آ رہے تھے۔

”کوئی آ تو نہیں جائے گا۔ دروازہ بند کر دیں۔“ مولوی حیات نے حیدر علی سے کہا اور حیدر علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

”آپ کیا فرما رہے ہیں مولوی صاحب!“

”ہاں..... وہ عظمیٰ نہیں ہے۔“

”لیکن مولوی صاحب!“

”بات کرتے ہوئے مجھے بھی بہت عجیب سا لگ رہا ہے اور میں اس طرح کا کوئی انکشاف کر کے سنسنی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ عظمیٰ نہیں ہے۔“

”تو پھر کون ہے؟“ نادرہ بیگم نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”معلوم کرنا پڑے گا۔ نادرہ بیگم۔ یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ لیکن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ وہ عظمیٰ نہیں ہے۔“

”کوئی..... جرائم پیشہ لڑکی؟“

”شاید..... نہیں۔“

”تو پھر اس نے عظمیٰ کا روپ کیسے دھارا ہے۔“

”ذرا سی الجھن ہے میرے دل میں، علم ہو جائے گا مجھے لیکن ذرا سا وقت لگے گا۔ میں کچھ عملیات کروں گا۔ اس کے بعد پتہ چلے گا کہ کیا قصہ ہے۔“

”آپ نے ہمیں بڑی الجھنوں کا شکار کر دیا ہے۔ یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ شہزاد علی نے روز اول سے عظمیٰ کو قبول نہیں کیا ہے۔ ہمارے کہنے سننے سے اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ لیکن اس نے کبھی عظمیٰ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ وہ تو بڑی صابر و شاکر لڑکی ہے کہ آج تک زبان سے اف نہیں کیا۔ کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب آپ بہت عجیب بات کہہ رہے ہیں کہ وہ عظمیٰ ہے ہی نہیں۔“

”اگر آپ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں شہیا گیا ہوں اور میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے تو براہ کرم کہہ لیجئے۔ مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن جہاں تک میرا علم کہتا ہے وہ عظمیٰ نہیں ہے اور وہ جو کچھ ہے۔ معلوم ہو جائے گا۔ براہ کرم میں ذرا اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو۔“

”ہاں..... ہاں..... مولوی صاحب! ٹھیک ہے۔ آپ اگر اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے جائیے۔“

مولوی حیات اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے تو حیدر علی اور نادرہ بیگم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

”یہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں حیدر علی؟“

”خدا ہی جانے۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہے نادرہ! کہ برسوں سے ہم مولوی حیات کو جانتے ہیں اللہ نے انہیں علم دیا ہے۔ ان کے ساتھ کچھ برے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ اب پتہ نہیں کیا صورتحال ہے۔ وہ کسی کو کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہیں۔ لیکن ان کے کہے ہوئے جو الفاظ ہوتے ہیں۔ وہ درست ہی نکلتے ہیں۔ بڑی عجیب بات کہی ہے انہوں نے۔“

”اب مجھے وہ عجیب نہیں لگ رہی۔“ نادرہ بیگم نے پراسرار لہجے میں کہا اور حیدر علی ان کی طرف دیکھنے لگے پھر بولے۔

”کیا کہنا چاہتی ہو.....؟“

”خدا کی قسم اس کے انداز و اطوار بالکل ہی مختلف ہیں۔ اتنے عرصے سے گھر میں ہے۔ اگر کسی کام کے لئے نکلتی ہے تو اس طرح بھٹکی بھٹکی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی اجنبی وجود ہو اور پہلی بار گھر کو دیکھ رہا ہو اور پھر..... اس کا سارا انداز بڑا عجیب ہے۔ بڑا ہی عجیب۔ طور طریقے بھی ذرا مختلف ہیں۔“

”اگر وہ عظمیٰ نہیں ہے تو پھر کون ہے کیا عظمیٰ کے میک اپ میں کوئی لڑکی.....؟“ حیدر علی نے پر خیال انداز میں کہا۔

”مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں وہ کوئی جرائم پیشہ لڑکی نہ ہو اور کسی خاص مقصد کے تحت چہرہ بدل کر یہاں نہ آئی ہو۔“

”مولوی حیات صاحب! اس بات کی تردید کرتے ہیں۔“ حیدر علی نے کہا۔

”تو پھر آخر ہے کون؟“

”اب جو کوئی بھی ہے۔ ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔“

”خدا کی قسم مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ آج کل خواتین بھی ڈاکو ہوتی ہیں۔ زمانہ ترقی کی طرف دوڑ رہا ہے۔ سارے کام خواتین کرنا چاہتی ہیں۔ مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں اور کر بھی رہی ہیں۔ کرکٹ وہ کھیلیں، ہاکی وہ کھیلیں، فٹ بال وہ کھیلیں۔“

”تم کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کی باتیں کر رہی ہو۔ وہ جہاز اڑا رہی ہیں۔ راکٹ اڑا رہی ہیں۔“

”ارے بابا! ان کا جودل چاہے اڑائیں۔ بجی ہمارے گھر کا سارا مال نہ اڑا دیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ پولیس کو اطلاع دے دو۔۔۔۔۔“

”پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو۔ کیا کہو گی تم اس سے۔“

”ارے دیکھ لے گی۔ چہرہ امونی سے دھلوا کر دیکھ لے گی کہ اس کا چہرہ اصلی ہے یا نقلی۔۔۔۔۔“

”اور اگر اتفاق سے وہ اصل نکل آئی تو۔۔۔۔۔؟“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”میرا مطلب ہے غلطی کی کوئی مشکل۔۔۔۔۔“

”تو پھر کیا کریں گے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ بھی نہیں۔ خاموش رہیں گے۔ میرا دماغ مت خراب کرو۔“ حیدر علی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی طاری رہی تھی۔ پھر نادرہ بیگم نے کہا۔

”پتہ نہیں مولوی حیات صاحب! دوسرا انکشاف کب کریں گے۔“

”پتہ نہیں۔“

”اب ایک کام تو تم کر لو۔ حیدر علی۔ اس کی نگرانی سخت کر دو۔“

”اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تم ایک کام کرو۔۔۔۔۔ میں، رشیدہ کو بلائے لیتا ہوں۔ رشیدہ سے کہا جائے گا کہ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کرے۔ رشیدہ بہت تیز اور چالاک ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ تم ایسا ہی کرو۔۔۔۔۔“

رشیدہ پہلے ان کے گھر میں کام کرتی تھی۔ اس کے بعد اس کے اپنے کچھ مسائل تھے۔ جن کی بناء پر وہ چلی گئی تھی۔ لیکن اس گھر کی نمک خوار تھی۔ بہت ہی تیز اور چالاک عورت تھی۔

”میں خود چلا جاتا ہوں۔“

”جائیں۔۔۔۔۔ جائیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔“ حیدر علی صاحب چلے گئے تھوڑی دیر بعد ایک شاطری عورت کے

ساتھ واپس آ گئے۔ انہوں نے رشیدہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ رشیدہ نے نادرہ بیگم کو سلام کیا اور بولی۔

”بیگم صاحب جی! بڑی مہربانی ہے۔ آپ لوگوں کی کہ جب بھی آپ کو کبھی ضرورت پڑتی ہے مجھے ہی بلا لیتے

ہیں۔ حکم کریں کیا بات ہے کیا۔۔۔۔۔ اللہ خبر کرے عظمیٰ بیگم کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔“

”تیرا سر بھاری ہو گیا ہے۔ ہمیشہ فضول باتیں کرتی ہے۔ میں تجھ سے ایک اہم کام لینا چاہتی ہوں۔“

”بیگم صاحب جی! ہم تو پیدا ہی کاموں کے لئے ہوئے ہیں۔ حکم کریں۔“ رشیدہ چرب زبانی سے بولی۔  
 ”دیکھ رشیدہ! تجھے پتہ ہے آج کل حالات کیسے ہیں۔ طرح طرح کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ جرائم پیشہ لوگ بھی  
 بہت ذہین ہو گئے ہیں۔ ایسے ایسے گراختیار کرتے ہیں کہ بندے کی سمجھ ہی میں کچھ نہ آئے اور وہ آنکھوں سے سرمہ  
 نکال لے جاتیں۔“

”سو تو ہے بیگم جی! کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟“

”اب تجھ سے کیا بات چھپانا۔ مولوی حیات صاحب آئے ہوئے ہیں۔“

”ہائے..... اللہ مولوی حیات صاحب کو تو میں جانتی ہوں۔ پہلے تو انہوں نے کبھی چوری چکاری نہیں کی۔“  
 ”رشیدہ! میں تیرے منہ پر تھپڑ مار دوں گی۔ تو جانتی ہے کہ ہم لوگ مولوی حیات صاحب کی کتنی عزت کرتے  
 ہیں۔“ نادرہ بیگم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”یہی تو کہوں بیگم صاحب! پھر کیا بات ہے۔ اگر وہ آئے ہوئے ہیں تو آپ کیوں اتنی پریشان ہیں۔“

”ارے بے وقوف! اگر تو کوئی بات سنے تو میں تجھے آگے بتاؤں۔“

”سن رہی ہوں بیگم جی، سن رہی ہوں۔ اب چپ رہوں گی۔“ رشیدہ نے کہا۔  
 نادرہ بیگم کچھ دیر تک خاموش رہیں پھر بولیں۔ ”بات بڑی عجیب سی ہے۔ تجھے بھی حیرت ہوگی۔ ہماری بہو عظمیٰ کو  
 تو تو جانتی ہے ناں.....؟“

”لو..... یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ رشیدہ نے کہا۔

”پھر بولی، سچ میں۔“

”چپ ہوں جی چپ، آپ ہی نے تو سوال کیا تھا۔“

”عظمیٰ بدل گئی ہے۔“

”کیا مطلب بیگم صاحب! آج کل لڑکیاں کسی کی ہوتی کب ہیں۔ بہو بن کر آتی ہیں شروع، شروع میں وفا  
 داری کا رنگ دکھاتی ہیں اور اس کے بعد بدل ہی جاتی ہیں۔“

”جو عورت عظمیٰ کے روپ میں یہاں موجود ہے۔ وہ عظمیٰ نہیں ہے۔“ نادرہ بیگم نے کہا اور رشیدہ ان کے الفاظ  
 سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی۔

”تو پھر کون ہے.....؟“

”کوئی جال ساز..... کوئی فریبی۔“

”ہائے میرے مولا..... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”اسی لئے تجھے بلایا ہے کہ تجھے عظمیٰ پر نظر رکھنی ہے۔“

”مگر یہ ہوا کیسے.....؟“

”جیسے بھی ہوا..... میں تجھے بتا دوں یہ انکشاف مولوی حیات علی نے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عظمیٰ کے روپ میں  
 جو عورت یہاں موجود ہے۔ وہ اصل میں عظمیٰ نہیں ہے۔“

”آپ نے تو مجھے بھی ڈرا دیا بیگم صاحبہ!“

”اگر ڈر رہی ہے تو اپنے گھر جا۔ میں نے تجھے تیرا اجار ڈالنے کے لئے نہیں بلایا ہے۔“

”لو جی! امیر اجار بڑے گا بھی تو کون کھائے گا۔“ رشیدہ نے اپنی دانست میں مذاق کیا۔

”تجھے، دن رات عظمیٰ کی نگرانی کرنی ہے۔“



”رات کو سونے کو بھی نہیں ملے گا۔ بیگم صاحب!“

”رشیدہ ایک تو تو بکواس اتنی کرتی ہے کہ میں عاجز ہوں تجھ سے۔“

”نہیں بیگم صاحبہ جی! آپ کو پتہ ہے۔ سردیاں آنے والی ہیں۔ رضائیاں بنانی ہیں اور بھی کئی ایسے کام ہیں۔“

آپ ہی لوگ تو بائی باپ ہیں۔ بس میں نے آپ کے کانوں میں بات ڈال دی ہے۔“

”آگئی ناں کینٹینی پر۔ تیری ذات ہی ایسی ہے۔ میں نے جو کہا ہے۔ وہ سمجھ لیا ہے نا تو نے.....؟“

”آپ بالکل پرواہی نہ کرو بیگم صاحبہ جی۔“ رشیدہ نے کہا۔ حیدر علی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

منال سسک، سسک کر رو رہی تھی۔ آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ بہت سی یادیں دامن گیر تھیں۔ باپ یاد آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے صحیح طور سے بس باپ کو ہی دیکھا تھا۔ اسی سے اس کی زندگی کی تمام دلچسپیاں وابستہ تھیں۔ باپ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مشکل ترین حالات کا شکار ہو کر اپنے دیس واپس آئی۔ یہاں کی یادوں، کچھ مٹے مٹے نقوش ذہن پر چسپاں تھے۔

لیکن جو یادیں ماضی سے وابستہ تھیں۔ انہیں دادی اماں کے پیار نے دھو دیا تھا۔ دل پر کوئی نقش ایسا نہیں تھا۔ سوائے باپ کے جو مضرب کرتا۔ لیکن زندگی کی ساکن جھیل میں ایک ننھا سا پتھر سمنان کے نام سے آیا تھا۔ کچھ لہریں بنی تھیں اور معدوم ہو گئی تھیں۔ لیکن یادوں کی کسک، دل پر تھی۔ وقت نے ایسا چکر دیا کہ ساری یادیں نکل گئیں۔ ناگ وئی، ناگ بن کر اس طرح مسلط ہوئی کہ ہوش و حواس ہی گم ہو گئے اور اب عجیب و غریب زندگی گزر رہی تھی۔

وہ اپنے وجود میں ہی نہیں تھی۔ ناگ وئی کا خوف دل پر اس طرح مسلط تھا کہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مولوی حیات کے سامنے جا کر نہ جانے کیوں اسے یوں لگا تھا جیسے کسی مشفق اور مہربان شخصیت کا چہرہ اس کے سامنے ہو۔ دل نے بہت کچھ کہنا چاہا تھا۔ لیکن ناگ وئی کے خوف نے وہی کہلوا دیا جو ناگ وئی نے کہا تھا۔ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ آنکھوں کی دھندلاہٹ کچھ کم ہوئی اور سامنے کچھ نظر آیا۔ یہ ایک چراغ تھا۔ جس کی لولر رہی تھی۔ اسے یاد آ گیا۔ کہ ناگ وئی نے کسی چراغ کا حوالہ دیا تھا۔ اس کی نگاہیں چراغ پر جمی ہیں۔ تب اسے چراغ کی لواہیک مکر وہ چہرے میں تبدیل ہوتی محسوس ہوئی۔ یہ مکر وہ چہرہ ناگ وئی کا تھا۔ جو مسکرا رہی تھی۔

”میں تجھ سے بہت خوش ہوں لڑکی۔ تو نے وہی کیا جو میں نے تجھ سے کہا تھا۔ تو دیکھنا میں تجھے کتنی بڑی جگہ پہنچا دوں گی۔ بوڑھے حیات الدین کو ناگ وئی نے چھوڑ دیا تو میرا نام بھی ناگ وئی نہیں ہے۔ میں اس بوڑھے عامل کو تنگی کا ناچ نہ یاد دوں گی۔ اس نے ان لوگوں پر اپنا اثر قائم کیا ہوا ہے کہ تو عظمتی نہیں ہے۔ ارے سچ ہی تو کہتا ہے سر۔ کہاں ہے تو عظمتی اور عظمتی کہاں ہے۔ یہ میں تجھے بتائے دیتی ہوں۔ ابھی تو مجھے اس تک پہنچنا تھا۔ لیکن بات شے میں پڑ گئی ہے۔ اٹھ..... اپنی جگہ سے اٹھ..... اس کمرے سے باہر نکل کر سپیدھی گلی میں چلی جا..... آخر میں تجھے ایک دروازہ نظر آ جائے گا۔ اسے کھول کر اندر چلی جانا۔ میں تجھے وہاں مل جاؤں گی۔“ ناگ وئی نے کہا اور چراغ کی لوجھ گئی۔ پھر چراغ ہی گم ہو گیا۔ لیکن ناگ وئی کے الفاظ منال کے کانوں میں گونج رہے تھے اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے دماغ پر مکمل طور پر ناگ وئی کا قبضہ ہو.....

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ سپیدھاگلی نما کوریڈور اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ اس عمارت کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تھی۔ لیکن ناگ وئی جیسی جادوگرئی کے لئے کوئی بھی ماحول پیدا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ اس راہداری میں آگے بڑھتی ہوئی آخر کار اس دروازے پر پہنچ گئی۔ جس کا حوالہ ناگ وئی نے دیا تھا۔ بوسیدہ سا پرانے طرز کا دروازہ تھا۔ جس کا اس عمارت میں ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ

نظر آ رہا تھا۔ منال کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے دروازہ کھول لیا۔ اندر نیم تاریک ماحول تھا۔ اور اس نیم تاریک ماحول میں ایک انسانی سایہ نظر آ رہا تھا۔ جسے چند لمحوں میں منال نے پہچان لیا۔ وہ ناگ وتی ہی تھی۔ جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”حیات..... مولوی حیات کی کہانی تو ابھی باقی ہے۔ مگر ذرا اس کا منہ میں کالا کر دوں آ جا.....“ ناگ وتی نے کہا اور وہ دروازہ کھول دیا۔ جو سامنے ہی نظر آ رہا تھا..... دروازے کے دوسری طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس تیز روشنی میں۔ ایک انسانی جسم نظر آ رہا تھا۔ منال یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ وہ سوفی صدی اس کی ہم شکل لڑکی تھی۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہ لگی کہ وہ عظمیٰ ہے۔ اصل عظمیٰ..... وہ شاید گہری نیند سو رہی تھی۔ ناگ وتی نے کہا۔

”ہاں تیرا خیال ٹھیک ہے۔ یہ اصل عظمیٰ ہی ہے۔ اب میں تجھے بتا دوں کہ جب مجھے تیری مدد سے اس کھنڈر نما عمارت سے نکلنے کا موقع ملا۔ جہاں مجھے قید کر دیا گیا تھا۔ تو میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ حیدر علی اور اس کی بیوی نادہ کے بارے میں مجھے معلوم تھا۔ ان کے گھر کی کہانی بھی مجھے پتہ تھی۔ شہزاد علی حیدر علی کا بیٹا ہے۔ اور اس کی شادی زبردستی اس لڑکی سے کر دی گئی تھی۔ جس کا نام عظمیٰ ہے۔ پہلے ہی دن سے شہزاد علی نے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا اور اس سے نفرت کرتا رہا۔

میں جانتی تھی کہ مولوی حیات شہزاد علی یا حیدر علی کے گھر آتا جا تا رہتا ہے چنانچہ میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ تجھے عظمیٰ کی جگہ پہنچا دیا اور عظمیٰ کو اپنے اس جادوئی قید خانے میں لا کر قید کر دیا۔

مولوی حیات آیا اور اس نے ان لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب جتا دیا کہ تو عظمیٰ نہیں ہے۔ لیکن اب یہ لڑکی اصل جگہ لے لے گی اور عظمیٰ ہی ہوگی۔ کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ یہ عظمیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ اب تو اسے اٹھا اور اس کمرے میں پہنچا دے۔ میں اور نوئی الحال یہاں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ منال حیرت سے یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے غور سے عظمیٰ کو دیکھا۔ بڑی پیاری لگ رہی تھی وہ بالکل ویسا ہی لباس پہنے ہوئے تھی جیسا اس وقت منال کے جسم پر تھا۔

ناگ وتی کے اشارے پر منال آگے بڑھی اور اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ اس وزنی لڑکی کو اٹھا کر کیسے باہر لا سکتی ہے۔ ابھی ناگ وتی بولی۔

”اٹھا سکتی ہے تو..... کیونکہ تیرے شریر میں اس سے میری شکست ہے۔ چل اٹھا اسے۔“ منال نے جھک کر عظمیٰ کو اٹھایا تو اسے یوں لگا۔ جیسے وہ کاغذ کی بنی ہوئی ہو۔ بالکل ہلکی پھلکی..... مکمل طور پر بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ منال نے اسے اطمینان سے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور ناگ وتی اس سے آگے آگے چل کر راستہ بتانے لگی کچھ ہی لمحوں کے بعد منال اپنے کمرے میں تھی اور سامنے ہی مسہری پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے عظمیٰ کو مسہری پر لٹا دیا اور پھر اس سامنے پر نظریں جمادیں جو اس سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھا اور جو ناگ وتی ہی کا تھا۔

”اب میں واپس تیرے شریر میں آ رہی ہوں تجھے مولوی حیات کی آگے کی کہانی بھی سننی ہے۔ ان لوگوں کو یہیں رہنے دے۔ میں تیرے شریر میں آ رہی ہوں اور دوسرے ہی لمحے منال کو اپنا بدن بھاری محسوس ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی ناگ وتی کا شیطان وجود منال کے وجود میں سما گیا تھا۔

”آ جا..... اب یہاں ہماری ضرورت نہیں ہے۔ کوئی تجھے باہر نکلے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکے گا۔“ یہ کہہ کر ناگ وتی منال کے جسم میں آگے بڑھی اور کچھ لمحوں کے بعد وہ دونوں باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

”بولتے رہو..... بولتے رہو۔“

”نہیں بس..... حالانکہ وہ ہندو ہے۔ جبکہ میری بہن کا خیال تھا کہ میں اس میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا ہوں۔“  
 ”تمہارا اپنا خیال کیا تھا۔ اس کے بارے میں؟“ دردانہ نے پوچھا۔  
 ”میں تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ جو کہانیاں میں نے سنی ہیں۔ وہ بڑی سنسنی خیز ہیں۔“  
 ”کوئی خاص کہانی ہو تو مجھے بھی سناؤ۔“  
 ”بہت سی حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں..... دردانہ صاحبہ! کہ انہیں بتایا نہیں جاسکتا۔“  
 ”کیونکہ معاملہ ابو کے گہرے دوست بھیم چند کا ہے۔“  
 ”کچھ اور حقیقتیں بھی ہیں۔“

”ہاں.....“

”میں ہی نہیں..... بہت سے لوگ جانتے ہیں۔“

”بہت افسوس کی بات ہے کہ آپ لوگ اتنے اچھے انداز میں میرے ساتھ سلوک کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اصل والا مسئلہ جس کی وجہ سے میں یہاں آئی ہوں..... اس میں آپ لوگ مجھ سے تعاون نہیں کر رہے..... آپ یہ دیکھ لیجئے۔ راجیل صاحب! کہ مجھے یہ ساری معلومات حاصل نہ ہوں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آپ براہ کرم مجھے بتائیے..... کہ وہ ایسی کون سی بات ہے؟ کہ جو آپ مجھے بتاتے ہوئے پریشان ہو رہے ہیں۔“  
 ”بہت مختصر سی بات ہے..... دردانہ صاحبہ..... لیکن میری عزت آپ کو رکھنا ہوگی۔“  
 ”میں وعدہ کرتی ہوں۔“

”تو آپ یوں سمجھ لیجئے..... کہ شکر لعل کا خاندان ہندوؤں کی زبان میں بچ لوگوں کا خاندان ہے..... شکر لعل کے ماں باپ..... بھیم چند جی کے ہاں نوکرتھے..... شکر لعل خود بھی بچپن ہی سے بھیم چند کی حویلی کے دروازے پر رہا کرتا تھا لیکن محبت کسی کی جاگیر نہیں ہوتی..... اسے راگنی کماری سے محبت ہوگئی..... راگنی کماری بھی یہ سب کچھ بھول کر کہ وہ بچ ذات ہے کہ اونچ ذات..... اس سے محبت کرنے لگی..... یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی..... دردانہ صاحبہ! کہ قابل سزا ہوتی..... دونوں جوان ہو گئے..... لیکن پھر بھیم چند کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔“  
 ”یعنی راجیل صاحب! آپ کا کہنا ہے کہ راگنی بھی شکر لعل کو چاہتی تھی۔“  
 ”آپ خود سمجھتی ہیں..... ایسے معاملات یک طرفہ نہیں ہوتے۔“  
 ”تو پھر.....؟“

”بس اس کے بعد جب بھیم چند کو یہ بات معلوم ہوئی تو یوں سمجھ لیجئے کہ شکر لعل کے خاندان پر عذاب نازل ہو گیا..... اس خاندان کا ذریعہ معاش برسوں سے بھیم چند اور اس کے خاندان کی ملازمت تھا..... پہلی سزا کے طور پر بھیم چند نے شکر لعل کو اس کی ملازمت سے فارغ کر دیا۔ کوئی اور ذریعہ معاش ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ بھوکے مرنے لگے۔ پوری بستی کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس بچے کا خاندان کو نہ کوئی اپنے درمیان جگہ دے..... نہ نوکری..... اور نہ کھانے پینے کو دے..... چنانچہ شکر لعل کی ماں مر گئی۔“

”کچھ عرصہ کے بعد باپ مر گیا۔ پھر خاندان کے دوسرے لوگ باقی رہ گئے۔ خود شکر لعل کی حالت بھی بہت زیادہ خراب تھی..... بھیم چند نے جب اس سے یہ پوچھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے کہ وہ راگنی کو چاہتا ہے۔“ تو اس نے سچائی سے اقرار کر دیا۔ نتیجے میں اسے چار دن تک بھوکا پیاسا بھیم چند کے کمرے میں رہنا پڑا تھا اور جب بھیم چند نے محسوس کیا کہ وہ..... بھوک سے مر جائے گا اور اپنی ضد نہیں چھوڑے گا۔ تو اسے جوتے مار کر وہاں سے نکلوا دیا کہ ہمیں وہ ان کے گھر ہی میں نہ مر جائے..... نجانے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں.....“

بیچارہ شکر لعل اس کے بعد یہاں سے غائب ہو گیا۔ پھر اس نے کیا کیا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے..... واپس آیا..... تو وہ شیطان کے مقابلے میں شیطان بن چکا تھا۔ اب آپ خود ہی سوچیے..... دردانہ صلبہ! کہ یہ اونچی، نیچی ذات کیا ہوتی ہے۔

خیر اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے مذہب میں تو اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن بہر حال..... اس کے بعد شکر لعل نے بھیم چند کو صبح طور پر سنبھال رکھا ہے۔  
میرادل لرز کر رہ گیا تھا۔ جو بات میرے علم میں تھی۔ وہ ابھی تک ان لوگوں کے علم میں نہیں آئی تھی۔ بہر حال میں نے کہا۔

”راگنی کی اپنی کیا کیفیت ہے.....؟“

”نہیں۔ راگنی کا کردار خراب نہیں ہے..... بس..... وہ خاموش رہتی ہے..... کسی سے ملنا جلنا اور بات کرنا چھوڑ دیا..... اس نے..... بھیم چند سے بھی کوئی شکایت نہیں کرتی اور جو کچھ وہ کہتے ہیں کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سب دکھاوا ہے..... حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی شکر لعل کو چاہتی ہے۔“  
”کمال ہے۔“ دردانہ نے افسوس بھری آواز میں کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ کہانی واقعی عجیب اور دلچسپ تھی۔ اور دردانہ بری طرح الجھ گئی تھی۔ اسے شکر لعل یاد آ رہا تھا۔

بڑی عجیب و غریب صورتحال ہو گئی تھی..... راجیل تو یہ بات بتا کر چلا گیا۔ لیکن دردانہ کا ذہن سخت الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا..... معاملہ بہت عجیب و غریب تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے.....؟ اگر واقعی وہ لڑکی شکر لعل کے عشق میں گرفتار ہے۔ تو اب جلد اسے کون ٹھیک کر سکے گا..... شکر لعل تو اس دنیا سے چلا گیا تھا..... رہ گیا تھا۔ جسونت لعل..... تو وہ تو ویسے تھا..... دردانہ سوچنے لگی کہ اب اس مسئلے میں ٹانگ اڑانا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ دو محبت کرنے والوں کا معاملہ ہے..... بد قسمتی سے یہ معاملہ پہلے علم میں نہیں آیا۔ ورنہ وہ لازمی طور پر شکر لعل کو نقصان پہنچنے سے بچاتی۔ کیونکہ ساری صورتحال بہت عجیب و غریب تھی۔ پھر خاصا وقت گزر گیا۔ اور دردانہ یہ سمجھ نہ پائی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن بہر حال سارے معاملات کو اگر چھوڑ کر یہاں سے نکل بھی جاتی تو دقتوں کا سامنا تو کرنا پڑتا۔ کیونکہ باقی ساری زندگی بڑی مشکل ہو جاتی۔

یہ سب کچھ بہت میڑھا اور بہت پریشان کن تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ کیا نہ کریں..... دردانہ کے لئے یہ فیصلہ مشکل ترین فیصلہ ہو گیا تھا اور وہ سخت پریشان تھی۔ یہ انکشاف جو راجیل نے کیا تھا۔ اس کے لئے انتہائی دکھ بھرا بھی تھا اور بڑا ہی پریشان کن بھی۔ بہت دیر تک وہ سوچتی رہی اور آخر کار اس نے یہی فیصلہ کیا کہ تھوڑا سا اس بات کا یقین کر لے کہ راجیل نے جو داستان سنائی ہے۔ وہ سو فیصدی حقیقت پر مبنی ہے۔ یا اس میں بھی کوئی حاشیہ آرائی ہے اور اس کے لئے سیدی سیدی سی بات تھی کہ سلیم خان چچا کی حالت بہتر ہو جانے کا انتظار کرنا پڑتا..... بہر حال یہ انتظار کرنا تو ضروری تھا۔“

دردانہ جانتی تھی کہ سلیم خان چچا پر صرف گزرے ہوئے واقعات کی وحشت سوار ہے کوئی بیماری نہیں ہے۔ انہیں..... لیکن جس طرح رات کو جنگ ہوئی تھی اور صورتحال پیش آئی تھی وہ بڑی خوبصورت کیفیت کی حامل تھی..... اس کے بعد کسی عام انسان کے لئے ذہن پر قابو پانا تو واقعی ایک مشکل کام تھا۔ لیکن جس طرح سلیم خان چچا متاثر ہوئے تھے اسی طرح وہ ٹھیک بھی ہو گئے۔ دوپہر کو بخارا تر گیا تھا اور سلیم خان کی کیفیت بہتر ہو گئی تھی..... دردانہ کا شاید انہوں نے پوچھا تھا اور ستارہ نے دردانہ کو اس بات کی اطلاع دی تھی۔ سلیم خان کے پاس پہنچ کر دردانہ نے کہا۔  
”کیسی طبیعت ہے آپ کی.....؟“

”ٹھیک ہوں بیٹی۔“

”کیا ہو گیا تھا؟“

”تم جانتی ہو۔“

”لیکن آپ کو وہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سلیم چچا جو آپ نے کیا۔“

”یقین کرو گی دردانہ..... بیٹی تم سے کچھ ایسی طبیعت لگ گئی ہے کہ شاید تم اس پر یقین نہ کر پاؤ..... میں سمجھتا ہوں

کہ میرے دل میں تمہارے لئے اور ستارہ کے لئے ایک ہی جذبہ ہے۔ میں تمہیں اس سے الگ نہیں سمجھتا۔“

”مجھے یقین ہے سلیم چچا! آپ ایک نیک انسان ہیں..... بہت ہی اچھی شخصیت کے مالک۔“

”بس اگر تم کوئی نوجوان لڑکا ہو تو مجھے اس بات کی ذرا بھی پروا نہ ہوتی کہ تم کہاں جا رہی ہو..... لیکن نجانے

کیوں میرے دل کو ایک فرض کا احساس ہوتا ہے اور میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہیں کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“

”یہ آپ کی محبت ہے۔ لیکن آپ براہ کرم اپنے آپ کو سنبھالیے۔“

”میرا خیال ہے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“

”شام تک سلیم چچا واقعی ٹھیک ہو گئے..... دردانہ نے جو داستان سنی تھی۔ وہ اس کے دل میں انگارے کی طرح

دب کر رہی تھی..... ساری باتیں اپنی جگہ۔ اسے ایک جرم کا سا احساس ہو رہا تھا اور اب دل میں ایک حسرت ابھر رہی تھی

کہ کاش شکر لعل، جسونت پر حاوی ہو جاتا اور جسونت، شکر لعل کا وہ نہ کر پاتا جو اس نے کر ڈالا۔ حالانکہ دونوں کا لے علم

کے مالک تھے۔ دونوں ہی کے اندر شیطان حلول تھا۔

لیکن پھر بھی یہ حقیقت تھی کہ دونوں میں سے ایک قابل رحم تھا۔ یعنی شکر لعل..... جسونت کی تو خیر بات ہی مختلف

تھی۔ وہ مارا جاتا تو اسے خوشی ہوتی۔ اب بھی دل چاہ رہا تھا کہ جسونت کے لئے کوئی ایسا جال بچھاؤں کہ وہ زندہ نہ بچ

سکے۔ لیکن بات بھی چندی کی آرہی تھی..... بھیم چند جی نے یہ کیا کیا۔ دنیا کا ہر شخص مطلبی ہوتا ہے۔ اپنے مطلب کے

لئے وہ کسی کو غلط بیانی سے مجبور بھی کر سکتا ہے۔ یہ بات بہر حال باعث افسوس تھی۔ رات کے کھانے کے بعد دردانہ نے

سلیم خان سے کہا۔

”چچا..... اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا!..... سلیم خان نے کہا۔ چہرہ اتر گیا..... آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ لیکن یہ

شدید بخار کی وجہ سے تھا..... اب سلیم خان چچا کا بیٹا بہتر نظر آرہے تھے۔ اس نے ان سے کہا۔

”سلیم چچا..... مجھے آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔“

”بیٹا..... میں بھی تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو اس کے لئے آپ مجھے وقت دیجئے۔“

”تھوڑا سا وقت اور گزر جائے دو..... یہ سب لوگ آرام کرنے لیٹ جائیں۔ پھر اطمینان سے بیٹھیں گے۔ اور

باتیں کریں گے۔“ دردانہ خاموش ہو گئی۔ رات کو سلیم خان نے اسے خود مخاطب کیا تھا۔ کہنے لگے۔

”بیٹی دردانہ..... آؤ اوپر چھت پر بیٹھیں گے۔ چھت پر ماحول بے حد پر فضاء تھا۔ سلیم چچا نے کرسیاں ڈلوادی

تھیں۔ اس جگہ سے بھیم چند جی کی حویلی صاف نظر آتی تھی۔ دردانہ ادھر دیکھنے لگی۔ سلیم چچا کے چہرے پر سوچ کے

آثار تھے۔ دردانہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اچانک سلیم چچا چونک کر بولے۔

”ہاں..... بیٹی کیا کہنا چاہتی تھیں تم مجھ سے.....؟“

”سلیم چچا..... اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کیا کہنا چاہتے تھے..... آپ کہہ رہے

تھے ناں۔ کہ آپ مجھ سے کچھ باتیں کریں گے۔“

”ہاں..... وہ تو میں نے کہا تھا۔“

”تو پہلے آپ باتیں کیجئے۔“ سلیم خان مسکرا کر بولے۔

”اور اگر میں تم سے کہوں کہ تم پہلے مجھے بتاؤ۔“

”تو پھر میں آپ سے ضد کروں گی۔“ دردانہ بولی۔

”خدا تمہیں خوش رکھے..... بچوں کی ضد پوری کرنا تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے اور میں بہر حال تمہارا بڑا ہوں۔ اصل میں بیٹی..... دراصل بات بڑی عجیب سی ہو گئی ہے۔ تمہیں حیرت ہوگی..... مگر میں ڈرتا ہوں۔ کہ بہر حال بھیم چند جھہیں لیکر آیا تھا۔ تم ضرور اس کی بیٹی راگنی سے متاثر ہوگی۔“

”جی.....“

”ایک بات پوچھوں تم سے.....“

”جی پوچھیے؟“

”اگر میں تم سے کہوں بیٹی! میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہوں انہیں راز میں رکھنا تو کیا تم میری بات مان لوگی۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں..... سلیم چچا۔“

”مطلب؟“

”نہیں آپ مجھے بتائیے کہ میں آپ کی بات مان لوں گی یا نہیں۔“

”امید تو یہی ہے بیٹی۔“

”دیکھیے سلیم چچا بات اصل میں یہ ہے کہ میرا نام آپ کے علم میں ہے۔ مسلمان ہوں۔ متعصب بالکل نہیں ہوں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ کسی کو صرف اس لئے نظر انداز کر دوں کہ وہ ہندو ہے۔ مجھ پر اعتماد کیا گیا تھا۔ میں بس اسی اعتماد کے سہارے کام کر رہی تھی۔“

”ہاں..... پھر؟“

”نہیں..... آپ جو کہہ رہے تھے ناں کہ میں آپ کی بات کو راز میں رکھوں گی۔“

”ہاں..... بیٹی..... دل پر ایک گھاؤ سا لگ گیا ہے۔“

”گھاؤ.....؟“

”ہاں.....“

”کیسا گھاؤ.....؟“ سلیم چچا۔

”بڑی ہنسو گی تم میری بات پر۔ ممکن ہے حیران بھی ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں بتاؤں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ شکر لعل کی موت کا مجھے بہت افسوس ہے۔“ دردانہ چونک کر سلیم خان کو دیکھنے لگی پھر بولی۔

”وہ کا علم کا ماہر تھا۔“

”ہاں..... یہی تو اس کمبخت کی خرابی ہو گئی۔ وہ برائیوں پر آمادہ ہو گیا اور میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔“

”کیا وجہ ہے؟“

”بیٹی۔ جب انسان کا دل کالا ہوتا ہے ناں۔ تو پھر نیک اور بد کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ اس نے اپنے جنون میں جو کچھ کر ڈالا وہ تو ایک الگ بات تھی۔ لیکن نیکی اور بدی کا تصور کھو بیٹھا تھا وہ جبکہ اسے یہ تصور نہیں کھونا چاہیے تھا۔“

”جی، آپ کہتے رہے۔ کیونکہ آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔“  
 ”میں خود بھی اتنا الجھا ہوا ہوں کہ تمہیں اپنی بات سمجھاتے ہوئے مجھے ذرا سی مشکل پیش آرہی ہے۔“  
 ”آپ نے کہا تھا ناں کہ آپ کو اس کی موت کا افسوس ہوا ہے۔“  
 ”ہاں.....“

”وجہ بتانا پسند کریں گے آپ.....؟“  
 ”اس لئے کہ اس کا ماضی اتنا برا نہیں تھا۔“  
 ”وہ تو اسی بستی کا رہنے والا تھا ناں.....؟“  
 ”ہاں..... بالکل“

”اور اس نے اسی بستی کے لوگوں کو نقصان پہنچایا۔“  
 ”بہت بعد میں۔“

”بعد میں سے آپ کی کیا مراد ہے؟“  
 ”پہلے وہ اتنا برا نہیں تھا۔“  
 ”کیا ماضی تھا اس کا۔“

”وہ بھییم چند کی حویلی میں کام کرتا تھا۔ وہی نہیں بلکہ اس کے ماں باپ بھی۔ بھییم چند کی حویلی میں پرانے ملازم تھے۔“  
 ”جی آگے کہیے۔“

”بس بیٹی تم یوں سمجھ لو کہ انسان تھا اپنی کمزوری کا شکار ہو گیا۔ ہمارے ہاں تو اللہ کا احسان ہے۔ کہ اونچ نیچ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہر انسان، انسان ہوتا ہے۔ انسان کو انسان ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ایک بات ہے۔ ہندو دھرم میں یہ بڑی خراب بات ہے۔ وہاں ذاتوں کا فرق ہوتا ہے اور ذاتوں پر ایک دوسرے کو پرکھا جاتا ہے۔“  
 ”بالکل۔“

”بیٹی میں تو تمہارا ماضی بھی نہیں جانتا..... کاش میں تمہارے بارے میں کچھ زیادہ جانتا۔ بار، بار میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی ہے کہ پتہ تو چلے کہ کس کی اولاد ہو..... ماں باپ نے تم کو یہ سب کچھ سکھا کر تنہا کیوں چھوڑ دیا۔“  
 ”دردانہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے نمی سی اتر آئی۔ لیکن اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پھینکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔“

”چچا..... آپ تو میرا ہی انٹرویو کرنے بیٹھ گئے۔“  
 ”نہیں..... نہیں..... بالکل نہیں، میں تو اصل میں تمہیں بتا رہا تھا کہ شکر لعل اتنا برا نہیں تھا۔ بڑی اچھی شکل و صورت کا مالک تھا وہ..... مگر دیکھو کالے کام چہروں پر بھی ابھر آتے ہیں۔ کیسا بد شکل ہو گیا تھا وہ..... پہلے ایک خوبصورت سائلز کا تھا۔ بڑی پیاری سی شکل و صورت کا مالک یہ اسی دور کی بات ہے کہ وہ راگنی کماری سے محبت کرنے لگا۔“

”اوہ.....“ دردانہ آہستہ سے بولی۔  
 ”ہاں..... مگر وہ نیچ ذات کا ہندو تھا اور بھییم چند اونچی ذات کا مالک بھییم چند کو یہ بات معلوم ہو گئی..... بس اس کے بعد اس کے پورے خاندان کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ اس کے بارے میں..... میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“  
 ”ایک بات بتائیے سلیم چچا..... وہ آپ کا دوست ہے..... کیا آپ اسے نہیں سمجھا سکتے تھے کہ شکر لعل کے ساتھ ہی



سلوک نہ کرے۔“

سلیم خان حیرت سے دردانہ کو دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔

”ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تمہیں پہلے سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔“

”دیر سے مجھے یہ معلومات حاصل ہوئیں۔ سلیم چچا..... ورنہ شاید شکر لعل کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا۔“ دردانہ نے

افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو گیا؟“

”پھر بھی آپ مجھے بتائیے۔“

”بس جب اس کے ماما، پتا مر گئے..... خاندان والے بھی کچھ مر گئے..... کچھ بھاگ گئے..... بھینم پندنا وجہ سے

تو اس کے اندر بھی بغاوت ابھر آئی۔ اور وہ یہاں سے نکل گیا۔ اس نے کالے علوم سیکھے اور اگر..... کے بعد یہاں آ کر

دوبارہ آباد ہو گیا۔ پھر ساری باتیں ہوتی رہیں..... یہ سمجھ لو کہ وہ ہر ممکن کوشش کرتا رہا اور اس نے اپنے طور پر پھر بھی کوئی

زبردستی نہیں کی..... پوری بات اگر پوچھو..... تو میرے دل میں بڑی عجیب و غریب کہانیاں بسی ہوئی ہیں۔“

”کیا سلیم چچا.....“ دردانہ نے پوچھا۔

”بس یوں سمجھ لو کہ مجھے بڑا افسوس ہے۔ اس پر کہ وہ مارا گیا۔ مجھے بڑا ہی دکھ ہوا ہے۔ مگر میں کیا کرتا..... وہ بھی تو

میرا دوست ہے۔“

سلیم چچا ایک بات آپ بھی جانتے ہیں۔ کہ حق کا ساتھ ہمیشہ دینا چاہیے۔ ناحق کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

آپ سمجھ رہے ہیں ناں۔ ناحق تو بہت بری چیز ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”ارے بیٹا ہم کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ دوستی نبھارے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ جب تمہاری بات

نیچ میں آئی۔ تو ہم بھی اسی طرح اس میں مصروف ہو گئے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہو گا۔ دیکھا جائے گا..... بہت دیر تک دردانہ اور سلیم خان باتیں کرتے رہے..... دردانہ

کے ذہن میں بے چارہ شکر لعل آ رہا تھا۔ گناہ تو نہیں کیا تھا اس نے حقیقت اس پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ ممکن ہے قدرت

کی طرف سے شکر لعل کا اس دنیا میں رہنا مناسب نہ سمجھا گیا ہو اور اسے آخری منزل پر پہنچا دیا گیا ہو۔ رہ گیا جسونت تو

بہر حال قدرت کا انتقام بھی تو ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے جسونت، بھیم چند کے سلسلے میں شیطان ثابت ہو۔ اور بھیم چند جی

کے ان کرموں کا پھل جسونت کی شکل میں ملے۔ جہاں تک معاملہ راگنی کماری کا رہا۔ تو وہ لڑکی محبت کی ماری تھی۔

دردانہ اسے دیکھ چکی تھی۔ کچھ ایسی بدول ہوئی کہ وہ اسی رات تقریباً تین بجے اپنی جگہ سے اٹھی اور سلیم چچا کے گھر

سے باہر نکل آئی۔ ریلوے اسٹیشن کا راستہ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اب سب کچھ بیکار تھا۔

ایک بڑی سی چادر اوڑھ کر وہ اسٹیشن پہنچ گئی۔ اور پھر جو بھی ٹرین سامنے آئی۔ اس میں بیٹھ گئی۔ پیسے موجود تھے۔ اس

نے سوچا راستے میں ٹکٹ بنوا لے گی۔ چند ہی لمحوں کے بعد ٹرین نے اسٹیشن چھوڑ دیا تھا۔

ریل کی آواز اپنا ایک ردھم رکھتی ہے..... ماحول سنسان ہو..... قرب و جوار میں لوگ نیند میں مست نظر آ رہے

ہوں اور اس ردھم میں کوئی کہانی تلاش کی جائے تو یہ ردھم ہر کہانی الفاظ کی شکل میں بیان کر دیتا ہے۔ دردانہ کا دماغ نیند

میں ڈوبا ہوا تھا..... پلکیں بار بار جھپک رہی تھیں۔ لیکن دماغ میں ٹرین کا شور بسا ہوا تھا اور یہ شور اسے الفاظ کی شکل میں

سنائی دے رہا تھا۔“

”کہاں جاؤں گی؟“

”پتہ نہیں۔“

”کوئی منزل تو ہوگی۔“

”نہیں۔“

”وقت خود بخود منزل کا تعین کرتا ہے۔“

”تم کون ہو.....؟“

”بچانو۔“

”ابو.....“

”ہاں۔“

”ابو آپ کہاں ہیں.....؟“

”امتحان گاہ میں۔“

”مطلب“

”امتحان دے رہا ہوں۔“

”کیسا امتحان؟“

”ماں باپ سے اس کی اکلوتی اولاد چھین جائے اور وقت اس سے کہے کہ امتحان دو تو کیا اس سے کڑا امتحان کوئی اور ہو سکتا ہے۔“

”ابو میں کیا کروں؟“

”میں خوش ہوں۔“

”کس بات سے ابو؟“

”کہ تم میرے لئے ذریعہ امتحان بنی ہو..... بہت خوش نصیب ہوں میں کہ مجھے اس بڑے امتحان میں ڈالا گیا ہے ورنہ دنیا اپنی منزل سے گزر جاتی ہے۔ ماضی میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا..... بھائیوں نے جو بھی سلوک کیا..... وہ بھی امتحان تھا۔ لیکن وہ بہت چھوٹا سا امتحان تھا اور اس کے بعد میں نے اپنی منزل جس طرح پائی وہ میرے اللہ کا انعام تھا اور اب اس نے مجھے یہ سب کچھ دے کر ایک نئے امتحان کے لئے منتخب کیا..... میں تو بے حد خوش نصیب ہوں کہ وہ نیا امتحان بھی دے رہا ہوں۔“

”ابو میں کیا کروں؟“

”امتحان دو۔“

”کیسے؟“

”یہ بزرگی یہ مرتبہ کسی کو نہیں ملتا..... بہت مشکل سے کوئی اس مرتبے کے لئے منتخب ہوتا ہے..... تمہیں بڑے بڑے کاموں کے لئے منتخب کیا گیا..... تم نے دیکھا اس شیطان نے تمہیں برائیوں کے لئے منتخب کیا..... انتقام کے طور پر تمہیں اپنی بیٹی کے جسم میں داخل کر دیا۔ لیکن اپنے اندر کے دل کو دیکھو..... جس میں ”اللہ کی ذات“ بسی ہوئی ہے۔ برائیاں نہ قبول کر کے تم نے نیکیوں کی جانب قدم بڑھائے..... ارے بیٹی..... تم تو ہم لوگوں کے لئے جنت کی سڑک بنا رہی ہو..... یہ سڑک مکمل طور پر تعمیر کر دو..... تمہیں واپس آنا ہے۔ ہمارے پاس اور اس کے بعد ہم لوگ جو زندگی گزاریں گے وہ ناقابل یقین مسرتوں کی مالک ہوگی..... خبردار اپنے آپ کو مایوس نہ کرنا..... خوف زدہ نہ ہونا..... ہر مرحلے پر ثابت قدم رہنا..... یہی تمہاری جیت اور یہی ہماری آرزو ہے۔“

دردانہ چونک پڑی۔

یہ الفاظ اس کے اپنے تراشے ہوئے نہیں تھے..... نہ ہی اس کے ذہن نے یہ کہانی تیار کی تھی۔ یہ الفاظ ریل کے پہیوں سے نکلنے والی گڑ گڑا ہٹ سے تشکیل پا رہے تھے..... یہ الفاظ ہواؤں کے دوش پر بھی اس تک پہنچ سکتے تھے۔ یا آسمان میں ستاروں کی تحریر بھی بن سکتے تھے۔ لیکن جو ردھم اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے اس کے وجود کو منور کر دیا تھا۔ ایک انگوٹھی ہمت اس کے اندر بیدار ہو گئی تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے اچھی تو کوئی بات نہیں ہے۔

آہ..... یہ آوازیں وہم نہیں تھیں۔ یہ جو الفاظ اس کے لئے تراشے گئے تھے۔ وہ اس کے ذہن کی تراش نہیں تھی۔ وہ تو ایک سچائی تھی۔ وہ تو ایک سچائی تھی۔ ایک حقیقت تھی..... اسے ایک سوال کا جواب درکار تھا۔ اور اسے اس کی زندگی کے بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ بے شک بڑا سنسنی خیز تھا۔ لیکن اس نے اسے اپنے ذہن پر طاری ہونے نہیں دیا تھا۔ بلکہ علم و عمل کی دنیا میں نکل آئی تھی اور اب علم و عمل کی یہ دنیا اس کے لئے رہنمائی کا درجہ بن چکی تھی۔

بہت خوش ہو گئی تھی وہ اس سفر سے..... بہت خوش اور اب اسے کسی منزل کی فکر نہیں تھی۔ نہ ماحول کی..... وہ جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں اور علم و عمل کے راستے اس کے لئے متعین ہو رہے ہیں..... کہیں بھی چلی جائے..... کسی بھی جگہ مل جائے..... نہ اس کے وجود کو خطرہ ہے۔ نہ اس کی کم سنی اور نو خیزیت کو کوئی خطرہ ہے..... نہ اس کے حسن کو کوئی خطرہ ہے..... نہ اس کی عزت و آبرو کو کوئی خطرہ ہے۔ ناپیدہ نگاہیں اس کی محافظ ہیں۔ وہ ان ناپیدہ نگاہوں سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کر رہی تھی اور پھر نجانے کب نیند نے اس کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا۔

زیادہ دیر نہیں سوئی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ ٹرین کے پہیوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کا ردھم رک گیا تھا۔ سونے ہوئے ذہن میں تھوڑی سی تحریک ہوئی تو احساس ہوا کہ ٹرین رکی ہوئی ہے..... ایک جھوٹا سا ایشیون تھا..... شیشے سے باہر جھانکا تو اکا دکا افراد بھوت پریتوں کی طرح خاموش اور سنسان ماحول میں چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ٹرین میں کچھ لوگ جاگ گئے تھے..... کسی طرف سے آواز ابھری۔

”کیا ہوا ریل کیوں رک گئی؟“

”انجن خراب ہو گیا ہے..... دیکھ بھال ہو رہی ہے۔“

”کب تک ریل رکی رہے گی۔“

”اللہ بہتر جانتا ہے۔“

”اندرو تو بڑا جس ہو رہا ہے۔“

”نیچے اتریں۔“

”ہاں..... یہی مناسب ہے پھر آوازیں بند ہو گئیں۔ دردانہ کو صورتحال کا علم ہو گیا تھا..... اسے بھی گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھ گئی..... پھر وہ دروازے سے نیچے اتر گئی۔

سنسان ماحول میں ایک عجیب سا احساس رچا ہوا تھا..... وہ چند قدم آگے بڑھی تھی کہ اسے اپنے پیچھے تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اور پھر کوئی اس کے قریب پہنچ گیا۔

دردانہ کے دل سے اب خوف تو نکل ہی چکا تھا۔ وہ ایک دم رک گئی۔ آنے والا جب بالکل اس کے قریب آ گیا تو دردانہ نے اسے دیکھا..... ایک جوان اور خوش شکل آدمی تھا..... شلووار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی الجھن رچی ہوئی تھی۔

قریب پہنچ کر اس نے سلام کیا۔ کسی جوان مرد کا ایک ایسی عورت سے مخاطب ہونا جو ایک بڑی سی چادر میں لپی ہوئی ہو۔ اور جس کے چہرے سے کوئی احساس نہ ہوتا ہو کہ وہ کون ہے۔ کیا سوچ رہی ہے..... کہاں جا رہی ہے۔ کیوں اتری ہے؟“ ایسا مخاطب بڑی عجیب حیثیت کا حامل تھا۔

دردانہ نے سلام کا جواب دیا تو وہ بولا۔

”بڑی اماں..... آپ کا نام دردانہ ہے..... یہ بڑی سنسنی خیز بات تھی۔ لیکن اس سے پہلے والا جملہ بھی بڑی دلچسپی کا حامل تھا..... اس نو جوان نے جو دردانہ سے آٹھ دس سال ہی بڑا ہوگا..... دردانہ کو بڑی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ بہر حال دردانہ کو سوچنے کا بہت زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ وہ شخص پھر بولا۔

”بڑی اماں میرا نام جمال احمد ہے۔“ شاید آپ کے ذہن میں بھی میرا نام ہو..... یہ صرف میں اپنے اندازے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔

”کیا..... کہنا چاہتے ہو؟“

”بڑی اماں..... میں آپ ہی کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ آپ صرف مجھے ایک بات بتا دیجئے کہ کیا آپ کا نام دردانہ نہیں ہے؟“

”ہے.....“ دردانہ حیرت سے بولی۔

”دیکھئے..... بڑی اماں میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک اچانک نمودار ہونے والے درویش نے مجھے میری مشکلات کا حل بتایا تھا..... پچھلی ہی شام کی بات ہے۔ مغرب کے وقت اپنے گھر لوٹ رہا تھا..... پریشانیوں کا دل میں انبار تھا..... وہ درویش مجھے کالی ندی کے کنارے ملے۔ بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے..... ہاتھ اٹھا کر مجھے روکا اور کہنے لگے۔“

”صبح ہونے سے پہلے ریلوے اسٹیشن چلے جانا..... سورج جب کھل رہا ہو۔ اس وقت کی کہہ رہا ہوں۔ ایک ریل یہاں آ کر خراب ہو جائے گی..... لوگ اتریں گے لیکن، اس سے ایک خاتون بھی اتریں گی۔ جن کا نام دردانہ ہوگا..... ان کے پاس چلے جانا سلام کرنا..... نام لینا ان کا اور اپنی مشکل بتا دینا..... تمہارے ساتھ آ جائیں گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ تمہاری مشکلوں کا حل ہے۔ بڑی اماں آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں پوری رات یہاں گزار چکا ہوں۔ اس انتظار میں کہ ٹرین یہاں آ کر خراب ہو جائے۔ مسافر نیچے اتریں..... آپ بھی نیچے اتریں..... اور میں آپ کے پاس اپنی درخواست لے کر جاؤں۔“

دردانہ پریشانی کے عالم میں سوچنے لگی کہ کیا کرے کیا نہ کرے..... بڑی عجیب بات تھی۔ نو جوان آدمی جس نے اپنا نام جمال احمد بتایا تھا..... شکل و صورت سے ایک شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی جھلک بھی تھی۔ پھر کہانی اس نے جو کچھ بھی سنائی ہو۔ وہ الگ بات تھی لیکن اس نے دردانہ کو دردانہ ہی کے نام سے پکارا تھا اور کسی بزرگ کا حوالہ دیا تھا..... بات وہی تھی..... راہ حق میں قدم اٹھا دیئے تھے۔ تو خطرات کی پروا کرنا یا وسوسوں کا شکار رہنا بڑا عجیب تھا۔ ایک مسلمان سلام کرنے کے بعد اپنی مشکل بیان کر رہا ہے۔

بس اتنا کافی ہے۔ حیات الدین کی آواز کی رہنمائی نے دل اور کھول دیا تھا۔

چنانچہ دردانہ نے ایک لمحے کے اندر فیصلہ کیا کہ کسی خاص منزل کا تعین کر کے تو نکلی نہیں ہے۔ کہیں بھی جانا تھا۔ جہاں ٹرین رک جاتی۔ وہاں اترنا ہی تھا..... یہاں رک جائے تو کیا حرج ہے..... دیکھ تو لے کہ ایک مصیبت زدہ تجھ سے کیا چاہتا ہے۔ چنانچہ دل سے وہ اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ جمال احمد کے ساتھ چل پڑے۔ البتہ یہ خیال اس کے دل میں آیا تو اس نے پوچھا۔

”تمہارا نام جمال احمد ہے۔“

”ہاں..... بڑی اماں۔“ وہ بولا۔

”جمال احمد کیا تم مجھے ان درویش کا حلیہ بتا سکتے ہو؟“

”جی.....“ جمال احمد کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے ایک حلیہ دہرایا اور دردانہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

یہ حلیہ تو حیات الدین کا تھا۔ اس کے دل میں بے اختیار گولہ سا اٹھا۔

حیات الدین کی روحانیت کے بارے میں تو وہ جانتی ہی تھی۔ لیکن حیات الدین اب بھی اس کے لئے اس طرح سرگرم عمل ہیں۔ وہ اب بھی اس کے راستے صاف کرتے جا رہے ہیں۔ یہ احساس کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جمال احمد بیچارے نے اسے چادر میں لپیٹے ہوئے دیکھا تھا اور اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس لئے اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چادر میں لپیٹی ہوئی یہ عورت نو جوان عورت ہے یا بوڑھی خاتون.....

درویش نے اسے ایک ایسی خاتون کے بارے میں بتایا تھا جو اس بستی کے اسٹیشن پر اترے گی۔ اس بیچارے نے یہی سوچا ہوگا کہ وہ ایک عمر رسیدہ خاتون ہوگی۔ کیونکہ ایسے علوم جاننے والی کوئی نو جوان اور نوخیز لڑکی تو نہیں ہو سکتی۔ لیکن کسی درویش کے روپ میں آ کر اگر حیات الدین نے اسے اپنی بیٹی کے بارے میں بتایا تھا۔ تو یہ بہر حال ایک انوکھی بات تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل گداڑ بھی چنانچہ دردانہ نے کہا۔

”جمال احمد..... میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے بڑی اماں آئیے..... جمال احمد نے کہا اور دردانہ جمال احمد کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔

جمال احمد کو اس درویش کی بات پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے آگے کے انتظامات بھی کر رکھے تھے۔ چنانچہ ایک تانگہ تیار ملا..... تانگے کا کوچوان گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا..... جمال احمد باہر نکل کر اس کے قریب پہنچا تو کوچوان نے کہا۔

”آگے تمہارے مہمان جمال احمد؟“

”ہاں بابا..... نور خان۔“

”کوئی سامان وغیرہ ساتھ نہیں ہے۔“

”نہیں.....“

”بڑی حیرت کی بات ہے۔“

”حیرت کی بات نہیں۔ درویشوں اور بزرگوں کے ساتھ سامان کہاں ہوتا ہے۔ بابا..... نور خان۔“

”ہاں، ہاں یہ تو ٹھیک کہتے ہو تم۔“

”اتنا بوجھ ہوتا ہے۔ ان پر..... کہ یہ سامان اٹھایا نہیں جاتا۔“ جمال احمد نے کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے۔ بی بی صاحب بیٹھے۔“ بابا نور خان نے کہا۔

بابا نور خان کی گفتگو بڑی شگفتہ تھی۔ دردانہ نے اسے محسوس کیا۔ اور یہ اندازہ لگایا کہ وہ کوئی پڑھے لکھے آدمی ہیں..... ویسے علم کسی کی جاکیر نہیں ہوتا۔ وہ تانگے کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئی۔

بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ایک نو جوان اور نوخیز لڑکی اس طرح نہ صرف ماری ماری پھر رہی تھی۔ بلکہ نا دیدہ شخص اس کی تاک میں بھی تھے۔ اور وہ پورے اعتماد سے نئے نئے ہنگاموں میں ٹانگ اڑاتی پھر رہی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں

دردانہ کا تصور یہ تھا کہ وہ ایک سخت آزمائش میں ہے۔ ایک طرح سے ایک شیطان کے خلاف ہتھیار ہے جو کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور کوئی اسے استعمال کر رہا ہے۔ ہتھیار کا کیا بگڑتا ہے۔ کالے گایا ٹوٹ جائے گا اور بس..... اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ اس کا ایمان تھا اور اسی ایمان کے تحت انجینی لوگوں کے درمیان..... بڑے سے بڑے لوگوں کے درمیان گھس رہی تھی۔ اپنے آپ کو آزمایا ہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور تصور بھی اس کے دل میں تھا۔

بدن ناگ دتی کا ہے۔ روح اس کی اپنی ہے..... ناگ دتی کے جسم سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ بے جگری سے مشکل سے مشکل لمحات کا سامنا کر رہی تھی۔ لیکن یہ اعتماد بھی بڑھتا جا رہا تھا کہ بدن بے شک ناگ دتی کا سہی لیکن اس کی محافظت ہو رہی ہے اور کوئی گندی میلی نگاہ اس بدن کو انداز نہیں کر سکے گی۔

اس لئے وہ بے دھڑک تھی۔ چادر میں لپٹے ہوئے کی وجہ سے پیچھا جمال احمد جو شکل و صورت سے ایک پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا اور خاصا پر وقار بھی اسے بڑی اماں کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

جمال احمد تانگے والے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور تانگہ خاموشی سے سنان سڑکوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا..... بستی بے شک چھوٹی تھی۔ لیکن صاف شفاف تھی..... سڑکوں پر چھاڑ دی جا رہی تھی اور صبح کا سہانا منظر ماحول کی دلکشی میں ایک انوکھا اضافہ کر رہا تھا..... سفر بالآخر ایک جگہ ختم ہو گیا۔

جمال احمد نے اتر کر تانگے والے کو پیسے دیئے اور پھر پیچھے آکر بولا۔  
 ”بڑی اماں..... میں آپ کا بھائی ہوں یا بیٹا، جو بھی سمجھ جائے گا۔ آئیے میں آپ کو سہارا دے کر نیچے اتار دوں۔“  
 ”نہیں بھائی..... میں خود اتر جاؤں گی.....“ دردانہ نے کہا اور اطمینان سے نیچے اتر گئی۔ تانگے والا ذرا سا آگے بڑھا۔ تو جمال احمد نے ایک تپلی گلی کا رخ کیا اور بولا۔

”بڑی اماں میں آپ کو سیدھا اپنے گھر نہیں لے جا رہا۔ بلکہ اپنے دوست کے گھر لے جا رہا ہوں۔ جس کا نام ریاض خان ہے۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اس کی بیوی مرچلی ہے۔ چھوٹے بچے ہیں۔ والدہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پھر ہم راز ہے..... آپ کو بہن اور اور ماں ہی کا درجہ دے گا۔ اصل میں..... میں سیدھا آپ کو اپنے گھر اس لئے نہیں لے جا رہا کہ پہلے آپ کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دوں..... اس کے بعد آپ جو بھی فیصلہ کریں گی۔ وہ بہتر ہوگا۔“  
 ”کیا ریاض خان کو معلوم ہے کہ تم ریلوے اسٹیشن آئے ہو اور کسی کو لے کر اس کے گھر آ رہے ہو؟“

”ہاں..... سب کچھ بتا دیا ہے میں نے اسے۔ وہی میرا ایک گھر اور دوست ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“

تپلی گلی میں داخل ہونے کے بعد دردانہ اور جمال احمد ایک معمولی سے مکان کے دروازے پر رک گئے..... جمال احمد نے زنجیر بجائی۔ تو ریاض خان نے دروازہ کھولا اور پھر ریاض خان کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار پھیل گئے۔ لیکن کچھ بولے بغیر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اور جمال احمد نے بڑے ادب کے ساتھ دردانہ کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور بولا۔  
 ”آئیے بڑی اماں..... یہ میرا دوست ریاض خان ہے..... ریاض خان نے دردانہ کو سلام کیا تھا اور پھر بڑے احترام سے اندر لے گیا تھا۔ جہاں ایک بزرگ خاتون موجود تھیں..... دو بچے سو رہے تھے..... بزرگ خاتون بھی جاگ رہی تھیں۔ شاید نماز سے فارغ ہو میں تھیں۔ بڑے احترام سے بولیں۔“  
 ”آؤ..... بہن اندر آ جاؤ۔“

دردانہ نے ریاض خان اور اس کی والدہ کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے..... ریاض بھی ایک شریف صورت آدمی معلوم ہوتا تھا..... برا مدے کے تخت پر بیٹھ کر دردانہ بولی۔

”ہاں..... جمال احمد بھائی۔ اب آپ بتائیے۔ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟“ آپ مجھے یہاں لے کر آئے ہیں تو کم از کم یہ بات میں جانتی ہوں کہ ریاض خان بھائی آپ کے راز دار دوست ہوں گے۔ بتائیے مشکل کیا ہے؟“

”بی بی! ابھی تو آپ ہماری سہماں ہیں۔ اتنی دور سے سفر کر کے آئی ہیں۔ کچھ دیر آرام کریں۔“

”بڑی مہربانی۔“ دردانہ بولی۔

”کچھ چائے پانی ہو جائے..... ناشتے کا وقت ہے۔ غریب لوگ ہیں ہم۔ مگر تھوڑی سی خدمت کا موقع ضرور دیجئے گا۔ چلو تم دونوں باہر جاؤ..... ایک پردہ دار بی بی تمہارے سامنے چہرہ تو نہیں کھول سکتیں۔“

”بڑی اماں ہم دونوں آپ کے بچے ہیں۔ جس طرح یہ میری ماں ہیں۔ ہم آپ کا بھی احترام کریں گے۔ آپ کو ذرا برابر تکلیف نہیں ہوگی..... آؤ۔ اماں سچ کہہ رہی ہیں..... پہلے تھوڑی خاطر مدارت کر لی جائے۔ اماں میں ناشتہ لے کر آتا ہوں۔ آؤ۔ جمال احمد..... دونوں باہر نکل گئے..... دردانہ کدول میں ہنسی آ رہی تھی..... خوب بڑی اماں بنی تھی وہ۔ لیکن ابھی اس کا راز فاش ہونے والا تھا۔ جب وہ دونوں باہر چلے گئے تو ریاض خان کی والدہ کہنے لگیں۔“

”بہن اب آرام سے بیٹھو..... چہرے سے یہ چادر ہٹا دو..... یہاں کوئی مرد نہیں رہا۔“ دردانہ نے ہنستے ہوئے اپنا چہرہ کھولا تو عمر رسیدہ خاتون منہ پھاڑ کر رہ گئیں..... دیر تک کچھ نہ بول سکیں..... آگے بڑھیں اور حیرت سے دردانہ کا چہرہ دیکھا اور پھر انہوں نے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے میرے مولا! تم کون ہو بی بی؟“

”بڑی اماں۔“ دردانہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

”لو خدا کی نیکی۔ ارے تم بڑی اماں ہوئیں تو ہم دادی اماں کہلائیں گے۔ بلکہ پردادی اماں..... اے میں کہتی ہوں یہ جمال کا کیا دماغ پھر گیا ہے..... ارے چھوٹی سی بچی کو بڑی اماں۔ بڑی اماں کہے جا رہا ہے..... دردانہ کو خوب ہنسی آ رہی تھی۔ ہنسی رہی پھر بولی۔

”اب آپ بتائیے۔ میں آپ کو کیا کہوں؟“

”بی بی..... سچ سچ میں تو تمہاری ماں کیا دادی کے برابر ہوں..... ارے ابھی تمہاری عمر ہی کتنی سی ہے۔ مگر بی بی یہ قصہ کیا ہے..... بات میری سمجھ میں نہیں آتی..... ایک بات بتاؤ..... مجھے معاف کرنا..... بڑے اعتماد سے کہہ رہی ہوں۔ جمال احمد بالکل نیک بچہ ہے۔ اس کی کسی بات پر شبہ تو میں قیامت تک نہیں کر سکتی..... ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اسے..... پر بی بی تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے بتاؤ تو سبھی قصہ کیا ہوا ہے یہ۔

ارے تم تو چھوٹی سی ہو۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ کسی درویش نے کسی اللہ والی خاتون کی آمد کی خبر دی تھی اسے۔ اور اللہ نے چاہا تو اس کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ کوئی دھوکہ ہو گیا کیا اسے۔“

”کیا کہہ سکتی ہوں اماں بی! بس آپ سمجھ لیجئے کہ میں ریلوے اسٹیشن پر اتری۔ اور جمال بھائی مجھے بڑی اماں..... بڑی اماں کہہ کر یہاں تک لے آئے۔ کہنے لگے ان کی کوئی مشکل ہے جو میری وجہ سے دور ہو جائے گی۔“

اے بیٹیا! غلط فہمی ہو گئی ہے بے چارے کو..... حالات نے اتنا ستایا ہے اسے کہ دماغ گھوم کر رہ گیا ہے۔ ویسے میں پھر تمہیں یقین دلارہی ہوں کہ بڑا نیک بچہ ہے۔ اللہ اس کی مشکل دور کر دے..... کسی غلط فہمی میں آ گیا ہے۔ ویسے بی بی تم کہاں جا رہی تھیں۔ یہیں اترنا تھا کیا؟“

”اماں جی! آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میں بھی بس در بدر بھٹک رہی ہوں..... اپنے مشکل حالات سے گزر رہی ہوں..... آپ جیسے بزرگوں کے زیر سایہ آگئی ہوں..... ہو سکتا ہے۔ آپ کی دعا سے میری مشکل حل ہو جائے۔“

”لو بی بی! یہ تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔“ ارے واہ..... اس کے بعد عمر رسیدہ خاتون حیرت سے نگلیں تو انہوں نے بھی



خوب تہیجے لگائے..... دردانہ کو یہاں آ کر بہت اچھا لگا تھا۔

ایک دلچسپ غلط فہمی نے بہت ہی دلچسپ حالات پیدا کر دیئے تھے..... عمر رسیدہ خاتون بڑی خوش مزاج تھیں۔ وہ دردانہ سے اس کے حالات کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ اور دردانہ نے انہیں بتایا کہ بس اللہ کے نام کے ساتھ اسے ہدایت دی گئی ہیں کہ جس طرح بھی بن پڑے لوگوں کی مشکلات میں ان کا ساتھ دے اور وہ اپنا فرض پورا کر رہی ہے۔ غرضیکہ صورتحال اس شکل میں چلتی رہی..... کچھ دیر کے بعد جمال احمد اور ریاض خان آ گئے..... جلوہ پوری وغیرہ ساتھ لائے تھے۔ بڑی بی بی نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ ہنستی جاری تھیں اور انہوں نے بعد میں یہ کہا تھا کہ جمال احمد اور ریاض خان کو ابھی صورتحال نہیں بتائیں گے۔ لیکن ان کے چہرے پر شکستگی اور خوش مزاجی دیکھ کر ریاض خان نے کہا۔

”کیا بات ہے۔ اماں اپنی ہم عمر سے مل گئیں تو خوشی سے پھولے نہیں سار ہیں آپ۔ لیکن خیال رکھنا۔ اللہ والے لوگ مختلف ہوتے ہیں..... کسی بات پر بگڑ نہ جائیں۔“

”تم دونوں باہر جا کر ناشتہ کرو..... میں تمہاری بڑی اماں کے ساتھ ناشتہ کر رہی ہوں۔ وہ دونوں باہر نکل گئے..... دردانہ نے ناشتے میں تکلف نہیں کیا تھا۔ اللہ کا عطیہ تھا۔ اس کی رحمت سمجھ کر قبول کرنا تھا..... ہاں بس یہ دعا تھی۔ اس کے دل میں..... کہ ان کی مشکل کا حل دریافت کر لے۔ ناشتے کے دوران اس نے ریاض خان کی والدہ جن کا نام قدسیہ بیگم تھا۔ سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو قدسیہ بیگم کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔

”نہ بی بی نہ..... یہ امانت میں خیانت ہوگی۔ کیونکہ معاملہ جمال احمد کا ہے اور ایسا ہی ہے کہ تذکرہ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے..... میں بیچ میں نہیں پڑوں گی۔ بھیا!..... ساری باتیں۔ اللہ جانے اور وہ سب جانیں..... میں کچھ نہیں بتانے کی..... جمال ہی سب کچھ بتائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں جمال بھائی سے ہی پوچھ لوں گی.....“ دردانہ نے کہا۔ ناشتے سے فراغت ہوگئی تو جمال احمد نے کہا۔

”قدسیہ خالہ! میں ذرا گھر جا رہا ہوں..... دیکھوں ذرا فرحین کا کیا حال ہے۔“

”جاؤ..... تم آرام سے جاؤ..... تمہاری بڑی اماں میری مہمان ہیں۔ بے فکر ہو کر جاؤ.....“ جمال احمد دردانہ کے سامنے آ کر بولا۔

”بڑی اماں دوپہر تک کی اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی..... جب آپ میری مشکل حل کرنے کے لئے آئی ہیں تو یقینی طور پر مجھے وقت بھی دیں گی۔ اس کا صلہ میں تو آپ کو کیا دے سکوں گا۔ اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ جمال بھائی۔ آپ جائیے۔“

قدسیہ بیگم نے تو دردانہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن دردانہ بھی آرام کرنا چاہتی تھی..... جن واقعات سے گزر کر یہاں تک آئی تھی۔ اب اس کے بعد تھوڑا سا آرام کر لیتی تو اسے بھی سکون مل جاتا..... اس نے قدسیہ خالہ سے اس کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگیں۔

”خوشی سے..... خوشی سے بچے ابھی اٹھنے والے ہیں۔ انہیں تیار کر کے سکول بھیجوں گی۔ کیا کہوں نوجوان بہو ذمہ داریاں میرے سپرد کر کے اس دنیا سے چلی گئی۔“

”بہی میں آپ سے پوچھنے والی تھی۔ ریاض بھائی کی بیگم؟“

”کیا بتاؤں بیٹی..... سیرے بچے کی پیدائش میں دنیا چھوڑ گئیں..... بچہ بھی اللہ میاں کو پیارا ہو گیا..... تفصیل بیکار ہے..... ہم غریب لوگ ہیں۔ لیکن زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ بڑے

ہسپتالوں میں لے جاتے تو کیا موت واقع نہ ہوتی۔“

”جی“ دردانہ نے کہا اور پھر وہ ایک بستر پر لیٹ کر سو گئی۔

رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ ریل میں بھلا نیند کہاں آتی ہے۔ بس یونہی پلکیں جھپکی تھیں اور صبح کی روشنی نمودار ہو گئی تھی۔

چنانچہ اس وقت سوئی تو دو پہر کو بارہ بجے اٹھی..... بچے سکول جا چکے تھے۔ ایک لڑکا تھا۔ ایک لڑکی تھی..... بس اس

نے ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔ ریاض خان بھی شاید اپنے کام پر چلا گیا تھا..... دردانہ نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا.....  
”قدسیہ بیگم باورچی خانے میں مصروف تھیں..... منہ ہاتھ دھونے کے بعد دردانہ ان کے پاس چلی آئی۔“

”قدسیہ خالہ! آپ کے ساتھ باورچی خانے میں کام کروں گی۔“

”ارے بیٹی شرمندہ تو نہ کرو..... آج ہی تو مہمان آئی ہو..... بچی ہو میری مجھے تم سے کام کرانے میں کوئی عار نہیں

ہے پر ابھی کچھ نہ کرو۔“

”قدسیہ خالہ بہت عرصے سے میں نے ایسا ماحول نہیں دیکھا..... آپ کے ہاں آ کر بڑی اپنائیت محسوس ہو رہی

ہے۔ خدا کرے جمال بھائی کے کچھ کام آ جاؤں..... لیکن آپ کا گھر بھی مجھے اپنا گھر ہی محسوس ہوا ہے۔“

”لو پھر یہ تھوڑی سی پیاز کاٹ لو..... اگر شوق ہی پورا کرنا ہے تو کرو..... میں راستہ نہیں روک رہی۔“ بہت عرصے

بعد گھر جیسا ماحول ملا تھا۔ دردانہ کو..... پیاز کاٹتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جی بھر کے آنسو بہائے۔

قدسیہ خالہ بھی یہی سمجھیں کہ پیاز کے آنسو ہیں۔ لیکن اس کی آڑ میں دل کی ہمزاس نکل گئی تھی۔ کھانا تیار ہو

گیا..... بچے سکول سے آ گئے۔

دونوں بہت پیارے سے تھے۔ دردانہ کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ لیکن بہر حال یہ جذباتی باتیں ہوتی ہیں اور ان کے

بارے میں سوچنا بڑا عجیب لگتا ہے..... ریاض خان..... اور جمال احمد تو واپس نہیں آئے تھے۔ بچوں کے ساتھ کھانا کھایا

اور دردانہ ان بچوں سے باتیں کرتی رہی۔

دو بجے ہوں گے جب جمال احمد نے دروازے پر دستک دی اور قدسیہ خالہ نے کہا۔

”جمال احمد ہے۔ تم چہرہ ڈھک لو..... دردانہ نے دلچسپی کی خاطر اپنے چہرے پر پھر چادر اسی انداز میں لپیٹ لی

تھی۔ کہ اس کی صرف آنکھیں نظر آتی رہیں اور باقی چہرہ چھپ جائے..... اجازت ملنے پر جمال احمد اندر آ گیا.....

بڑے ادب سے قدسیہ خالہ اور دردانہ کو سلام کیا اور بولا۔

”بڑی اماں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔“

”ہاں..... آپ نے مجھے بہت اچھا ماحول مہیا کر دیا ہے۔ جمال بھائی۔“

”یہ میرا اپنا ہی گھر ہے۔ کھانا وغیرہ کھا لیا آپ نے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنی پیتا سنا دوں اور آپ سے درخواست کروں کہ اللہ کے نام پر میری مدد کیجئے گا۔ اللہ

نے آپ کو میرا مددگار بنایا ہے۔ میں آپ سے کچھ بات کہتے ہوئے کوئی جھگڑ محسوس نہیں کروں گا۔“

”کیوں نہیں.....“ دردانہ نے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔

یہ بات کیا کم تھی کہ جمال احمد کو حیات الدین نے دردانہ کے آنے کی خبر کی تھی..... روحانیت کا ایک طویل سلسلہ

جاری تھا اور دردانہ اس بوجھ سے سرشار تھی..... بہر حال اس کے بعد جمال احمد ایک مونڈھے پر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

اب وہ اپنی کہانی سنانے کے لئے تیار تھا۔

(باقی آئندہ)



# ساون کی پہلی بارش

مینا عالیہ

بعض اوقات زندگی بالکل ایسی آزمائشوں  
پر اتر آتی ہے جیسے کوئی کنارے پر بیٹھا کوئی شخص  
دھیرے دھیرے پتھر اٹھا کر ندی میں محض اس لئے  
پھینک رہا ہو کہ دائرے کیسے بنتے ہیں۔۔۔۔۔

انمول جذبوں سے گندمی ایک خوبصورت تحریر



قدم قدم پہ ہوئے تلخ تجربے پھر بھی  
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

اگست ..... 139 ..... 2011

ابی جان کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ ”پتر اب تم واپس آ جاؤ آخر کب تک پردیسی بنے رہو گے؟“

”پلیز ابی جان اب مجھے سی ایس ایس کی تیاری کرنی ہے۔ ایک ماہ بیشتر حسام علی کو اپنے دوست عمیر آغا کی مدد سے پنجاب کالج میں پیکچر ارکی جاب مل گئی تھی۔ انہوں نے جیوگرافی میں ماسٹرز میں فٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اب وہ قدرے مطمئن تھے۔ ابی جان کی روزانہ فون کالز سے نجات ملے گی۔ حسام علی کا تعلق ملتان کی ایک زمیندار فیملی سے تھا دو بھائی اور ایک بہن ان سے بڑی تھیں۔ شامل بھائی ابی جان کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ شاہد بھائی نے آری جوائن کر لی تھی حرا آپ کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ سب سے چھوٹے تھے۔

اس روز ابی جان کہہ رہے تھے حسام چند ہزار کی نوکری کے لئے اتنی دور پڑا ہے۔ اپنے شہر آ جاؤ یہاں کوئی ڈھنگ کی نوکری ڈھونڈ لو۔ ورنہ بھائی کے ساتھ زمینداری کرلو۔

”ابی جان لاہور میں رہ کر میں مزید پڑھوں گا۔ اپنے کیریئر کو بہت برائٹ بنانا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی گاؤں کا لائف سٹائل انہیں کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ وہاں کی وسیع و عریض حویلیاں قطار در قطار بڑے بڑے کمرے ان کے سامنے طویل غلام گردشیں اور برآمدے مردان خانے میں شکاری کتوں کی کولرنگی آرام گاہیں لڑنے والے دیسی مرغوں کے در بے جگہ جگہ ان کی خوراک تیار ہو رہی ہوتی۔ سفید کلف لگے لباس میں ملبوس اونچی پگوں والے مختلف علاقوں سے آئے بااثر صاحب ثروت و اختیار وڈیرے مرغوں، کتوں اور شکار کے متعلق بحثوں میں اچھے دکھائی دیتے۔“

تکیے لگائے بیٹھے سرداروں کے کامے پاؤں دبا رہے ہوتے یا تازہ چلمیں بھر کر ان کے سامنے رکھتے دکھائی دیتے۔

حسام علی بہت کم گاؤں جاتے تھے۔ مرحبا ناؤں میں انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ تاکہ ابی

جان بار بار گاؤں آنے کا تذکرہ نہ کریں۔ گھر کی بے منت ابی جان نے بخوشی کر دی تھی۔ حسام علی نے زندگی میں پہلی فرمائش ہی تو ان سے کی تھی۔

ان کے بچپن میں والدہ کا انتقام ہو گیا تھا۔ بڑے بہن بھائیوں نے انہیں بہت لاڈ سے پالا تھا۔

اس فرائی ڈے ان کی آنکھ دیر سے کھلی ہڑ بڑا کر بستر سے چھلانگ لگا کر نہایت سرعت سے ہنگر سے پیٹ شرت کھینچی اور واش روم کی طرف دوڑیں لگا میں۔ پیچڑ تیار ہو رہے تھے۔ آج انہیں جانا بھی جلدی تھا۔ تیزی سے ریزر چلاتے ہوئے کتنے کٹ ان کے چہرے پر آئے جلدی کے عالم میں انہیں تکلیف کا احساس ہی نہ ہوا۔ تیزی سے ضروری پیپر فائل میں لگاتے گیراج تک آئے باہر ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ہلکی پھوار اب موٹی تیز بوندوں کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

”صاحب ناشتہ تو کر لیں۔“ ملازم لڑکا طاہر کہہ رہا تھا۔

”تم جلدی سے گیٹ کھولو پہلے بہت لیٹ ہو چکا ہوں۔“ وہ گاڑی ہوا میں اڑاتے باہر نکال چکے تھے۔ بارش کی شدت میں لمحہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ ساون کی اس پہلی بارش نے گرمی کا زور قدرے توڑ دیا تھا۔ اطراف میں ایک محسوس کن تازگی اٹھ آئی تھی۔ سڑک کے کناروں سے انتہی گیلی مٹی کی مہک طبیعت میں خاصی تازگی بھر گئی تھی۔

بارش کی بوچھاڑ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ایک بھیگتا سا نفوس دکھائی دیا۔ چھوٹی سی چھتری بارش کی تیزی سے محفوظ رکھنے کے لئے ناکافی پڑھ چکی تھی۔ کندھے پر بیگ ڈالے بانہوں کے حصار میں کس کر فائل دابے اس کے قدم جس قدر ممکن تھا تیز ہو رہے تھے۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ شاید کسی رکشہ کی منتظر تھی۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے قدرے سڑک دیکھا۔ اس کے چہرے پر بارش کی بوندیں شبنم کے چھوٹے قطروں کی مانند احاطہ کئے تھیں۔ اس

## دوست

ہمارے مہجر مشتاق نامی لڑکے سے بہت چیزاں تھے۔ مشتاق کا کہنا یہ تھا کہ اسے جو بھی مضمون لکھنے کو کہتے ہیں۔ اس میں کہیں نہ کہیں ”میرا بہترین دوست“ ضرور لکھ کر دیتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ واحد مضمون تھا جو اس کو فریاد تھا۔ مثلاً اگر کہا جاتا کہ ریلوے اسٹیشن پر مضمون لکھو تو وہ کچھ یوں لکھتا کہ میں اور میرے ماں باپ بچوں کی لمباں جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن گئے۔ وہاں گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی میں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔ اگر اسے ”میرا استاد“ مضمون لکھنے کو کہتے تو وہ لکھتا کہ ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گیا وہاں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔ ظاہر ہے جب کرکٹ میچ یا پنک کی باری آتی تو وہاں بھی زاہد حسین موجود ہوتا۔ تنگ آ کر ماسٹر صاحب نے کہا کہ آج تم ہوائی جہاز پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ ہوائی جہاز میں زاہد حسین موجود نہیں ہے۔ دوسرے دن مشتاق نے جو مضمون لکھا وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ ”میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئر پورٹ گیا۔ وہاں جہاز کھڑا تھا۔ جہاز کے دو پر تھے، اس میں ہم بیٹھ گئے۔ جہاز میں زاہد حسین نہیں تھا پھر جہاز اڑنے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو زمین پر میرا بہترین دوست زاہد حسین جا رہا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔ ماسٹر صاحب نے مضمون پڑھ کر مولا بخش اٹھالیا اور مشتاق غریب کا جلوس نکال دیا۔ (انتخاب: شازیہ عابد، لاہور)

کے کپکپاتے لبوں کی شادابی پر گھبراہٹ حاوی ہو رہی تھی۔ چہرے پر شدید پریشانی عود رہی تھی۔ آگے جا کر جانے کیوں انہوں نے گاڑی ریورس کی اور اس کے نزدیک روک دی۔

”میں آپ کی ہیلپ کر سکتا ہوں؟“

”نو تھینک یو۔“ وہ پھر چلنے لگی۔

”خیرے جب تک دکھائیں نہ انہیں لڑکیاں کون

کہے۔“ بڑبڑائے۔

”یہاں سے مین روڈ بہت دور ہے۔“ اس کے

ساتھ ساتھ گاڑی بڑھا رہے تھے۔

”جانتی ہوں۔“ وہ اپنی ترنگ میں چلی جا رہی تھی۔

”پلیز“ انہوں نے دروازہ کھولا۔

اس نے توقف بعد ان کا جائزہ لیا وہ ٹھنکی باندھے

انہیں گھورتی رہی پھر یک بارگی چھتری بند کی اور فرنٹ

سیٹ پر بیٹھ گئی۔

انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اچانک اسے

اپنے بھیکے کپڑوں کا خیال آیا۔

”آئی ایم سوری میرے کپڑوں سے آپ کی سیٹ

خراب ہوئی۔“ انہوں نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش

دی بند ہونوں پر ایک دہی مسکان کا دباؤ مزید بڑھا۔

”مجھے مین پرا تا رہتے تھے۔“

”جانا کہاں ہے آپ کو؟“

”مجھے وہاں سے پوائنٹ مل جائے گا۔“ بنا جواب

دیئے بولی۔

”پوچھ رہا ہوں جاننا کہاں ہے؟“ انہوں نے اس

کی طرف دیکھا۔

وہ سائنو سی لڑکی تھی جس میں کوئی خاص اٹریکشن

نہیں تھی۔ پر چہرے کی معصومیت گفتگو کرتی دکھائی دی

اس کی گداز آنکھوں میں بے پناہ کشش موجود تھی۔ بھگی

پلکوں کے تلے اس کی آنکھیں گلابی ہو رہیں تھیں۔ جن

میں پھیلا کا جل اسے بہت دلکشی سے نواز گیا تھا۔ اس

کی آنکھوں میں بے پایاں چمک تھی۔ جس کی وجہ سے

وہ خاصی جذاب نظر دکھائی دے رہی تھی۔

چرچراہٹ سے وہ چونکی جھنجھلاہٹ سے پیشانی پر گہری  
تیوریاں کھینچ گئیں۔

”آئیے پلیز.....“

”نو تھینک یو.....“

”آپ یقیناً ”مرحبا ناؤن“ میں رہتیں ہیں؟ میں  
بھی وہیں رہتا ہوں۔ آئیے تکلف نہ کیجئے۔ وہ بنا جواب  
دیئے بیٹھ گئی۔ اتنی گرمی میں بس کا انتظار اور پھر روڈ پر  
اتر کر کافی سارا پیدل چلنا پڑتا تھا۔

دونوں نارسائی کے باوجود بار بار ایک دوسرے کی  
گوگلی ساعتوں کے ہمسفر بن رہے تھے۔

”کون سے بلاک میں رہتیں ہیں آپ؟“

”ایچ 16 فارٹی سکس“ اس کی رسی کھٹکتی آواز  
ان کے اطراف پھیلی۔

”کیا کمال کا اتفاق ہے میں بھی ایچ 16 فارٹی  
ون میں رہتا ہوں ہم ہمسائے ہوئے ناں جی۔“ اس

روز آپ خاصی ڈسٹرب لگ رہیں تھیں؟  
”اکی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔“

”اب کیسی ہیں؟“

”قدرے بہتر ہیں۔“

”آپ کے گھر میں اور کون کون رہتا ہے۔“ ہولہ  
بناتے خاموشی کے حصار میں مقید جود کو انہوں نے  
توڑا۔

”میں اور میری ماما۔“

”بس.....“

”ہوں ایک بھائی ہے جو بیوی بچوں کے ساتھ  
کراچی میں رہتے ہیں والد حیات نہیں ہیں۔“ انہوں  
نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔

”صبح میں آپ کو پک کر لوں گا۔“

”نہیں وہ تلخی سے ہلکی سی غراہٹ سے شپٹا کر  
بولی۔“

”محترمہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ میری  
ہمسائی ہیں اس اعتبار سے میرا فرض بنتا ہے۔ آپ کی  
ہیلپ کروں۔“ وہ جواب دیئے بغیر اپنے گیٹ کی

آپ مجھے یہی اتار دیں۔

”آپ ایسی بھی حسن بانو نہیں ہیں کہ میں آپ کو  
اغواء کر کے لے جاؤں گا۔ ممکن ہے میرے راستے میں  
ہی آپ کا مطلوبہ مقام آتا ہو۔“ اس وقت وہ پنجاب  
یونیورسٹی کے پہلے برج کے پاس سے گزر رہے تھے۔

”مجھے پنجاب کالج جانا ہے۔“

”واٹ..... میں پڑھاتا ہوں وہاں پر اور آپ  
یقیناً پڑھی ہوں گی وہاں۔“

”پڑھاتی ہوں۔“

”کیا پڑھاتی ہیں آپ؟“

”اردو“

”اتنا مشکل سبجیکٹ پڑھالیتی ہیں آپ۔“ اس

نے سر ہلایا۔

”اور آپ؟“

”جیوگرافی“

”اس قدر خشک سبجیکٹ آپ کیسے پڑھاتے  
ہیں؟“ دونوں مسکرائے۔

”مجھے یہیں اتار دیں سامنے میرا ڈیپارٹمنٹ  
ہے۔ تھینک یو۔“ یہ کہتے ہوئے اتر گئی۔ اور براؤن گیلے

مائیکلر پر تسنیل کر قدم جماتی آگے بڑھنے لگی۔ وہ اسے  
دور جاتے دیکھتے رہے۔ کتنے دنوں تک ان کی نگاہوں  
میں آنکھوں سے باتیں کرتی وہ پنک ڈریس میں بھیگی  
لڑکی دوپٹے کو ماتھے تک لپیٹے نازک اندام وہ سانولی  
شاموں جیسی سلونی لڑکی ٹھہری رہی۔

حسام علی کے کوئی خاص دوست نہیں تھے۔ کالج یا  
گھر کبھی کبھار ویک اینڈ پر ان کے تینوں دوست عمیر،  
میر عالی اور مدثر اعوان اس کے گھر آ جاتے۔ گپ شب  
رہتی۔ طاہر کے ہاتھ کی بنی بریانی اور شامی کباب کچ  
میں کھائے جاتے۔ وہ لوگ آکس کریم لے کر آتے اسی  
طرح بھی کے گھر کوئی نہ کوئی ویک اینڈ گزارا جاتا۔

اس روز جیسے ہی گاڑی گیٹ سے نکالی سامنے جاتی  
وہی لڑکی دکھائی دی۔ حسام علی نے اس کے قریب پہنچتے  
ہوئے زور سے گاڑی کو بریک لگائی۔ پیہوں کی

جانب بڑھنے لگی۔  
 اس صبح وہ اس کے گھر کے سامنے ہارن دے رہے تھے۔

میں نے اس کا نام ہی نہیں پوچھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد وہ گیٹ کی دوسری جانب سے برآمد ہوئی ہلکی سی مسکان نے ہونٹوں کو چھوا۔ شاید وہ انہی کی منتظر تھی۔ اس کے پیچھے ایک بردبار پر سائلی خاتون تھیں جن کے ہاتھ میں بیچ تھی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔  
 ”السلام علیکم جی!“  
 ”وعلیکم اسلام۔“

”مجھے حسام علی ملک کہتے ہیں میں بیچ فارٹی دن میں رہتا ہوں۔“  
 ”بیٹا خوشی ہوئی آپ سے مل کر ثمرین نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔“ ابھی ابھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے ناموں کا علم ہوا تھا۔  
 ”تھینک یو بیٹا کل آپ نے اسے ڈراپ کیا۔“  
 ”ایسا کچھ نہیں میں بھی وہیں جاتا ہوں۔“  
 میں اس کے لیے فکر مند رہتی تھی مین روڈ تک پیدل جاتی ہے۔ وہاں مشکل سے پوائنٹ کی بس ملتی ہے۔

”اب آپ ان کی فکر کرنا چھوڑ دیں اچھا جی خدا حافظ۔“ وہ گاڑی تیزی سے آگے بڑھالے گئے۔  
 ”اچھا تو آپ ثمرین ہیں۔“ اس کی مدھم مسکراہٹ کا طلسم ان کے وجود پر اپنا خوشبو بھرا چھڑکاؤ کر گیا۔  
 یقیناً اسے ان کے اچھا آدمی ہونے کی تصدیق ہو چکی تھی۔ سادوں کے مینے میں بادل اور دھوپ چھپن چھپائی والی آنکھ جھولی کھیلے رہتے ہیں۔ بادلوں نے اپنا قبضہ آسمان کی وسعتوں پر جما لیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوند باندی جاری ہو چکی تھی۔

اس روز کالج سے آنے کے بعد وہ دیر تک سوتے رہے۔ تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر لاؤنج میں آئے تھے۔ طاہران کے سامنے چائے کا کپ رکھ رہا تھا۔ نیل کی آواز سن کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ ثمرین کی والدہ اندر آ گئیں۔  
 ”السلام علیکم جی آئے۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا وہ ہاتھ میں پکڑاڑے سنٹر ٹیبل پر رکھتیں بیٹھ گئیں۔  
 ”ثمرین نے بریائی بنائی تھی سوچا آپ کے لئے بھی لائی جائے۔“  
 ”شکریہ آپ نے تکلیف کی۔“ طاہر ٹرے اٹھا کر کچن میں لے گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کولڈ ڈرنک لئے حاضر ہوا۔

”ثمرین آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔“  
 ”جی ہاں وہ خود بھی بہت اچھی ہیں۔“  
 ”وہ اپنے بارے میں بتانے لگیں۔“  
 بیٹا یہیں پر جا کر تھا کراچی کی لڑکی سے اس نے پسند کی شادی کی۔ بہو کا یہاں دل نہ لگا تو بیوی کی ضد پر مجبور ہو کر شاکر نے کراچی ٹرانسفر کر لیا ثمرین کے والد کا انتقال ہو چکا ہے میں نے گھر میں دستکاری اکیڑی کھول رکھی ہے۔ کرائے کا گھر ہے۔ الحمد للہ گزر بسر باعزت طریقے سے ہو رہی ہے۔  
 اپنی فیملی کے متعلق انہوں نے بھی بتایا۔  
 ”بیٹا جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہو تو بلا جھجک کہہ دیا کریں۔“  
 ”شکریہ جی۔۔۔۔۔“

بے شمار دن زلیست کے پیچھے بھاگتے معصوفیات کی نذر ہو گئے۔ ثمرین حُسنِ سلیمی ہوئی نیچر کی عام سی لڑکی تھی۔ انہیں متاثر کرنے یا ان پر ڈورے ڈالنے کی اس نے ہرگز کوشش نہ کی۔ وہ ان کی ممنون تھی ورنہ آتے جاتے راستے پر اسے لوگوں کی کیسی کیسی نظروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

اکثر اس کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے جھللاتا جس پر سب خرام مسکان دوسرے لمحے کہیں مدفن ہو جاتی تب وہ چونک کر اسے دیکھتے اس کا نمکین سانولا چمکیلا چہرہ اس کے چہرے پر سرسراہی کج ادائی وہ



مہبوت سے رہ جاتے۔ وہ بے چینی سے گردن ہاتھ کی پشت سے سہلاتے..... کاش یہ لڑکی اپنی پارسا چادر سمیت میرے مقدروں کا سائبان بن جائے انہوں نے سرگوشی میں دش کی۔

”ابی جان ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے ہاں میلی سے باہر بھی کسی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ شمرین ایک معمولی کلرک کی بیٹی تھی۔

حسام علی نے اکثر کوشش کی کہ شمرین کے خیال کو دل سے نکال دیں۔ انہیں شمرین کی قربت کے بل اپنی زندگی میں بتائے ان گنت پلوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ محسوس ہوتے اگر انہوں نے اسے سوچنا نہ چھوڑا تو ان کی زندگی تکلیفوں سے بھر جائے گی۔

شمرین نے بارہا ان کی آنکھوں میں پھیل مہم اشارے محسوس کیے تھے۔ بھی کبھار اس کے چہرے پر یوں مسکان پھیلی جیسے کلیوں میں گوندھی چاندنی اس کے متحرک ہونٹوں پر اپنی ٹھنڈک ثبت کر گئی ہو کتنے دن و ماہ بیت گئے۔ زندگی آگے چلتی رہی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے خیال کو دل سے نکال نہ پاتے تھے۔ ان کی ردحوں پر ایسے کپے رنگ چڑھے جو قطعی سبکدوش ہونے کو تیار نہ تھے۔ خاصی سوچ بچار کے بعد وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ بعد میں ابی جان کو بتا دیں گے۔

شمرین کی والدہ اس بات پر آمادہ نہ تھیں کئی دسویں سال کے اندر جنم لے رہے تھے۔

اس روز شمرین ان سے کہہ رہی تھی۔ ”حسام آپ ایک مرتبہ کوشش تو کر دیکھیں ممکن ہے آپ کے پیئرس مان جائیں۔“

”وہ بھی نہیں مانیں گے بلکہ فوراً مجھے گاؤں بلاوا لیں گے۔“

”میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا کبھی تمہیں دکھ نہیں دوں گا تم مجھ پر اعتماد کرو۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ بھروسہ رکھو مجھ پر۔“ لیکن وہ خوف زدہ تھی۔

ابی کو حسام علی بے حد پسند آئے تھے شمرین کو اس

سے اچھا رشتہ کبھی نہیں مل سکتا تھا۔

”آئی آپ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھیں جیسے بھی حالات آئے میں شمرین کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ہم دونوں خود کفیل ہیں ایک دوسرے کا خیال رکھ سکتے ہیں۔

ایک سادہ سی تقریب میں ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔ وہ خوش تھے ابی بھی ان کے گھر شفقت ہو گئیں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو پا کر بے انتہا مسرور و مطمئن تھے شمرین ان کی توقعات سے بڑھ کر اچھی بیوی ثابت ہوئی۔

اس نے ان کے چھوٹے سے گھر کو جنت بنا دیا تھا۔ جب بھی گاؤں سے کسی کا فون آتا کہ ہم آ رہے ہیں تو باہر ہی ملنے کا پروگرام بنا کر وہیں سے انہیں فارغ کر دیتے۔

سال بعد خداوند نے انہیں پیاری سی بیٹی سے نواز دیا جس کا نام انہوں نے جنت رکھا۔ دونوں صبح کانچ چلے جاتے جنت کو امی سنبھالتیں۔

اس روز اچانک ابی جان کا فون آ گیا۔ ”حسام تم تو عرصہ سے شادی کے نام سے بھاگ رہے ہو ہم نے خود فیصلہ کر لیا ہے تمہاری پھوپھی زاد صبا سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ پندرہ دن بعد تمہاری شادی ہے تم فوراً گاؤں آ جاؤ۔“ ان کے حیدروں تلے سے زمین نکل گئی۔

شمرین میں کیا کروں۔ وہ گم صم تھے۔

”حسام غلطی مجھ سے بھی ہوئی ہمیں یوں چھپ کر شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آپ صاف صاف انہیں بتا دیں بیٹی کا بھی کہہ دیں۔“

”وہ تب بھی صبا سے میری شادی کروا کر چھوڑیں گے۔“

”پھر جائیں اور شادی کر لیں۔“ وہ اندر سے سک رہی تھی۔ شمرین تم خاموش کیوں ہو مجھ سے لڑتی جھگڑتی کیوں نہیں؟ کچھ تو بولو۔“

”حسام میں بولنے کی پوزیشن میں کب ہوں فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔“

ابی اپنے نام نہاد انا پرست خاندان کی لاج رکھنے



## صلوۃ التسبیح

رمضان المبارک میں صلوۃ التسبیح پڑھنے کی بے حد فضیلت ہے۔ اس نفل نماز کو مختلف سورتوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ جس میں ہر رکعت میں تیسرے کلمہ کو سورۃ کے بعد پڑھتے ہیں اور ہر رکعت میں اس کلمے کی کل تعداد 75 بار ہوتی ہے جو کہ چاروں رکعات ملا کر 300 مرتبہ ہوگی۔ حصن الحصین کی کتاب میں اس کا طریقہ دیا ہوا ہے۔ تیار پڑھنا افضل ہے۔ اس میں آپ چاروں قل بھی ترتیب سے پڑھ سکتے ہیں جیسے کہ پہلی رکعت میں سورۃ الکافرون، دوسری میں سورۃ اخلاص، تیسری میں سورۃ الخلق اور چوتھی میں سورۃ الناس۔ اس طرح وہ خواتین حضرت جو دیگر سورتیں یاد نہیں کر پاتے وہ بھی چاروں قل یاد ہونے پر اس مبارک نفل نماز کو ادا کر سکتے ہیں اور اس طرح بخشش و مغفرت حاصل کر سکتے ہیں۔

(صائمہ خان، پشاور)

گئے۔ ان پر اصلی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔  
”تم اس لڑکی کو طلاق دے دو اور گاؤں چلو مباح  
تب ہی تمہارے ساتھ رہے گی۔“

”ابی جان معاف کیجئے گا میری ایک بیٹی بھی ہے  
میں اب مزید آپ کے اصولوں کی سولی میں نہیں لٹک  
سکتا۔“

”نافرمان ہم تمہیں جائیداد سے عاق کر دیں گے۔“  
”کوئی بات نہیں رزق دینے والا اللہ ہے۔“  
واقعی ابی جان نے انہیں جائیداد سے عاق کر دیا تھا  
اور ان کے حصے کی جائیداد صبا کے نام کرادی تھی۔

ان کے ہاں یہ حکم بھی صادر تھے لڑکی ایک مرتبہ  
جس مرد سے منسوب ہو جائے مرتے دم تک اسی کے  
نام کی رہتی ہے۔ اچانک سے لائف خاصی ڈسٹرب ہو  
گئی تھی وہ شرمین کو تسلی دیتے۔

دیکھو سب ٹھکرا کر آ گیا ہوں ناں تمہارے اور

کے لئے وہ ہر صورت چاہے بندوق کی ٹوک پر ہی کیوں  
نہیں صبا سے میرا نکاح گرا کر چھوڑیں گے۔“

”شرمین میں تم سے وعدہ کرتا ہوں میں روز اول  
سے تمہارا ہوں اور ابد تک تمہارا ہی رہوں گا۔ میں کبھی  
کسی دوسری عورت کو چھوں گا نہیں میں تمہارے اعتماد کو  
جذبات کو کبھی مجروح نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے سولی پر  
کیوں نہ لٹکا دیا جائے۔“

آپ کا اعتبار کب تک میرے بے اعتمادیوں کو کچھ  
کے لگتا رہے گا۔ یہ آپ کی اپنی زندگی ہے آپ کو حق  
حاصل ہے اپنے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کا۔ جنت  
کے رونے پر وہ اٹھ کر اس کی طرف چلی گئی۔

جاتے ہوئے وہ شرمین اور اس کی امی کو تسلیاں  
دے رہے تھے۔ ”میں انشاء اللہ چند روز میں واپس  
آ جاؤں گا۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں میرے  
لئے تم ہی پہلی اور آخری عورت ہو تم مجھ پر بھروسہ  
رکھو۔“ وہ غمی سے مسکرائی تب کنواہٹ اس کے گلے  
میں پھیلی چلی گئی۔

دھوم دھام سے صبا سے ان کی شادی ہو گئی۔ وہ گم  
صم تھے۔ جملہ عروسی میں آتے ہوئے جزواں نکلن اس  
کی کندنی کلائی میں پہنچانے کے بعد وہ صوفہ پر جا کر سو  
گئے۔ صبا بہت خوبصورت تھی لیکن شرمین کی پاکیزگی کے  
سامنے انہیں دنیا کی تمام عورتیں بہت نیچے کے گراف  
میں محسوس ہونے لگیں تھیں۔ صبا تمام رات روتی رہی۔  
دل میں کیسے کیسے ارباں سجا کر وہ ان کی خواب گاہ میں  
ان کی دہن بن کر آئی تھی۔

کیا دوش تھا اس کا جو اپنے آباؤ اجداد کے اصولوں  
کی بھیئت چڑھ گئی۔ ولیہ کے بعد صبا میکے گئی تو پھر  
واپس نہ آئی۔

ان کے رویے کے متعلق اس نے گھر والوں کو بتا  
دیا تھا۔ گھر میں اک طوفان برپا ہو گیا۔

”ابی جان بار بار میں کہتا رہا مجھے یہ شادی نہیں  
کرنی آپ سب نے میری ایک نہ سنی۔ وہ واپس لاہور  
آ گئے۔ دو دن بعد ابی جان بھائیوں کے ساتھ لاہور پہنچ

شاید شمرین نے سب کو ستانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ ابھی کڈنی ٹرانسفر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی روح نفسِ غصری سے پرواز کر گئی۔ ڈاکٹرز کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ ان کے آپریشن کرتے ہاتھ برف کی مانند جم جاتے۔ آج بھی ساون ہی کی رت تھی اور پھر ساون کی جھڑی دھواں دھار انداز میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی حسام علی سکتے کے عالم میں تھے۔

شمرین یہ عذابوں بھری جدائی کس دوش میں بخش گئی ہو مجھے۔ ان کے دوستوں نے بمشکل انہیں سنبھالا تھا۔ ویسے بھی چند روز قبل ان کا آپریشن ہوا تھا..... جب اس کا جسد خاکی گھرا لیا گیا تو ساون دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ جیسے آج کے بعد اس نے پھر کبھی برسنے ہی نہیں۔ ان دونوں کا اپنا رونے والا تھا ہی کون چند کو لیک اور ہمائے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ شمرین انہیں چھوڑ گئی ہے۔ میں تو پل پل تمہاری چاہتوں کی خوشبو اوڑھے خود کو اس زانداں میں اسیر رکھنا چاہتا تھا وہ اور جنت اس کے بغیر کیسے رہیں گے۔

جب وہ پہلی بار ملے تھے تب بھی ساون اسی طرح برس رہا تھا۔ جب وہ رخصت ہو رہی تھی تو تڑپ تڑپ کر موسلا دھار بارش اپنے وجود کو زمین کے سینے پر روند رہی تھی۔

آنا فانا کیسے وہ اس دنیا سے جا رہی تھی۔ لحد میں اترتے تک بارش اسے اپنی آغوش میں لیے تھپکیاں دیتی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو اب تمہیں خدا جو رحمان ہے رحیم ہے اس کے سپرد کیا وہ آگے کا تمہارا سفر تمہارے لئے آسان فرمادے اسے دنیا سے گئے بے شمار لمحات ماہ و سال بیت چکے ہیں۔ وہ حسام علی کے لئے گزرا وقت کبھی نہیں بنی۔ تم میرا آج ہو ہمیشہ آج بن کر میری رگ پے میں سرایت کرتی رہو گی۔ تم میری آنکھوں کی چٹلیوں میں مقید ہو۔ وہ آج بھی اسے انہی شدتوں سے یاد کرتے ہیں پاکیزگی کی بلند یوں کو چھوٹی ہوئی وہ سفید لباس میں ملبوس ان کے سامنے رہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

جنت کے پاس میری اصلی جنت تو تم دونوں سے ہے۔ وہ اسے اپنے کندھے سے لگائے کہتے تو وہ اثبات سے سر ہلاتے طمانیت سے آنکھیں موند لیتی۔ جنت بڑی ہو رہی تھی۔ اس کا خیال امی ہی رکھتیں۔

اس روز اچانک کلاس روم میں شمرین کی طبیعت خراب ہو گئی۔ حسام علی اسے فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے آئے۔ اس کی طبیعت بتدریج خراب ہو رہی تھی ٹیسٹ وغیرہ کی رپورٹس آنے کے بعد پتہ چلا اس کی ایک کڈنی فیل ہو چکی ہے۔ دوسری بھی متاثر ہوئی ہے جو بے حد آہستگی سے کام کر رہی ہے۔ اس کا علاج تیزی سے جاری تھا۔ حسام علی نے اپنی ایک کڈنی شمرین کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ خوبصورت سراسرپے والی شمرین دن بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جا رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں کے دیپ دھندلا رہے تھے۔ گہری خاموشی میں چلی گئی تھی۔

جتنی دیر حسام اس کے سامنے رہے تنگی باندھے انہیں دیکھتی رہتی وہ بھی پل پل اس کے قریب رہتے۔ وہ اندر ہی اندر آنسوؤں کے سیلاب روکے رہتے۔ ان کے خشک ہونٹوں پر اس کے لئے دعائیہ کلمات کا در در جاری رہتا۔ دونوں ان لمبی ساعتوں میں ہلکورے کھا رہے تھے۔ ان کی گویائی سلب ہو چکی تھی۔ شمرین کا آپریشن جاری تھا۔ حسام علی کی کڈنی شمرین کو ٹرانسفر کی جا رہی تھی۔

باہر وہ غمگین حال میں خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ وہ لمحہ لمحہ ان کی دسترس سے نکل رہی تھی۔ امبر پر نگہ کشاں بج رہی تھی۔ ان کی روح میں گھمبیر تا سپاٹ سنائے انہیں ہولا رہے تھے۔ انہوں نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

اچانک ان کے دعا کے لئے جڑے ہاتھ لڑکھڑا کر گر گئے۔ وہ سانس روکے سر تا پا لرز گئے۔ امی سجدے میں گریں اس کی زندگی کے لئے رب سچے کے سامنے گزر گڑا رہیں تھیں۔

## واسوخت

قاسم رشید

بعض اوقات منزل انسان کے ہاتھوں سے ایسے نکلتی ہے  
 جیسے خشک ریت دھیرے دھیرے مٹی سے ---  
 لیکن دھوپ چھاؤں کے اس کھیل میں کچھ لوگ سمندر  
 کی مانند سارے موسموں کو اپنے اندر ہی چھپا رکھتے ہیں۔  
 وہ بھی ایسے ہی مزاج کا مالک تھا۔ ---

ایک منفرد تحریر صرف قارئین ریشم کے لیے



صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا  
 سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اگست ..... ریشم ..... 2011

کاپوں کی بانڈنگ تک ایک جیسی ہوتی تھی ان کے لُج باکس کی طرح بستہ بھی ہم رنگ ہوتا تھا۔ کبھی نور العین کے بستے سے نور الہدیٰ کی کاپی نکلتی تو کبھی نور الہدیٰ کی کتاب نور العین کے بستے میں ملتی، اتنی ہم آہنگی اتنی یکسانیت کہ کبھی کسی نے کلاس میں ٹاپ بھی نہیں کیا۔

جمال تم بہت قابل ہو اور نور الہدیٰ کے دوست بھی مجھے بتاؤ کیا محبت وقت اور زمانے کی پابند ہوتی ہے، کیا کبھی اس کی اگلی قسط کا انتظار بھی کیا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ محبت کے دائرے کو چند گھنٹوں، چند دنوں یا کچھ سالوں تک محدود کر دیا جائے کہ تم فلاں بنت فلاں 23 مئی کی شب گیارہ بجے سے لے کر 24 مئی دو بجے دن تک فلاں ابن فلاں کو چاہ سکتی ہو، محبت کوئی ماڈل ٹاؤن پارک تو نہیں جہاں سٹارٹ پوائنٹ کی نشاندہی کر دی گئی ہو جہاں انسان کن کر چکر لگائے اور جب متعین مسافت پوری ہو جائے تو ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے پارک سے باہر نکل آئے۔ بتاؤ جمال کیا ایسا ممکن ہے؟ نور محبت دراصل ابن آدم کا دوسرا رخ ہے۔ قاتیل نے ہاتیل کو مار ضرور دیا مگر ہاتیل کی روح میں کبھی محبت قاتیل کی آنکھوں میں چھپی نفرت رنگ و روپ بدل بدل کر آج ایک سویں صدی تک اسی طرح چلی آرہی ہے۔ دراصل جب بھی کسی ہاتیل نے کسی کو چاہا ہے۔ کوئی نہ کوئی قاتیل محبت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

نہیں جمال محبت تو موسیٰ کو پہاڑ کی بلند ترین چوٹی تک لے جاتی ہے، محبت تو آگ کی تلاش میں نکلتی ہے اور پیہیری لے کر واپس آتی ہے، پھر مرے حصے کا وہ پہاڑ کہاں ہے، میری نصیب کی وہ آگ کیوں سرد ہوگئی مجھے پیہیری کیوں نہیں ملی؟

نور تم سمجھ نہیں رہی ہو، پیہیری اور پیغام ربی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم پیہیری کی منشا ہی ہو اور چاہتی ہو کہ میں تمہارا پیغام بر بن کر نور الہدیٰ کے پاس جاؤں اور اسے بتاؤں کہ تمام تر اخلاقی اقدار اور معاشرتی قدغوں کے باوجود ابھی بھی نور العین کے بیک میں وہ

وہ میرے سامنے ہی گیا اور میں راستے کی طرح دیکھتا رہ گیا وہ دسمبر کی ایک خشک رات تھی اور میں دیوار سے ٹیک لگائے نیبل لیمپ کی روشنی میں کل کے پیپر کی تیاری میں مصروف تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میرے بعض دوست صرف تنگ کر کے مڑا لینے کے عادی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان میں سے کوئی ہو، اقبال بھی ہو سکتا ہے جس نے خود کبھی نوٹس نہیں بنائے مگر سب سے زیادہ بہترین نوٹس اس کی الماری میں بند رہتے ہیں۔

دوبارہ دستک ہونے پر مجبوراً میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا سامنے نور العین کھڑی تھی۔ بارش اس کے بالوں سے اور شوڈر بیک سے قطرہ قطرہ ٹپک کر جھیز میں جذب ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کتابیں، رجسٹر، نوٹس، بال پوائنٹ سیٹ، سٹول گھسیٹ کر ہیئر کے پاس کیا، وارڈ روپ سے کاٹن شارٹ اور سفید شرٹ نکالی بازوؤں سے تھام کر نور کو ہیئر کے پاس بٹھایا اور مکمل اس کے شانوں پر ڈال دیا۔

خیریت نور اس وقت اور اس حالت میں؟

ہاں

تمہیں گارڈ نے نہیں روکا؟

چھوڑو فضول بات ہے تمہیں معلوم ہے کل نور الہدیٰ کی شادی ہے۔

میں تمہارے لئے چائے بناتا ہوں، اتنے تم کپڑے بدل لو سردی بہت ہے نمونیا ہو گیا تو تمہیں ڈاکٹر تک کون لے جائے گا، تمہیں معلوم نہیں کل میرا پیپر ہے۔

نہیں کل نور الہدیٰ کی شادی ہے۔

نور الہدیٰ اور نور العین میں بہت سی عادتیں مشترکہ تھیں، ان کے دادا ایک تھے، محلہ ایک تھا، وہ ہم جماعت تھے ایک دوسرے کے ہم نوا، ہم درد، پانچویں جماعت تک وہ ایک ہی سکول ایک ہی جماعت ایک ہی سیکشن میں ایک ہی سیٹ پر بیٹھتے رہے۔ ان کی کتابوں

## پاکستان

جنوری 1933ء میں چودھری رحمت علی اور ان کے چند ساتھیوں نے جویمبرج یونیورسٹی کے طالب علم تھے، ایک پمفلٹ میں لفظ پاکستان پہلی مرتبہ استعمال کیا۔ یہ لفظ صوبہ پنجاب، (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر اور سندھ کے پہلے حروف اور بلوچستان کے آخری حروف کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ اس پمفلٹ کے علاوہ چودھری رحمت علی نے ایک مفت روزہ بھی جاری کیا جس کا نام ”پاکستان“ تھا۔

(انتخاب: شمیمہ گل، آزاد کشمیر)

چاچو کے ساتھ باغ جناح کی سیر کرتے ہوئے مجھے نور الہدیٰ نظر آیا وہ اکیلا تھا۔ اگرچہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور تھوڑی کم عمر خاتون اس کے ساتھ تھی۔ مگر پہلی بار میں نے نور الہدیٰ کو نور العین کے بغیر دیکھا، میں بھاگ کر اس تک گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے ملے، تب مجھے پتہ چلا کہ وہ اب AGS میں داخل ہو گئے ہیں، پھر میں نے بھی ضد کر کے اپنا سکول تبدیل کرالیا، ابو کا خیال تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے سکول نہیں پہنچا سکیں گے۔ مگر ماما ہمیشہ کی طرح میری مدد کو آئیں اور بالآخر ایک مرتبہ پھر قاتل ہاتھیل کے مد مقابل آچکا تھا۔

جوں جوں ہم اگلی کلاسوں میں ترقی پاتے گئے میرے دل میں نور العین کی محبت مزید گہری ہوتی چلی گئی وہ اب بھی کلاس میں ٹاپ نہیں کرتے تھے مگر ان کی سیٹ اب بھی پاس پاس تھیں۔ وہ ابھی بھی ایک دوسرے کا اپن استعمال کرتے۔ بریک کے دوران کیفے ٹیریا میں جوس کا ایک گلاس منگواتے دوسرا، ڈال کر پیتے پھر دوسرا گلاس منگواتے اور اپنے سٹراز تبدیل کر لیتے اور وہ گلاس بھی ختم کر لیتے تھے اور میں ہمیشہ کی طرح ان سے دور بیٹھا کبھی گلاس کی سطح پر ابھرتی نمی اور کبھی نور العین کے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطرہوں کو دیکھتا

14 انچ لمبی مینسل موجود ہے جس کے سکے کو گاڑھا کرنے کے لئے بھی تم نے اسے منہ میں ڈالا تھا، وہ ادھ جلی گلائی رنگ کی موم بتی جو تمہاری چودھویں سالگرہ پر روشن کی گئی تھی ابھی بھی نور کے پاس ہے اور دوبارہ بھی روشن نہیں کی جائے گی۔ میں تمہارے لئے چائے بناتا ہوں اتنے تم باتھ روم جا کر کپڑے بدل لو۔ چائے نہیں خدا کے واسطے نہیں.....

کیوں پہلے تو تم بہت شوق سے پتی تھیں اب کیا ہوا؟

چھوڑو اس بات کو بس تم میرے سامنے بیٹھے رہو ہم دونوں نور الہدیٰ کی باتیں کریں گے رفتہ رفتہ رات ختم ہو جائے گی۔ اگلا دن آجائے گا تم پیپر دے کر واپس آنا اور شام کو میری خاطر نور الہدیٰ کی شادی میں جانا پھر واپس آ کر ایک ایک لمحے، ایک ایک واقعہ، ایک ایک صورت، ایک ایک صورت کا احوال مجھے سنانا، میرا وعدہ ہے میں بالکل سکون سے تمہاری باتیں سنوں گی، میں روؤں گی بھی نہیں، تمہیں ٹوکوں گی بھی نہیں صرف تم بولنا اور میں سنوں گی۔

اب بھلا نور کو میں کیسے بتلاتا کہ واقعات تو دودھ کے اوپر آنے والی بالائی ہوتی ہے، موٹی، تہہ دار چکنائی سے بھرپور مگر اصل لذت اس کی تہہ میں ہے۔ جو نظر نہیں آتی، میری محبت پر نور الہدیٰ کی چاہت غالب آچکی ہے۔ میں جو ہمیشہ ان کی پچھلی نشست پر بیٹھتا تھا اگر کسی روز کوئی بچہ میری سیٹ پر بیٹھ بھی جاتا تو میں اسے زبردستی وہاں سے اٹھا دیتا تھا، میں کلاس کا ناظر، ڈے بوائے جس سے سارے ہم جماعت خائف رہتے تھے۔ نور العین کے پیچھے گردن جھکائے بڑی محویت سے پسینہ کے ان قطرہوں کو دیکھتا رہتا تھا جو بالوں سے ٹپک کر اس کی گردن سے پھسلتے ہوئے نیچے ٹھیس کے اندر کہیں جذب ہو جاتے تھے۔

کلاس فقہہ پاس کرنے پر مجھے جس سکول میں داخلہ دلوا یا گیا وہاں نہ نور العین تھی نہ نور الہدیٰ، مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اب کس سکول میں ہیں۔ ایک روز

رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا میں وہ سڑا اٹھا کر اپنے بیک میں ڈال لوں یا وہ ٹشو اٹھا لوں جس سے نور العین نے اپنے ہونٹ صاف کئے تھے۔ مگر کون سا سڑا نور العین نے استعمال کیا؟ کون سا ٹشو اس کے ہونٹوں کو چھو کر زمین بوس ہو گیا تھا؟؟ یہی سوال مجھے کسی فیصلے پر پہنچنے سے ہمیشہ روک دیتا تھا۔

انتاعرصہ گزر جانے کے باوجود مجھے اب تک یہ سمجھ نہیں آیا کہ میں نور العین سے زیادہ محبت کرتا ہوں یا نور الہدیٰ سے۔ نفرت میں کسے پانا چاہتا ہوں کسے دھتکارنا، کون سر آئینہ ہے کون پس آئینہ، کس کی شکل مجھے نظر آتی چاہیے اور کس کا تھو بڑا میرے تصور کو بھی ناگوار گزرتا ہے میں کس کے لمس کا متلاشی ہوں یا کس کی موت کا خواہاں.....؟؟؟

پھر تم نے کیا فیصلہ کیا کل جاؤ گے ناں؟  
نہیں شاید نہیں میں نہیں دیکھ سکوں گا کہ نور العین کی آنکھوں میں بسی وہ موت کسی اور عورت کی جانب بہت محبت، بہت چاہت بڑے فخر بڑے غرور سے اٹھ رہی ہو۔ نور اگر میں یہ سب کچھ دیکھ کر برداشت کر بھی لوں تو تمہیں اس طرح نہیں بتلا سکوں گا لفظ میرے حلق سے نکلنے سے پہلے آنسو بن کر میری پلکوں سے گر جائیں گے

مجھے چاہے جانے کی تکلیف اور نہ چاہے جانے کی اذیت سے دو چار مت کرو تم کہو تو میں ابھی تیسری منزل سے چھلانگ سکتا ہوں۔ ساری رات باہر سردی میں ٹھٹھر سکتا ہوں مگر نور الہدیٰ کی شادی کی تقریب میں میری شرکت نامکن قطعی نامکن ہے۔ تم کوئی دوسری خواہش کر دو کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لو۔

جمال جتو، تلاش دراصل راستے میں صلیب کی مانند لگا ایسا مائل سٹون ہوتا ہے۔ جس پر درج مقامات وقت کی دھوپ اور زمانے کی بارشوں نے مٹا دیئے ہوں مگر فاصلوں کا کچھ نہ بگڑا ہو سامنے جاؤ تو 161 کلو میٹر، دائیں 9 بائیں 23 کلو میٹر کون جانے کہ اتنی

مسافت طے کرنے کے بعد بھی مجھے وہ گاؤں ملے گا جہاں ہم نے چاہت کا پہلا بیج بویا تھا، محبت کا وہ کنواں اب بھی وہیں ہوگا۔ جہاں الفت کا پہلا ڈول ڈالا تھا وہ حجرہ ہو گا بھی یا نہیں جس میں ایک اندھیری شب رفاتوں کے تیل سے بھرا دیار روشن کیا تھا۔ اگر نہیں تو کیا اتنی مسافت طے کرنے کے بعد بھی میں وہاں واپس آ جاؤں گی۔ جہاں سے چلی تھی پھر کیا مجھ میں کسی اور سمت جانے کی ہمت ہوگی اور اگر وہ راہ اختیار کر بھی لوں تو نجانے کتنی بدنامیاں، کتنی نفرتیں، کتنی حقارتیں منہ پھاڑے مجھے ننگے کوتیا رکھری ہوں گی۔

ہم تینوں میٹرک تک ایک ساتھ رہے بلکہ وہ دونوں میں تو چھپلی نشست پر بیٹھا اپنی گم گشتہ محبت کے مرے پڑھنے میں مصروف رہا اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ بس اب کالج میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔

میں نے ایف اے کیا، بی اے، ایم اے انگلش کیا اور اب پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ مقابلے کے امتحان میں شامل ہونے کا ہے۔ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر بہت بلند بہت اونچی سطح تک جانا چاہتا ہوں۔ پھر کسی روز اچانک تم دونوں مجھے طے کسی کیفے میں کسی آکس کریم پارلر میں تمہاری گود میں ایک خوبصورت سا بچہ ہوگا۔ بڑے کی انگلی نور الہدیٰ نے پکڑی ہوگی تمہارے چہروں پر طمانیت اور تمہارے پرس نوٹوں سے بھرے ہوں گے۔ تم اب بھی ایک کپ میں دو چمچے ڈالے آکس کریم کھاؤ گے، تمہارا بچہ اکیوریم کے پاس کھڑا بہت اشنہاک سے چھیلیاں دیکھ رہا ہوگا اور میں اسی طرح پرے دور اکیلا بیٹھا ہوں گا۔

نور یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ محبت کے جرم پر کبھی موت کی سزا نہیں ملتی۔ ہمیشہ عرق قید ملتی ہے صعوبتوں، مشکلوں سے بھری بامشقت دیکھو اور جیسے جاؤ، سنو اور جھیلے جاؤ۔

ہاں جمال تم ٹھیک کہہ رہے ہو تم نے وہ پرانے زمانے کے سیاہ رنگ کے 48 آر پی ایم والے گرامو فون ریکارڈ دیکھے ہوں گے۔ نور الہدیٰ کے گرد میری

زندگی کی سوئی دائرہ در دائرہ گھومتی رہتی تھی دائرہ تنگ ہوتا رہتا تھا اور گیت کے بول آگے چلتے جاتے تھے۔ میری زندگی سے وہ گیت کبھی ختم نہیں ہو سکتا کسی مافوق لفطرت عمل کے باعث ختم ہونے پر دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ سوئی خود بخود ریکارڈ کے پہلے دائرے پر آ جاتی ہے۔

میں کھلی ہوئی ایک سچائی مجھے جاننے والے جانتے ہیں میں نے کن لوگوں سے نفرت کی اور کن لوگوں کو پیار دیا۔

کچھ عشق بھی تھا کچھ مجبوری تھی سو میں نے جیون ہار دیا..... سو میں نے جیون ہار دیا..... سو میں نے جیون ہار دیا.....

نور میں تو خود بچپن سے محبت کا متلاشی تھا مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس کی دسترس میں ہے اور کون اس سے محروم۔ سڑا سے لے کر ٹشو تک میں نے دنیا کا ہر کونہ چھان مارا مگر مجھے محبت کا مسکن نہ مل سکا۔ مسکن ملا نہ مجھے سکون خیر چھوڑو اپنی کھومٹرک سے لے کر اب تک تم نے محبت کے سوا اور کیا کچھ کیا۔ کیا کھویا کیا پایا؟

ضرور بتاؤں گی مگر ابھی نہیں ابھی مجھے اپنے گزشتہ دنوں کو نہلا دھلا کر اجالنا ہے۔ برے دنوں کے سالوں سے گندگی صاف کرنی ہے ابھی میری محبت کی تدفین باقی ہے اور ابھی اس کے جنازے میں شریک ہونا ہے، تم گئے دنوں کی روٹی کا لپٹ لے آگے آگے چلنا میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی مگر رات گئے جب نور الہدیٰ کمرے میں داخل ہوتے سے کنڈی لگا کر بتی بجھا دے اس وقت ہم یہ موم بتی جلا میں گے اس کی مدھم غمغماہی روشنی میں بیٹھ کر تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ ایک ایک واقعہ، ایک ایک بات، ایک ایک حادثہ، ایک ایک دیوانگی، ایک ایک ٹھوکر، ایک ایک بریکر، یہ میرا تم سے وعدہ ہے جمال.....

ٹھیک ہے نور تم کہتی ہو تو میں مان لیتا ہوں۔ اطاعت و انکساری اور اپنی ذات کی نفی ہی دراصل محبت کا دوسرا نام ہے۔ اب تم سو جاؤ میں یہیں زمین پر چادر

بچھا لوں گا، چاندنی رات ہے تمہیں روشنی میں نیند نہیں آئی ٹھہرو پہلے مجھے کھڑکی کے شیشوں پر چادر لٹکانے دو اس طرح تم سکون سے سو سکو گی۔

نہیں مجھے اب اندھیروں سے خوف آتا ہے۔ شیشہ مت ڈھانپو میں سو جاؤں گی اس نے مکمل اپنے گرد لپیٹا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

پہلے میں نے سو جا کل کے پیپر کی تیاری کر لوں پونی سیف سے متعلق نوٹس ہاتھ میں تھامے میں نجانے کتنی دیر تک نور العین کو دیکھتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے شاید میں اونگھ گیا تھا کہ اچانک کھڑکی سے آتی روشنی بند ہونے پر میری آنکھ کھلی گئی۔ نور کھڑکی کے شیشے سے ناک لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔ دودھیا چاندنی میں اس کے گالوں سے پھسلتے آنسو دور ہونے کے باوجود مجھے نظر آ رہے تھے۔

میں دھیرے دھیرے اس کے پاس گیا۔ محبت سے اس کے گرد اپنے بازو حائل کرتے ہوئے بہت پیار سے میں نے اسے لپیٹا لیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔ میرے پاس اسے تسلی دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا یا شاید تسلی دے کر میں اس کے خیالوں کے تسلسل میں دراڑیں ڈال سکتا تھا۔

آنسو اس کی پلکوں سے اتر کر میرے سینے پر گر رہے تھے اور میرے آنسو اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اپنی اپنی محبت کی ناؤ کھیچتے ہوئے اپنے اپنے دکھوں کے بادبان کھولتے ہوئے نا معلوم کتنی دیر ہم اسی حالت میں کھڑے رہے وہ صدیاں تھیں یا لمحے سیکنڈز تھے یا سال یاد نہیں۔

جمال تمہیں یاد ہے جب مس منور نے ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا تھا کہ تم دونوں جڑواں ہو تو نور الہدیٰ نے کہا یہ میرے چچا کی..... اسی وقت میں بھی بولی کہ یہ میرے تایا کا..... پھر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے تھے۔ مس منور جیسی سخت اور سڑیل مزاج مس بھی مسکرا اٹھی تھیں۔



ہاں نور مجھے یاد ہے۔ جتنی نفرت مجھے نور الہدیٰ سے تھی اس روز اس میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کیا ہوتا اگر تم دونوں جڑاں ہوتے۔ اس روز مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم بھی میری نہ ہو سکو گی۔

یہ بات تمہارے لئے ضرور تکلیف دہ ہو گی جمال مگر اس سے کہیں زیادہ تکلیف، اذیت اور دکھ مجھے کچھ عرصے کے بعد ملے۔

کیا مطلب؟

میٹرنک کے بعد مجھے کیرڈ کالج میں داخلہ مل گیا تو نور الہدیٰ نے سکا لکالج میں داخلہ لے لیا ہم دونوں بریک کے دوران عمر ہسپتال کے ویٹنگ لاونج میں بیٹھ کر اسی طرح جوس کاسپ لیتے تھے۔ ایک گلاس دوسرا آس پاس کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھتے کچھ نفرت سے اور کوئی کوئی محبت سے، ہم ان کی نظریں سمجھ سکتے تھے مگر اپنے دل کو سمجھنا بہت مشکل لگتا تھا۔ انہوں نے شاید کبھی محبت کی ہی نہیں ہو گی۔ وہ اس کی لذت اس کی لطافت کو کیسے پہچان سکتے تھے۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ گرمیوں کی چھٹیاں آ گئی۔

پاپائے بتایا کہ اس مرتبہ ہم نانوں کے پاس ان کے گاؤں جائیں گے۔ ماما کے انتقال سے لے کر اب تک نور اپنی نانوں سے نہیں ملی..... لاہور سے اگر شیخوپورہ کی طرف جائیں تو راستے میں قلعہ ستار شاہ آتا ہے اس گاؤں سے تھوڑا آگے نانوکا گاؤں تھا۔ پاپا آفس سے واپس آئے اور ہم لوگ لاہور سے چلے پاپا کے ساتھ آگے چاچو بیٹھ تھے میں اور نور الہدیٰ دونوں پیچھے، چاچو پاپا دونوں راستوں کے متعلق بتلاتے رہے یہ ملت ٹریکٹر ہے، یہ رستم سہراب، یہ راستہ سکیاں کو جاتا ہے مگر سڑک ٹوٹی ہوئی ہے۔ پختہ سڑک سے دائیں جانب مڑے تو سڑک چھوٹی ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔ اب صرف اینٹوں سے بنی سولنگ نظر آرہی تھی۔ دائیں بائیں کھیت لہلہا رہے تھے۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا، دروازے کھلے تھے، ڈھور ڈگر اپنے اپنے استھانوں پر بندھے تھے۔ بھینسوں سے دودھ دھولیا گیا تھا۔ شام کا

سرخی اندھیرا مزید گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا کہ پاپا نے ایک خستہ حال گھر کے سامنے گاڑی روک دی، گاؤں کے نیم برہنہ بچے گاڑی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

کس سے ملنا ہے؟

کہاں جانا ہے؟

آپ کون ہو؟

کس لئے آئے ہو؟

سوالوں کی بوچھاڑ تھی اور پاپا کے لبوں پر خاموشی وہ دھیرے دھیرے چلتے گھر کے اندر داخل ہوئے ایک بوڑھی سی عورت تنور پر ٹھڑی روٹیاں لگا رہی تھی کہ پاپا نے ”ماما جانی“ کا نعرہ بلند کیا۔ آنے کا بیڑہ ہاتھ سے گر گیا۔ تنور میں لگی روٹیاں جل گئی اور بوڑھی عورت زارو قطار رو رہی تھی تم سمجھ گئے ہو وہ میری نانویں۔

مجھے گلے لگا کر تو اس طرح تڑپی تھیں کہ پاپا، چاچو کے بھی آنسو نکل پڑے، رخشندہ بالکل رخشندہ وہی ناک، وہی آنکھ، وہی گال وہی گردن سب کچھ وہی وہ مجھے خود سے چمٹائے میرے جسم کے ایک ایک پور ایک ایک حصے کو چوم رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔

اس روز نانوں نے کھانے کا بہت اہتمام کیا تھا۔ مرغی، چاول، دال پاک، دہی، نمکین لسی اور سب سے بڑھ کر وہ ہرے ہرے رنگ کی کھٹی کھٹی چٹنی، میں چچے بھر بھر کر چٹنی کھا رہی تھی پاپا مجھے دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔

نانو بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھیں مگر خوش تھیں رات کو کھلے آسمان تلے بڑے سے والان میں پلنگوں پر سفید چادر پر سفید تکیے اور کھیں بچھا دیئے گئے۔ میرا پلنگ نانو کی دائیں جانب اور نور الہدیٰ کا بائیں جانب تھا وہ دھیرے دھیرے کچھ بڑھ رہی تھیں اور وقفہ وقفہ سے ہم دونوں پر پھونک رہی تھیں۔ جب نانوں نے دانوں کو چومتے ہوئے بیج تکیے کے نیچے رکھی اور ایک زوردار جمائی کی تو میں چھلانگ مار کر ان کی بغل میں جا گھسی۔

نانو یہ چٹنی کس سے بنائی تھی بہت مزیدار تھی۔

جیون جوگی یہ پتی امی کی چٹنی تھی پودینہ اور ہری

میری ہمیشہ سے خواہش تھی۔  
مجھے یقین ہے آپ میرا مان رکھ لیں گی۔  
پھر نانو؟

بس پھر کیا تھا چند دنوں کے اندر اندر تیری ماں  
رخصت ہو کر لاہور چلی گئی۔ لاہور سے قلعہ ستار شاہ کا  
آدھ گھنٹہ سے بھی کم فاصلہ ہے مگر تیری ماں نے یہ  
فاصلہ کبھی طے نہ کیا اپنی عمر گزار دی اور کبھی پلٹ کر  
گاؤں نہ آئی۔

آپ کو یاد نہیں آئیں ماما؟

ہاں بہت یاد آتی تھی رات کے پچھلے پہر اٹھ اٹھ کر  
میں اس کے بستر کی سلوٹس دور کرتی تھی، تکیہ سینے سے  
لگائے اس کے بالوں کی خوشبو اپنے اندر سمیٹتی رہتی تھی۔  
تیرا نانا مجھے جھلی، پنگی، دیوانی اور نجابے کیا کیا کہتا تھا پھر  
ایک رات وہ سویا تو دوبارہ نہ اٹھا، تیری ماں نے نہ آنا  
تھا نہ آئی۔ بخت آور کی شادی کی رخصتہ ٹیگ لینے تک  
نہ آئی۔ اللہ نے اسے بیٹا دیا، اس کا عقیقہ کیا، اس کے  
ختنے ہوئے گھر میں باری باری ساری خوشیاں سارے غم  
آئے نہ آئی تو تیری ماں نہ آئی۔

آنسو نانو کی آنکھوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو  
رہے تھے میرا حلق خشک تھا اور میں ماں کی محبت کی پیاسی  
ان کے سینے پر سر رکھ قطرہ قطرہ ان آنسوؤں کو چیتی  
رہی یہ نانو کے آنسو نہیں تھے ممتا کا زم زم تھا۔  
جمال تمہیں معلوم ہے محبت اور ممتا میں کون بڑا  
ہے؟

مجھے نہیں معلوم شاید محبت شاید ممتا یا شاید دونوں  
برابر ہوں۔

ہاں یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب اسماعیل ایڑیاں  
رگڑیں تو محبت جوش میں آ کر چشمہ جاری کر دے، ممتا  
زم زم کہے تو بہتا پانی ٹھم جائے شاید کسی کو کسی پر فوقیت  
نہیں محبت خدا ہے تو ممتا خدائی صفت ممتا پالتی ہے تو  
محبت پرورش کرتی ہے۔

بولتے بولتے نور العین کا حلق خشک ہو گیا تھا پانی  
لینے جب میں فرج تک گیا تو معلوم ہوا کہ آٹھ بج

مرچوں والی، تیری ماں کو بھی بہت پسند تھی وہ درختوں  
سے ہری ہری اسی توڑ کر کچر کچر کھاتی بخت آور تیرے  
مائے کے مانگنے پر بھی اسے نہیں دیتی تھی۔ پھر ایک دن  
ٹنگ آ کر بخت آور نے مزارع کو بتلادیا تھا۔

”چاچا دھیان سے سویا کر یہ میری بہن رخشورات  
کو تیرے آم چراتی ہے“

کر مونے ہستے ہستے ترے نانے کو بتلادیا تو انہوں  
نے اسی روز سے کچے آموں کی ٹوکری گھر منگوانا شروع  
کر دی۔ مگر تیری ماں نے اسے چھو اتک نہیں۔

”جو مزار درخت سے توڑ کر کھانے میں ہے وہ  
ٹوٹے ہوئے آموں میں کہاں۔“

ایک رات کچی پکی سی چاندنی تھی میں نے دیکھا  
کہ رخشندہ دے پاؤں اپنے پلنگ سے اتری پہلے اس  
نے اے کو پھر مجھے دیکھا اور بے آواز چلتی ہوئی گھر سے  
باہر نکل گئی۔ اپنے سلیم پر پہن کر میں بھی اس کے پیچھے  
پیچھے گئی۔ مرن جو کی کوئی کیڑا وغیرہ کاٹ لے تو..... میں  
بوڑھی عورت وہ جوان جہاں تیز تیز چلتی وہ آموں کے  
باغ میں گھسی ایک بڑی ٹہنی کا سہارا لیا اور پرچڑھ گئی۔

کافی دیر بعد اس نے پیڑ سے چھلانگ ماری اس  
کے ہاتھ میں اسی نہیں تھی شاید کھالی ہو کیونکہ وہ بار بار  
اپنے ہونٹ صاف کر رہی تھی۔ ابھی میں اسے آواز  
دے کر بلانے والی ہی تھی کہ اسی درخت سے کوئی اور  
دھم سے کودا، دھوئی کی ڈب سیدھی کی پگڑی کو کس کر سر  
پر جمایا اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا کمادوں کے کھیت میں  
جا گھسا۔ پھر نانو پھر کیا ہوا؟

نانو نے ایک نظر نور الہدیٰ پر ڈالی وہ گہری نیند کے  
مرے لوٹ رہا تھا۔ پھر ایک دن تیرا دادا گاؤں آیا اس  
نے پہلے ڈبوڑھی میں رخشندہ کے اے سے کوئی بات  
وات کی پھر مجھے بھی وہیں بلا لیا۔

”بھابی منصور نے رخشندہ سے رشتہ کا انکار کر کے  
جو کا لک میرے منہ پر ملی تھی میں اس کی سزا کا مستحق  
ہوں، منصور نہیں تو اس کے چھوٹے بھائی نصیر کو اپنی  
فرزندگی میں لے لو رخشندہ میرے گھر کی بہو بنے یہ

میں نے پلیٹ اٹھا کر کھڑکی کھولی۔ آ آ پیچ پیچ کی آواز نکالی اور ہڈیاں باہر پھینک دیں۔

یہ تم کے بلا رہے تھے؟

یہاں ہوٹل میں ایک سیاہ رنگ کا بلا رہتا ہے جو ہم سب طالب علموں کا بوائے فرینڈ ہے ہم کچھ بھی کھائیں اس کا حصہ ضرور نکالتے ہیں بھوک محبت سے زیادہ کڑا امتحان ہے۔

نور العین کچھ دیر تک چپ رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو کچھ یاد کر رہی ہو.....

ایک شام بابا اچانک گاؤں آئے نانو کو ماما کی شدید بیماری کے بارے میں بتایا نانو بیماری کا بپتی جیسی بیٹھی تھیں اسی طرح اٹھ کر لاہور چلی آئیں، آئی سی یو وارڈ میں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ دروازے پر لگے ششے سے بھی نانو جھانکی تو بھی بابا، ماما چاچو سخت پریشانی کے عالم میں برآمدے میں ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ تایا منصور خاموشی سے صوفے پر بیٹھے خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ ہر شخص آنکھوں آنکھوں میں دوسروں کو تسلی دے رہا تھا اور خود دل ہی دل میں نہایت خوف زدہ تھا۔

میں اس وقت ششے سے اندر جھانک رہی تھی جب نرس نے میری رخشندہ کا سر تھوڑی تک باندھ دیا، پیروں کے دونوں انگوٹھے ملا کر کس دیئے سفید چادر منہ تک ڈھانپ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں چکر اکر نیچے گری تو تیرے بابا، تایا بھاگ کر آئے مانی نے ششے سے اندر جھانکا اور روتا ہوا باہر نکل گیا۔ میری رخشندہ اپنی یادگار بلائی صورت میں ہمیں چھوڑ کر خود دنیا سے چلی گئی وہ اپنے حصہ کا صحرا پار کر چکی تھی۔ تھر کا ریگستان سسی کے قدموں سے بھرا ہوا تھا.....

جب تجھیز و تمھیز کے تمام مراحل پورے ہو گئے پر سے کے لئے آئے مرد و زن واپس اپنے اپنے گھر دوں کو چلے گئے تو میں نے دیکھا منصور کی بیوی کے ایک جانب تو بچی اور دوسری طرف نور الہدیٰ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں ممتا چہرے پر افسوس اور ٹھیس دونوں

رہے ہیں میں نے پانی کا گلاس پکڑا لیا۔ کہا نور جی سی ہاسٹل سے نیو کیپس تک کوئی وگن ڈائریکٹ نہیں جاتی مجھے دوہیں بدل کر جانا ہوتا ہے۔ وقت کم ہے اور آج میرا پیپر ہے۔ ہو سکے تو تم سو جاؤ، تھوڑی دیر آرام کر لو، میں پیپر دے آؤں پھر باتیں کریں گے۔

نور نے نہایت تابعداری سے میری بات مان لی ٹیکے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا۔ ہاتھ پر اپنا گال رکھا آنکھیں بند کیں اور کبل اوڑھ کر سو گئی۔

مجھے معلوم نہیں اس روز پیپر میں کیا سوال آئے تھے میں نے کیا جواب لکھے میں تو ریکارڈ کی مانند محبت، ممتا، چشمہ، زم زم کے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ انگریز امیر نے ٹائم از اور کا اعلان کیا میں Answer sheet دے کر ہال سے باہر نکلا، سٹیم روست، چپس اور دودھ کا پیکٹ لے کر واپس ہاسٹل آ گیا۔ نور ابھی تک سو رہی تھی ایک اچانک سا خوف دل میں سیٹھ میں نے کھل بٹایا سانس کا زیرو بم قائم تھا اور ارباب نفاذ قدر ابھی نور العین تک نہیں آئے تھے۔

میں نے سارا سامان میز پر رکھا، سٹول گھسیٹ کر آہستگی سے پلنگ کے نزدیک کیا اور بڑی محویت سے بہت محبت سے نور کے چہرے کو نکتا رہا۔ نجانے کتنے گھنٹے گزر گئے یا شاید زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ وہ اٹھ بیٹھی اس نے پہلے مجھے پھر میز کو دیکھا۔ ایک بات کہوں جمال انہیں یہاں سے اٹھا لو۔

تم نے رات سے کچھ نہیں کھایا یا شاید کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔

ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر کھانے کی چیزیں یہاں رہنے دو بانی اٹھا دو مجھے کراہت آرہی ہے خالی معدہ ہونے کے باوجود مجھے الٹی ہو جائے گی۔

میں نے اٹھ کر دودھ کا پیکٹ فرج میں رکھا، سٹیم کا پیکٹ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلے وہ ہولے ہولے پھر جلدی جلدی منہ چلانے لگی۔ مرغ ختم کرنے میں اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ جب پلیٹ میں ہڈیاں بچ گئیں تو اس نے چپس کی طرف ہاتھ بڑھایا

اہم خبر

# گلوبل سکول اینڈ کالج آف ایکسیلینس فار گرلز

نمایاں خصوصیات :

- ★ تجربہ کار اساتذہ
- ★ بہترین لیبارٹریز
- ★ انتہائی مناسب فیس
- ★ بہترین تعلیمی ماحول
- ★ بس سٹاپ سے چند قدم کے فاصلے پر
- ★ بہترین کشادہ بلڈنگ
- ★ شام کی کوچنگ کلاسز
- ★ 100 فیصد تعلیمی ماحول
- ★ ضرورت مند طلباء کیلئے خاص رعایت
- ★ پہلی 20 طالبات کیلئے داخلہ مفت

داخلے جاری ہیں

8th, 9th, 1st Year (FA, F.Sc)  
ICS, I.Com

مین سروسید روڈ کالج سٹاپ گدوال واہ کینٹ

فون نمبر: 051-4530591

جانب سے گیلی تھی۔ اس نے نور الہدیٰ کے رزق میں تجھے شریک کیا یا تیرا پیٹ اپنے بچے کا پیٹ کاٹ کر بھرا یہ تو مجھے معلوم نہیں مجھے احساس تھا تو صرف یہ کہ میری رخشندہ مرگئی تھی۔ مگر میری ماں زندہ تھی۔ میں اسی روز گاؤں واپس آئی اور پھر اس ظالم شہر کی بے دردگیوں میں دوبارہ کبھی نہیں گئی۔

چند دن نانو کے گاؤں ٹھہر کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ پھر ایک شام میں ضد کر کے ماما سے ملنے قبرستان گئی۔ پاپا، چاچو نور الہدیٰ سب ساتھ تھے۔ اس روز ماما کی قبر کی پائنتی بیٹھ کر میں دیر تک روتی رہی۔ ہم سب رورہے تھے۔ دل ہی دل میں قرآنی آیات کا درد کر رہے تھے۔ پھر نور الہدیٰ گاڑی سے سورۃ یٰسین لے آیا۔ نامعلوم کتنی دیر تک میں تلاوت کرتی رہی سورۃ ایک بار ختم ہوتی تو میں دوبارہ شروع کر دیتی۔ ماما کے قدموں میں سر جھکا۔ بے ان کے پیر پکڑے میں روتے روتے بے حال ہو گئی۔ تبھی گلاب کی خوشبو سے بھر ایک ریلا سا فضا میں در آیا۔ ہم سب نے وہ خوشبو محسوس کی، پاپا شدت غم سے کانپ رہے تھے۔ چاچو کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ نور الہدیٰ ہکا بکا حیران کھڑا تھا کہ موذن نے مغرب کی اذان دی۔ ہم سب مرے مرے قدموں سے چلتے قبرستان سے باہر آ گئے۔ گورکن نے قبر پر پانی چھڑکا گلاب کا ایک تازہ پھول ماما کے سر ہانے رکھا اور ہمارے بے حد اصرار کے باوجود اس نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔

صاحب جی میں اپنے دادا کے زمانے سے اس قبرستان میں گورکن ہوں، پھر باپ کی مدد کرتا رہا اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں یہیں اسی احاطے میں پلا بڑھا، آئے دن تدفین کرنا ایک عام سا کام بن چکا ہے۔ مگر جو خوشبو آج میں نے محسوس کی ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ وہ خوشبو دنیا کی تمام خوشبوؤں سے مختلف تھی۔ پیسے دیکر مجھے اس لذت سے محروم نہ کریں۔ میں نے تو دنیا ہی میں جنت کی ہوا پالی اب مجھے آپ کیا دیں گے۔ میں آپ سے کیا لوں گا۔ اللہ نے مجھ پر اپنا

کرم بکھرا کر دیا ہے۔ یہ انعام میرے لئے کافی ہے وہ سسکتا ہوا ہم سے دور چلا گیا اور ہم روتے ہوئے گھر آ گئے۔

آنسو اب بھی نور کی آنکھوں سے رواں تھے، مغرب کی اذان بہت دیر ہوئے ہو چکی تھی۔ ابھی شاید تھوڑی دیر تک عشاء کی اذان بھی ہو جائے۔

جمال میری خاطر تم ایک بار اس شادی میں شریک ہو جاؤ واپس آ کر بیک مجھے کچھ مت بتانا میں پوچھوں گی بھی نہیں۔ صرف تمہاری ان آنکھوں کو چوم کر یہاں سے رخصت ہو جاؤں گی۔ جنہوں نے نور الہدیٰ کو دیکھا ہوگا۔

تم جاؤ گے مانی؟

ہاں میں ابھی چلا جاتا ہوں۔

ارے کپڑے وغیرہ تو بدل لو۔

سنو میں اپنی آنکھوں میں نور الہدیٰ کا عکس سینے جا رہا ہوں شادی میں شریک ہونے نہیں۔ میرا لباس میلا ہو یا میرا جسم گرد آلود اس سے کیا فرق پڑے گا۔

جی سی ہاسٹل سے نکل کر میں نے اچھرہ کی ویگن پکڑی، اچھرہ سے میں ٹھوکر نیاز بیک تک آیا وہاں سے چنگ پچی میں بیٹھ کر شوکت خانم ہسپتال کے سامنے سے ہوتا ہوا۔ ایڈا ناؤن کے گول چکر پر اتر گیا۔ پوچھتے پوچھتے میں بلا آخر وہاں تک پہنچ گیا۔ جہاں شادی کا اہتمام تھا۔

کھلے میدان میں خوبصورت ونیس شامیانہ لہرا رہا تھا۔ بچے بالے لڑکے لڑکیاں قہقہے لگاتے اکھیلیاں کرتے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ سٹیج پر نور الہدیٰ بیٹھا تھا، ہلکے آسمانی رنگ کی شیروانی پر براؤن کلر کی لیس گلے بازوں اور دامن تک پھیلی تھی۔ براؤن کلر کا راجستھانی صافہ سر پر سجائے وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ وہن شاید ابھی تک پارلر سے نہیں آئی تھی۔ بہت سارے لوگ بہت سارے کام سنبھالے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ تیس، پینتیس سال کا جواں جس کی آنکھوں میں ذہانت تھی، جسم پر نیلے رنگ کا سوٹ فیس سے میچنگ

ثانی باندھے وہ خانساں کو ڈانٹ رہا تھا۔

دیکھو اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا جب تمہیں کہہ دیا ہے کہ پالک چاہے مزیدار لگے یا نہ لگے اس میں کھویا دودھ ہرگز نہیں ملانا۔ خانساں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک ماہر استاد کی طرح اس نے طالب علم کی شرارت بھانپ لی مجھ سے بحث مت کرو جو کہا وہ کرو اور ہاں یاد رکھنا صرف سادہ فروٹ چاٹ بنانی ہے۔ ٹریفٹل بنانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے وہ نور کے مانی چاچو ہوں گے۔ میں نے ایک بار پھر سٹیج کی طرف دیکھا۔ نور الہدیٰ کی شبیہ اپنی آنکھوں میں جذب کی اور جتنی خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس ہو لیا۔

میری جیب میں اس وقت 300 روپے تھے رکشہ والے نے 250 مانگے تو میں بنا کچھ کہے سوار ہو گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میرے ذہن میں ”جب کہہ دیا کہ پالک میں دودھ کھویا نہیں ڈالنا تو نہیں ڈالنا“

”سادہ فروٹ چاٹ بنانی ہے ٹریفٹل بنانے کی ضرورت نہیں“ بار بار گونج رہے تھے۔

واپسی پر میں سارے راستے عشق لا حاصل کے بارے میں سوچتا رہا۔ پانی اور تیل صدیوں ایک ساتھ رہ کر بھی یکجان نہیں ہو سکے۔ میں نور کی زندگی میں تیل کی طرح اوپر اور تیر رہا تھا جب کہ اس کی گہرائی میں نور الہدیٰ کی محبت پھیڑے کھا رہی تھی۔

..... نہیں آج کا دن تو میری خشک ویران زندگی کا روشن ترین کامیاب ترین دن ہے، محبت کی پھیلی سے نور الہدیٰ کا کاغذ نکل چکا ہے، نور تنہائی کے ریزار میں اب کبھی آبلہ پانہ ہوگی۔ میں اس کے لکڑوں میں چبھے تمام کانٹے نکال دوں گا۔ راستے میں پھیلی تمام خود رو جھاڑیاں، تمام بدبودار یادیں، ناکامیوں کے سارے جنگل سے بے اطمینانی کی بدروسب ختم کر دوں گا، اسی ایس ایس پر لعنت بھیج کر نور کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر ہاسٹل کی سیڑھیاں اتر جاؤں گا، اپنے ہم قدم کے ہمراہ

داتا صاحب کو سلام کر کے راوی پل سے ہوتا قلعہ ستار شاہ چلا جاؤں گا۔ جہاں نور کی نانویں ہیں جہاں اس کا ماموں ہے۔ جہاں اس کے نانا کی قبر ہے، جہاں محبت بھرا کھلا آسمان ہو گا، جہاں خواہشوں، تمنائوں کے لاکھوں کروڑوں ستارے دکھ رہے ہوں گے، کامیابیوں، کامرانیوں کے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان اس امید کی پگڈنڈی پر ہمارے معصوم بچے بھاگ دوڑ رہے ہوں گے۔

ہاسٹل کے سامنے اتر کر میں بھاگتا ہوا کمرے تک پہنچا، نور کروٹ لئے کمرے میں سو رہی تھی، بہت آہستگی سے میں نے سارا کمرہ ٹھیک کیا۔ میلے کپڑے استعمال شدہ برتن اٹھائے، اپنی کتابیں، کاپیاں نوٹس، رجسٹر، پینسل، بال پوائنٹ سیٹ کرقرینے سے میز پر رکھے۔ گیلری والی کھڑکی کھولی تو برآمدے میں لگے بلب کی ہلکی زرد روشنی موند کے پاؤں سے ہوتی سر تک آگئی، گھڑی میں رات کے گیارہ بجے تھے اور آج 23 مئی نہیں 29 دسمبر تھی۔

شول کھینچ کر میں نور کے پاس آ بیٹھا، کمرے میں ہاتھ ڈال کر اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتا رہا۔ آنسو کا ایک قطرہ اس کے بالوں میں اٹکا تھا۔

”نور“ میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا ”یہ تمہاری زندگی کا آخری آنسو ہے، میرا یقین کرو میری محبت پر ایمان لاؤ، تمہاری آئندہ زندگی نہایت پرسکون، نہایت آرام دہ، نامرادیوں، ناکامیوں سے پاک ہوگی۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے کمرے میں اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ نور کے ایک ہاتھ میں ادھ جلی گلابی موم بتی تھی، دوسرے ہاتھ میں 4 انچ لمبی پینسل آنسو کا ایک قطرہ ابھی بھی اس کی پلکوں پر ٹکا تھا۔ اس کا جسم میرے کمرے میں، میرے سامنے میری دسترس میں تھا اور اس کی روح کارکنانِ قضا و قدر بھی کے لئے کر جا چکے تھے۔

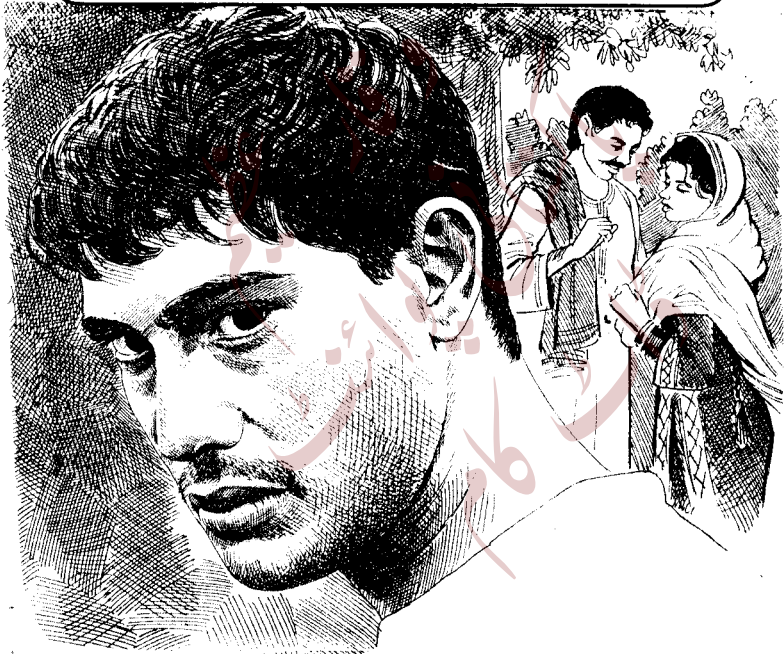
☆.....☆.....☆

## ہم ساتھی داماں

نظارت نصر

محبت دکھ اور سکھ کا حسین امتزاج ہے  
اگر زخم لگ جائے تو یہی محبت مرہم بن جاتی ہے  
اور اگر غم بن جائے تو دلوں کو آسیب زدہ کھنڈرات  
کی مانند ویران کر دیتی ہے۔۔۔۔  
کہ شاید یہی رسم دنیا ہے۔

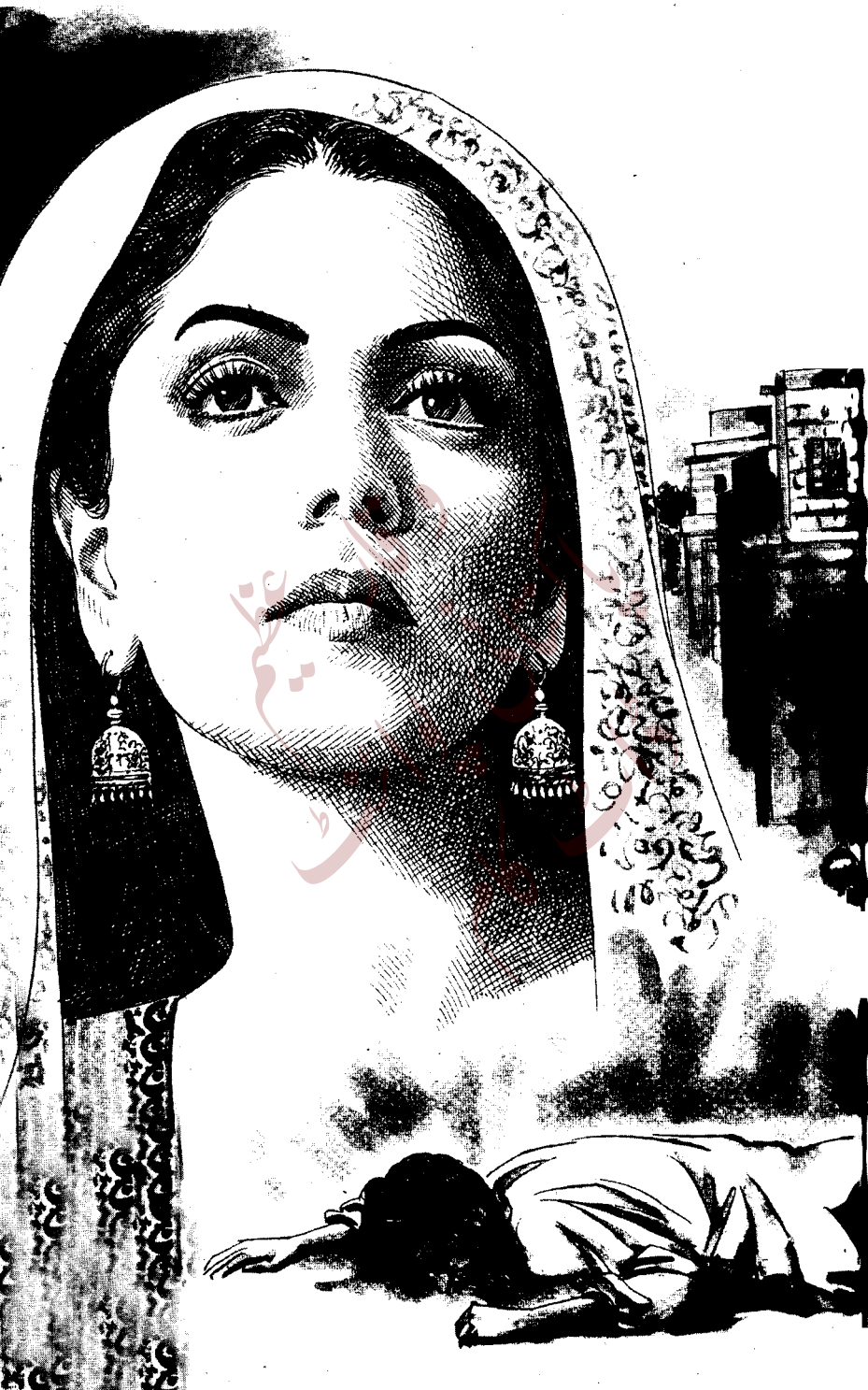
ایک پرائر تحریر جو آپ کو مدتوں یاد رہے گی



ہم محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز  
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھا

کھلی کھڑکی سے چاند کی روشنی کمرے میں آرہی تھی کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔  
جس میں اس کا فیصلہ دبا ہوا تھا۔ تبھی کمرے کا بھاری  
دروازہ ہلکی آواز سے کھلا اور اس کا شوہر اندر داخل ہوا۔  
ہلکی روشنی میں بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ صاف  
نور فشاں کھڑکی کے سامنے چیمڑ پر بیٹھی چاند پر  
نظریں ٹکائے ہوئے تھی۔ آج وہ ایک خطرناک فیصلہ کر





نظر آ رہی تھی، وہ سیدھا کھڑکی کے سامنے بیٹھی نورفشاں کے پاس آیا اور ہاتھ میں تھاما ہوا گفٹ پیک اس کی طرف بڑھا دیا۔

”پپی فرسٹ میرج اینورسری“ اس نے گفٹ اس کی جھولی میں رکھ کر گجر اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے کہا۔ تب ہی اس کی نگاہ نورفشاں کی بند مٹھی پر پڑی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”اس میں کیا ہے؟“ دل میں کہیں یہ خوش گمانی بھی جا گی تھی۔

”ہو سکتا ہے اس میں میرے لئے ہی کوئی تحفہ ہو“ اس نے یہ بات کہہ بھی دی۔

”ہاں اس میں آپ کے لئے ایک تحفہ ہے مگر شاید آپ کو پسند نہ آئے۔“ شاہ کارواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی شادی شدہ زندگی کے پورے ایک سال میں یہ پہلی طویل گفتگو تھی جو نورفشاں نے اس سے کی تھی۔

”تم جانتی نہیں ہو نور کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم کوئی تحفہ دو اور مجھے پسند نہ آئے یہ تو ہو نہیں سکتا۔ تم اگر ایک تنکا بھی دو گی تو وہ میرے لئے سونے سے زیادہ قیمتی ہوگا۔“

اس نے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ خوشی یا شائد اضطراب سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ نورفشاں نے ساکت و جامد نگاہوں سے اس کا پر شوق انداز ملاحظہ کیا اور بند مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔

”یہ آپ رکھ لیں۔ بلکہ واپس لے لیں۔ یہ میرے کام کا نہیں۔“ اس کی ہتھیلی پر جھلک کرتا سچا مونی دھرا تھا جو سونے کی زنجیر میں پرویا ہوا تھا۔ اس نے وہ لاکٹ شاہ کی ہتھیلی پر دھر دیا۔ وہ گنگ سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

بہت مضبوط جسامت کے مالک اس فحش کا بدن اس وقت واضح طور پر لرز رہا تھا۔ اس کی بے یقینی سے پھیلی ہوئی آنکھیں نورفشاں کے سپاٹ چہرے پر گڑی تھیں۔ مگر وہ رخ موڑ چکی تھی۔ وہ چند لمحے اسی طرح

کھڑا رہا پھر اس کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے۔ اس نے مٹھی بھینچ لی اور ٹھٹکے قدموں اور جھکے کندھوں کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆.....☆☆

ہسپتال کی فضا اسے گھٹن آمیز لگتی تھی۔ اسی لئے وہ رات کے کسی پہر سب کی نظر بچا کر ہسپتال کی پچھلی طرف نکل آیا۔ آج اس کا درد قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ آج کے دن اس کی شادی ہوئی تھی وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آیا تھا۔ کھانسی کا ایک شدید دورہ اسے پڑا تھا مگر وہ سنبھل گیا۔

ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا مگر وہ رکنا نہیں۔ اسی طرح خود سے بھی بے گانہ چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد برف باری رک گئی اور آسمان کھڑ گیا۔ ٹھنڈک میں یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ چاند نے اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کرب آمیز آہ نکلی۔

”اے خدا کسی کو محبت کا روگ نہ لگانا۔ یہ بڑا ظالم درد ہے۔ اس کو سہنے کے لئے میرے حوصلے کم پڑ رہے ہیں۔“

وہ وہیں گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ نرم برف دب گئی تھی۔ آسمان صاف ہونے کی وجہ سے ٹھنڈک میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ناکانی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں نیلی ہو رہی ہیں۔ مگر انہیں نظر انداز کر کے آگے کو جھک کر وہ نرم برف کو انگلی سے کھود کر ایک تصویر بنانے لگا۔

تب اسے عرصے کے بعد یاد آیا کہ وہ کبھی بہت اچھا مصور رہا ہے۔ پورے دل و جان سے وہ تصویر کی طرف متوجہ تھا۔ اتنا کہ اسے اپنی بڑھتی ہوئی تکلیف کا بھی احساس نہیں تھا۔ مشرقی افق پر سفیدی پھیلی تو وہ تصویر تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ تکمیل کے احساس کے ساتھ ہی اسے اپنی تکلیف کا احساس ہوا۔ وقفے وقفے سے پڑنے والے کھانسی کے دوروں کو اس نے اہمیت نہیں دی تھی۔

نظروں سے اسے گھر سے نکلتے دیکھا۔  
 ”یہ اپنے ابا کی کوئی بات نہیں نکالتی۔ میں ان سے  
 کہوں گی کہ اسے سمجھائیں۔ بیٹی ذات ہے ضد عورت کو  
 برپا کر دیتی ہے۔ کل نہ جانے کیسا گھر طے۔ یہ کیسے  
 دہاں گزار کرے گی۔“ سارا دن وہ اسی ادھیڑ پن میں  
 رہیں۔

☆☆.....☆☆

”نوری.....!“

”کیا ہے؟“ وہ تنک کر بولی تھی۔

”پرچوں کے بعد تم کیا کر دو گی؟“ سیکنہ نے سوال  
 کیا۔ آج ان کا سکول میں آخری دن تھا۔ اس کے بعد  
 بہت سے چہرے مجھڑ جانے والے تھے۔ جو شاید زندگی  
 کی بھیڑ میں بھی نہیں ملتے۔ نوری نے جواب نہیں دیا۔  
 بس خاموشی سے اپنی گلابی ہتھیلیوں کو دیکھتی رہی۔

”چلو غصہ تھوک دو..... میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا  
 تھا۔ میں جانتی ہوں میرا بھائی تمہارے قابل نہیں ہے۔  
 تمہیں تو کوئی شہزادہ بیاہنے آئے گا۔“

سیکنہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔  
 نوری نے جواب نہیں دیا تھا مگر اس کے چہرے کے  
 گہڑے تاثرات کنٹرول میں آ گئے تھے۔ بات کوئی  
 خاص نہیں تھی۔ بس جذبات میں سیکنہ نے اس سے کہہ  
 دیا تھا کہ وہ اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی اور اس کا حل  
 یہ ہے کہ وہ اسے اپنی بھالی بنانا چاہتی ہے۔ اتنی سی بات  
 پر نوری بھڑک اٹھی کہ سیکنہ کی ہمت کیسے ہوئی اسے اپنے  
 بھائی کے لئے سوچنے کی۔ سیکنہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس  
 ہو گیا تھا۔ سو اس نے بھی لمحہ ضائع کئے بغیر اس سے  
 معافی مانگ لی۔ تھوڑی کوشش کے بعد وہ اس کا موڈ  
 بحال کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”بات سنو سیکنہ ہم دونوں اس کے بعد کالج میں  
 داخل ہو جائیں گے۔ ہم شہر میں جا کر پڑھیں گے  
 بولو..... میرا ساتھ دو گی نا تم۔“ وہ بڑے جوش سے پوچھ  
 رہی تھی۔ سیکنہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آتی  
 تھی۔

مگر اب درد پینا مشکل ہو رہا تھا۔ بلکہ شاید ناممکن  
 بھی۔ اس نے حسرت سے اپنی بنائی تصویر کو دیکھا۔ بالکی  
 روشنی میں تصویر بہت واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر وہ اس  
 پر نظر جمائے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہونے کی کوشش  
 کرنے لگا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ بہت دیر ایک ہی  
 پوزیشن میں بیٹھے رہنے سے اس کی ٹانگیں شل ہو چکی  
 تھیں اور وہ انہیں سیدھا کرنے سے قاصر تھا۔ تب اس  
 نے اپنی نیلی پڑتی انگلیوں سے برف پر ایک فقرہ بھی لکھ  
 دیا۔ اسی وقت اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے  
 پہلو میں شدید درد اٹھا تھا۔ اسے لگا اسے کھانسی کا ایک  
 شدید دورہ پڑنے والا ہے۔ مگر کھانسی کی بجائے اس کی  
 سانس بند ہو رہی تھی۔ اس نے سانس لینے کے لئے اپنی  
 پوری کوشش کی مگر ناکامی ہوئی وہ اس تصویر کے سامنے  
 ہی سجدہ ریز ہو گیا۔

☆☆.....☆☆

”بات سن میری..... اس طرح ضد نہ کیا کر،  
 لڑکیاں ضد کرتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔“

آپاجی نے اس کے سامنے پراٹھا رکھتے ہوئے  
 دھیسے لہجے میں کہا۔ مگر وہ بے نیازی سے جلدی جلدی  
 پراٹھا کھانے لگی۔ آپاجی گہرا سانس بھر کر رہ گئیں۔ اتنی  
 بڑی ہو گئی تھی مگر عقل نام کو نہ تھی۔ اسے سکول سے دیر ہو  
 رہی تھی مگر اس نے ضد کر کے ان سے پراٹھا بنوایا تھا۔  
 صبح ناشتے میں پراٹھا ہی کھاتی تھی۔ ایک ہی ایک تو ان  
 کی بیٹی تھی۔ اولادیں تو کئی ہوئی تھیں۔ مگر سب بچپن  
 میں ہی فوت ہو گئیں۔ اور یہ ہزاروں منتوں مرادوں  
 سے پیدا ہوئی، لاڈلوں سے پروان چڑھی تو اس میں ضد  
 بہت پختہ ہو گئی تھی۔

اور آپاجی اسی بات سے پریشان تھیں یہ ضد اسے  
 آنے والی زندگی میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی  
 تھی۔ وہ کوئی چھوٹی بچی تو نہ تھی کہ اسے مار کر سمجھا لیا  
 جاتا۔ اس سال میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔ اور  
 گاؤں کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ مگر ضد کے  
 معاملے میں بھی سب سے آگے تھی۔ انہوں نے پروسج

طور پر لڑکیوں کی تعلیم کو۔ اسی وجہ سے ان کے گاؤں میں لڑکیوں کا کوئی سکول نہیں تھا۔ ماسٹر صاحب نے خود تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹی کو قریبی گاؤں کے سکول میں بھیج کر تعلیم دلائی۔ انہیں اپنے اس اقدام کے لئے گاؤں والوں کی طرف سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی طرح بھی نوری کی فرائض پوری نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم اس میں یہ بات نوری کے سامنے کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

☆☆.....☆☆

ماسٹر اللہ یار بہت حیران ہونے ساتھ ساتھ خوش بھی تھے۔ ان کی اکلوتی لاڈلی کے لئے گاؤں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے پیام آیا تھا۔ لڑکا بھی خوش شکل اور پڑھا لکھا تھا۔ اپنی زمینوں پر کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی بڑی دکان بھی بنائی ہوئی تھی۔ جسے اس کی غیر ممبر جودگی میں اس کی ماں چلاتی تھی۔ لڑکا تھا بھی اکلوتا۔

ماسٹر صاحب کو سب سے زیادہ جو چیز پسند آئی تھی وہ لڑکے کا میٹرک تک تعلیم یافتہ ہونا تھا۔ سوانہوں نے پیام لانے والے سے کہا۔

”بھائی صاحب! میں گھر میں مشورہ کر لوں پھر آپ کو بتا دوں گا۔“ آپا جی سنتے ہی بے چین ہو گئیں۔

”نور کے ابا جلدی سے ہاں کر دیں۔ لڑکا ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ یہ مشکل ہو گا۔ اگر اس کی ممکن ہو گئی تو اس کا دھیان پڑھائی سے ہٹ جائے گا۔“

آپا جی کا بس نہ چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی اسے رخصت کر ڈالیں۔ وہ اس کی ضد سے خائف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے ماسٹر جی کو منا کر دم لیا۔ شاہنواز کو شرف قبولیت بخش دیا گیا تھا۔

وہ لوگ اتنے بے چین ہو رہے تھے کہ اگلے ہی ہفتے مگنی کے بجائے نکاح کی تقریب رکھ ڈالی۔

”اب بول نوری میڈم! تم تو کہتی تھیں کہ آگے پڑھنا ہی اب تو خوش خوشی نکاح پڑھوا لیا۔ پتہ بھی ہے

”بی بی! کس خوابوں کی دنیا میں رہتی ہو۔ پتہ بھی ہے کہ ہم گاؤں کی دو ہی لڑکیاں ہیں جنہیں میٹرک کرنے کی اجازت ملی ہے، میرے رشتہ دار تو پہلے ہی ابا اماں کو طعنے دے رہے ہیں کہ بیٹی کو دوسرے گاؤں میں پڑھنے بھیج دیا ہے، دیکھنا ایک دن چاند چڑھائے گی۔ لہذا میں تو اگر نام بھی لوں گی آگے پڑھنے کا تو میرے گھر میں طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ نہ بابا نہ..... مجھے تو معاف ہی رکھو..... یوں بھی زیادہ پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ وہی گھر کا چولہا چوکا اور بھینوں کا گوہر ہی تھا پنا ہے تو یہ کام میٹرک کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے..... ویسے بھی زیادہ پڑھ لکھ کر ایس آکھوں میں سہانے خواب اتر آتے ہیں جن کی تعبیریں انسان کو لبوہان کر دیتی ہیں۔“

وہ خاموش ہوئی تو نوری نے فوراً کہا۔

”مطلب کیا ہے تمہارا اس کو اس سے۔“ سیکنہ چند لمحے خاموش رہی۔

”یہی کہ میں آگے پڑھ نہیں سکتی۔ مجھے اجازت ہی نہیں ملے گی۔ پھر خواخواہ میرا بھی دل چاہے گا کہ میں نے اتنا پڑھ لیا ہے تو کہیں نوکری بھی کر لوں اور تو جانتی ہے کہ یہ بات سنتے ہی میرے گھر والے مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔ میں ایسا خواب ہی دیکھنا نہیں چاہتی۔“

اس کے انداز میں مایوسی سی تھی۔ نوری نے بغور اسے دیکھا۔

”مگر میں نے تو فیصلہ کیا ہے کہ میں آگے بھی پڑھوں گی اور یاد رکھنا میں پورے گاؤں کی پہلی لڑکی ہوں گی جو نوکری بھی کرے گی اور دیکھنا ایک دن یہی گاؤں والے بڑے فخر سے میرا نام لیا کریں گے۔“

سیکنہ نے تاسف سے سر ہلایا کہ اب آپا جی کے گھر میں طوفان ضرور آئے گا۔ وہ جانتی تھی کہ ماسٹر اللہ یار لاکھ تعلیم کے قدر کرنے والے علم دوست انسان تھے۔ مگر اسے شہر بھیجنے کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے گاؤں میں تعلیم کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خاص

کہ شاہ کے گھر والے اسی سال رخصتی بھی کروالیں گے۔“ آگے پڑھنے کا خواب کیا ہوا؟“ سیکنہ نکاح کی مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ اسے چھیڑ بھی رہی تھی۔ وہ شرمائی ہوئی مسکراتی رہی۔

”کچھ نہ پوچھو سیکند! میرے سب خیالات یکدم بدل گئے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ شاہ کی بہن اس کا پیغام لائی ہے کہ میں آگے پڑھنے کا ارادہ کر کے اس کی محبت کا امتحان نہ لوں اور شادی کی تیاری کروں تاکہ وہ جلد سے جلد مجھے پا کر بامراد ہو سکے۔“

نوری بری طرح شرماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سیکنہ کوہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ شوخی سے بولی۔

”تو گویا میں تمہاری شادی پر پہننے کے لئے کپڑے سلوا ہی لوں۔“ نوری شرمائی رہی۔ آپاجی نے اسے شرماتے مسکرائے دیکھ کر کچھ کاساس لیا۔

☆☆.....☆☆

کوئی گھنٹے بھر سے نورشاں آہینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ آپاجی نے اسے کئی مرتبہ آواز دی۔ جانے میں دیر ہو رہی تھی مگر اس کی تیاری ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ خود ہی اندر آن پہنچیں۔

”نوری..... تجھے پتہ ہے کہ وہاں شاہ نواز بھی ہو گا۔ پھر تو اتنی تیاریاں کیوں کر رہی ہے۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔“

آپاجی نے اسکی تیاریوں کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے قدرے ناراض انداز میں کہا۔

”افوہ آپاجی! نکاح ہوا ہے میرا..... میں کوئی لڑکوں کو پھانسنے کے لئے تیار نہیں ہو رہی کہ کوئی باتیں سنائے گا۔ اور یوں بھی مردوں کو سو کام ہوتے ہیں وہ گھر میں تھوڑا بیٹھا ہوگا۔ باہر ہی ہوگا نا۔“

اس نے حسب عادت ان کی بات چٹکیوں میں اڑا دی تھی۔ آپاجی نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔ وہ پہلے ہی بے حد حسین تھی۔ اوپر سے شادی میں جانے کے لئے کی گئی تیاریوں نے اس کے حسن کو دو آتھہ کر دیا تھا۔

آپاجی نے خود کو ہی دلاسا دیا۔ شادی بیاہ میں سب لڑکیاں اسی طرح سے تیار ہوتی ہیں۔ وہ بھی جوان ہے ارمان ہوں گے اس کے دل میں بھی۔ حالانکہ اب سے پہلے وہ کبھی اس طرح تیار نہیں ہوئی تھی۔ بس نئے کپڑے پہن لئے نکلتی کر لی۔ تب بھی محفل میں دور سے ہی نظر آ جاتی تھی۔ مگر اب تو وہ نکاح شدہ تھی۔ پھر عمر بھی ایسی کہ جب ہر لڑکی کے دل میں حسین نظر آنے کی خواہش ہوتی ہے۔

سو اسے ڈانٹنے کا ارادہ موقوف کر کے وہ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ شاہ نواز کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ پورا گھرانہ مدعو تھا۔ وہ دوسرے گاؤں سے آنے والے رشتہ داروں کو اپنی حسین و جمیل بہو سے ملوانا چاہتے تھے۔ اس گھر میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

شاہنواز واقعی گھر میں نہیں تھا۔ آپاجی مطمئن ہو گئیں۔ نوری کی ساس نے اسے ہر معاملے میں آگے کیا ہوا تھا۔ وہ گھر کی اکٹونی لاڈلی بہو تھی۔ آپاجی بیٹی کے چہرے سے پھوٹنے خوشی کے رنگوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

☆☆.....☆☆

”نوری جلدی چل تجھے بھائی بلا رہا ہے..... کہہ رہا تھا نوری سے کہنا صرف ایک بار آ جائے۔ بس چند منٹوں کے لئے۔“

نوری کی چھوٹی مند صفیہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ پریشان ہو گئی۔ پنڈال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔

”نہیں صفیہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت بدنامی ہو گی..... پہلے ہی آپاجی میرے تیار ہونے کو اچھا نہیں سمجھ رہی تھیں۔ اسے کہنا دیکھ تو لیا ہے اب اور کیا چاہیے۔“

شاہ کے دل میں اپنے لئے اس قدر محبت دیکھ کر دل ہی دل میں وہ کچھ مغرور سی ہو گئی۔ صفیہ نے لاکھ سمجھایا، منایا مگر وہ ٹال گئی۔ اس کی ساس اسے بلا رہی

تھیں وہ ادھر چلی گئی۔  
 ”دھیے! بڑے کمرے میں رضیہ کے سوہرے گھر کے لئے کپڑے وغیرہ رکھے ہیں تو وہ صندوق لے آئے۔“  
 وہ فرمانبرداری سے سر ہلاتی گھر کی سمت مڑ گئی۔  
 پنڈال گھر سے باہر کھلے میدان میں شامیانے لگا کر بنایا گیا تھا۔ وہ تختوں والا صندوق لینے گھر میں چلی آئی۔  
 کمرے میں پہنچی تو شاہنواز پہلے سے موجود تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔  
 ”مانا بہت حسین ہو۔ براتی بھی کیا مغدوری کہ شوہر دو گھڑی قریب سے دیکھنا چاہے تو تم آؤ ہی نہیں۔“  
 وہ سکون سے اس کے سامنے آ کر بولا۔ نوری بری طرح بدکی۔  
 ”کیا کر رہے ہیں..... کوئی دیکھ لے گا۔“ جائیں آپ باہر بدنامی کے خوف سے اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔  
 ”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں..... تمہیں لوگوں کا خوف تھا۔ اسی لئے باہر بلوایا تھا۔ چھ ماہ ہو گئے ہمارا نکاح ہوئے مگر ابھی تک روبرو بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ مسکرایا۔  
 ”بلکہ اچھا ہے اس طرح آپ اچھی چیز کی تیاری چھوڑ کر تمہاری رخصتی کر دیں گی۔ ہمارا تو بھلا ہی ہو گا ہے نا۔“  
 نوری بری پھنسی تھی۔ دروازے کے سامنے اس کا لمبا چوڑا وجود ایسا دھتھا۔ وہ باہر نہیں جا سکتی تھی۔ مگر یہاں اس کی موجودگی میں رکنا بھی بہت خطرناک تھا۔  
 اوپر سے اس کی لودیتی نگاہیں۔  
 وہ زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتی تھی۔ کوئی بھی اسے بلانے کے لئے باہر سے آ سکتا تھا۔ دل الگ دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔  
 ”آپ جائیں میں صفیہ کے ساتھ آتی ہوں۔ مگر صرف چند منٹ کے لئے..... پلیز.....“  
 وہ لجاجت سے بولی تو وہ کھل کر مسکرایا۔

”بہت شکریہ..... بڑی نوازش آپ کی بندہ پروری کی جناب۔“ وہ نوری کے سامنے ذرا سا جھکا اور پلٹ کر باہر چلا گیا۔ اپنے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھالتی وہ وہیں چار پائی پر بیٹھ گئی۔  
 ”بھابھی جی! یہاں کیوں بیٹھی ہو تمہیں باہر بلایا جا رہا ہے۔“ صفیہ ہنستے ہوئے اندر آئی تھی۔ نوری جان گئی کہ شاہنواز کو یہاں صفیہ نے ہی بھیجا تھا۔ اور وہ خود باہر موجود رہی تھی تاکہ کوئی اور نہ ادھر آ جائے۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا ضرور مگر کچھ کہہ نہ سکی۔  
 جب سے نکاح ہوا تھا وہ شاہنواز کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ پھر وقفے وقفے سے صفیہ کے ہاتھ بھجوائے گئے شاہنواز کے محبت بھرے پیغامات نے اسے کسی انوکھے جذبے سے متعارف کرا دیا تھا۔ شوہر کے دل میں اپنی اتنی محبت دیکھ کر وہ جھوم جھوم جاتی تھی۔ اس کے قدم دھرتی پر نہ پڑتے تھے اسی کی طرف سے پیغام ملتا تھا کہ شادی میں اچھی طرح تیار ہو کر آنا۔ نوری نے جی جان سے تیاری کی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔  
 ”صفیہ چلو..... مجھے وہاں جانا ہے جہاں تمہارے بھائی نے بلوایا ہے۔“ وہ کچھ شرمائی کچھ گھبرائی ہوئی صفیہ سے مخاطب ہوئی۔  
 ”اچھا جی جب میں نے کہا تھا تو صاف انکار کر دیا تھا۔ تب بھی تو اسی کا پیغام تھا۔“ وہ تنک کرنے کے موڈ میں تھی۔  
 ”وہ اور بات تھی۔ روبرو آ کر جان بھی مانگ لے تو بندہ انکار نہ کر پائے۔“  
 آخری فقرہ اس نے بڑبڑا کر کہا تھا۔ صفیہ ہنستی رہی۔ کچھ دیر بعد اسی نے جانے کیا کہہ کر باہر جانے کی اجازت لی تھی اور اسے لے کر اپنی سہیلی کے گھر کے پچھواڑے آ گئی جہاں دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک گھنے پیڑ تلے شاہ نواز ان کا انتظار کر رہا تھا۔  
 صفیہ وہیں رک گئی۔ نوری لڑکھڑاتی چال کے ساتھ شاہ نواز کے سامنے جار کی۔ اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ

اس جیسی لا پروا اور خود میں مگن رہنے والی لڑکی پر کبھی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ وہ کسی اور کی خوشی کی فکر میں مبتلا ہو جائے گی۔

شاہ نواز کی پرشوق نگاہیں اس کے صبح چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ گلابی لباس کا عکس اس کے چہرے پر بھی عیاں تھا۔ لبوں کی تراش میں شرمیلی مسکراہٹ دبائے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

شاہ نواز نے اس کے بے مثال حسن کو بے ساختہ اور جی بھر کر سراہا اور آگے بڑھ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا گلابی گلاب کا پھول اس کے بالوں میں اٹکا دیا۔

”صفیہ دیکھ رہی ہے۔“ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے کہا حالانکہ اس کی صفیہ کی طرف پشت تھی۔ وہ ہنسا.....

”وہ میری بہن ہے۔ اسے پتہ ہے کہ یہ وقت صرف ہم دونوں کا ہے۔ وہ دوسری طرف منہ کئے کھڑی ہے۔“

نوری نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کی بے یقینی پر وہ ایک بار پھر ہنس پڑا۔ دونوں کے درمیان بولتا ہوا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوری کا دل بری طرح دھڑک تھا۔

”میں اب جاؤں“ اس گھمبیر خاموشی سے گھبرا کر وہ جلدی سے بولی تھی۔ شاہ نواز نے گہری سانس بھری۔ ”دل تو نہیں مانتا مگر جانا تو ہوگا۔ شادی والے گھر سے زیادہ دیر تک غائب بھی نہیں رہا جا سکتا۔ مگر وعدہ کرو تم کبھی کبھی اسی طرح کچھ لحوں کے لئے مجھ سے ملنے آئی رہو گی۔“

جذبات کی شدت سے اس کا لہجہ بھاری ہو گیا تھا۔ نوری نے لرزتی پلکیں اٹھائیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کتنی آس تھی اس کی نگاہوں میں نوری انکار کر رہی نہ سکی۔ وعدہ کر کے پلٹ گئی۔ شاہ نواز وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

”ارے نوری! کیا کہہ دیا بھائی نے تجھ سے۔ تو تو پہلے سے دگنی حسین ہو گئی ہے۔ اب تو میرا بھی تم پر

عاشق ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔“ صفیہ کی آواز میں واقعی حیرت تھی۔ نوری نے شرما کر اسے دھپ لگائی۔

”چلو جلدی، گھر چلیں۔ آپا جی فکر مند ہو رہی ہوں گی۔“

دونوں واپسی کے لئے مڑ گئیں۔ سارا راستہ نوری اپنی مدھوش چال پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

☆☆.....☆☆

چوہدرائے کے بلاوے پر گھر کی طرف لوٹتے ہوئے شاہ میر کا دھیان بالکل بھی راستوں کی طرف نہیں تھا۔ کل ہی وہ پڑھائی مکمل کر کے شہر سے گھر لوٹا تھا اور صبح سے کھیتوں کی سیر کو نکلا ہوا تھا۔ ادھر ادھر پھرتے پھراتے، درختوں سے تازہ پھل اتار کر کھاتے اور ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے اسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ چوہدرائے نے اسے بلانے کے لئے ملازم بھیجا تھا۔

چوہدرائے اب اس کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ مگر ایسے اپنے ناموں کی بیٹی ربیعہ اس لحاظ سے بالکل پسند نہ تھی۔ آج کے کھانے پر اس کی ماں نے ربیعہ کو بطور خاص شاہ میر سے ملوانے کے لئے بلوایا تھا۔

شاہ میر کوئی خشک قسم کا انسان نہیں تھا۔ نہ ہی اسے شادی سے الرجی تھی۔ مگر یہ عجیب اتفاق تھا کہ اسے آج تک کوئی لڑکی اس نقطہ نظر سے بھائی ہی نہ تھی۔ خود وہ ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ دراز قامت، بھوری آنکھوں، گوری رنگت پر بہت سی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ مگر اس کے دل میں کسی چہرے نے کوئی پانچل نہ بچائی تھی اور وہ اسی ایک بات کو اہمیت دیتا تھا۔

”جو لڑکی میرے دل کی زمین پر محبت کا پودا لگاے گی وہی شاہ میر کی دہن بنے گا۔“

ہر مرتبہ شادی کے لئے کئے جانے والے اصرار کے جواب میں وہ ہنس کر جواب دیا کرتا تھا۔ جبکہ اس کی ماں اپنی بیٹی ربیعہ کو اس کی دہن بنانے کا خواب دیکھ بیٹھی تھی۔



دیکھا۔

”سائیں آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“ ملازمہ نے اعتماد سے جواب دیا تھا۔ شاہ میر نے والٹ سے ایک بڑا نوٹ کھینچ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اس کی لوڑ نہیں سائیں۔ میں آپ کی نمک خوار ہوں۔“ ملازمہ ہچکچاتی۔

”رکھ لو، کوئی بات نہیں..... اور ہاں ذرا جلدی لوٹ کر آنا میں منتظر ہوں۔“

ناچاہتے ہوئے بھی وہ اپنی بے تابی کا اظہار کر گیا تھا۔

☆☆.....☆☆

بہت خوبصورتی سے بچے اپنے کمرے میں شاہ میر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے، دل کو سمجھائے یا اپنے والدین کو۔ مگر دل کو سمجھانا اس کے بس میں تھا بھی نہیں۔ ان تین دنوں میں وہ کوئی دس چکر اس کی گلی کے لگا چکا تھا اور صرف دو مرتبہ اس کی مراد برآئی تھی۔ جب اسے وہ لڑکی گلی میں آتے جاتے ہوئے مل گئی تھی۔ اس کے انداز میں اتنی بے اعتنائی ہوتی تھی کہ چاہنے کے باوجود شاہ میر اسے مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔

ملازمہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کا نام نورنشاں تھا۔ وہ اس گاؤں کے سکول ماسٹر کی اکلوتی اولاد تھی۔ مالی حالت بس ایویں سی تھی۔ ایک سکول ماسٹر کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی ہے۔ وہ بھی بمشکل گزارہ کر رہے تھے۔ کوئی زمین بھی نہ تھی۔ اس گاؤں میں چند ایک گھروں کے پاس اپنی زمین بھی باقی سب چوہدری کے مزارعے تھے یا ملازم۔ وہ خود تو اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مگر اس کے ماں باپ کو تو اعتراض ہو سکتا تھا۔

اتنے غریب گھر سے رشتہ جوڑتے ہوئے انہیں اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر ایک بات اس سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ وہ لڑکی گاؤں میں کافی بدنام تھی۔ اس پر الزام تھا کہ وہ دوسرے گاؤں میں پڑھنے جاتی رہی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکیاں بے حیا ہوتی ہیں اور یہ کہ جانے

وہ مگن سا آگے بڑھ رہا تھا۔ جب اسے سامنے سے دو لڑکیاں آتی دکھائی دیں، گاؤں کے ایک گھر میں شادی تھی وہ شاید وہیں جا رہی تھیں۔ اس نے سرسری سی نظر سے انکا جائزہ لیا۔ اس کے رواں قدم ٹھم گئے۔ گلابی لباس والی لڑکی سے اس کی نگاہ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔ کوئی لڑکی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ شاہ میر کا دل ایک لمحے میں اس پر ٹار ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑا ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس کے قریب آتے ہی لڑکی نے ایک پل کے لئے نگاہ اٹھائی تھی۔ سیاہ بھنوراسی آنکھیں دیکھ کر وہ اندازہ نہیں کر پایا کہ اس کا چہرہ زیادہ حسین تھا یا آنکھیں۔ رعب حسن نے اسے لنگ کر دیا تھا۔ لڑکی نے ایک بے نیازی نظر اس پر ڈالی اور خوشبو کے جھونکے کی طرح اس کے پہلو سے نکل گئی۔

وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں مڑا اور ان کے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکیاں سیدھی اسی شادی والے گھر میں گئی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک بے مقصد وہاں کھڑا رہا۔ شاید دل کے کسی گوشے میں ایک تمنا تھی کہ ایک بار صرف ایک جھلک وہ مزید اس سحر طراز کو دیکھ سکے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

یوں بلا مقصد وہاں کھڑا ہونا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ لڑکی کا نام پتہ معلوم نہیں، نہ جانے کون تھی، کہاں کی رہنے والی تھی۔ یہ تو وہ ان چند لمحوں میں جان گیا تھا۔ وہ اس کے حواس پر بری طرح چھا گئی تھی۔ اسے ہر قیامت پر لڑکی کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ وہ مڑا اور سیدھا حویلی پہنچ گیا اور ایک سمجھدار ملازمہ کو بلا کر اس نے کہا۔

”اس شادی والے گھر میں ایک لڑکی ہے، گلابی لباس میں، بالوں میں گلابی پھول لگائے۔ اس کے بالائی ہونٹ کے گوشے میں ایک سیاہ تل ہے۔ مجھے لڑکی کا مکمل نام پتہ چاہیے۔ اور ہاں..... یہ بات میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں نے کسی تیسرے فرد کے منہ سے یہ بات سنی تو.....“

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے غور سے ملازمہ کا چہرہ

## خوبصورت انسانی روپ

☆ جب انسان مال سے محبت کرتا ہے تو قارون بن جاتا ہے۔

☆ جب زندگی سے محبت کرتا ہے تو حضرت بن جاتا ہے۔

☆ جب سلطنت سے محبت کرتا ہے سکندر بن جاتا ہے۔

☆ مگر جب دین اسلام سے محبت کرتا ہے تو

انسان بن جاتا ہے اور یہی سب سے خوبصورت انسانی روپ ہے۔

(ندا عتیق، سرگودھا)

ہی نہیں خود نوری بھی حد سے زیادہ بے چین ہوتی تھی۔ روز روز بہانے کر کے ٹکنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ سلائی کڑھائی کرنے صفیہ کی سہیلی کے گھر جانے لگی۔ اس طرح آتے جاتے گھڑی دو گھڑی کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ موقع مل جاتا تو دو چار جملوں کا تبادلہ بھی کر لیا جاتا تھا۔ شاہ نواز کی محبت و توجہ نے نوری کو کھلے ہوئے گلاب کی مانند شگفتہ کر دیا تھا وہ اور بے تاب ہو گیا اور اماں کو آپا جی کے پاس بھیج دیا۔ مگر ان کا جواب ہنوز وہی تھا۔

”بہن اتنی جلدی کیا ہے۔ نوری آپ کی بہو ہے..... ہم کوشش تو کر رہے ہیں مگر ابھی اس کا داج مکمل نہیں ہوا۔ ہماری ایک ہی دجی ہے اسے کیا خالی ہاتھ رخصت کر دیں۔“

شاہ میر کی اماں خاموشی سے لوٹ گئیں۔ نوری کو پہلی مرتبہ اپنی غربت بری لگی تھی۔ عریصے بعد اسے کتاب میں پڑھی ہوئی ایک بات یاد آئی تھی کہ ہمارے معاشرے کے فضول رسم و رواج بعض اوقات بہت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اگر جیز کا یہ رواج اتنی شدت سے رائج نہ ہوتا تو وہ اب تک رخصت ہو چکی ہوتی۔

اسے اپنے ہی شوہر کو ایک نظر دیکھنے کے لئے طرح طرح کے جتن نہیں کرنے پڑتے۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اسی طرح اس کی محبت بھی اس کے

وہ اس دوسرے گاؤں میں کیا کرتی رہی ہوگی۔

اسی وجہ سے گاؤں کے دیگر لوگوں نے ماسٹر کے گھر جانا ترک کر دیا تھا۔ کوئی ضروری کام ہوتا تو مجبوری میں ان کے گھر جاتے۔ اس میں بھی یہ احتیاط کہ کوئی لڑکی نور افشاں کے پاس نہ بیٹھنے پائے۔ گاؤں کے زرخیز دماغوں کا خیال تھا کہ اس طرح ان کی بیٹیاں بھی آوارہ ہو سکتی تھیں۔

شاہ میر کو یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ اس نے غلط رسم و رواج کے سامنے سر نہیں جھکا یا تھا اور علم کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھی۔

آج کے دن میں کئی چکر لگانے کے باوجود وہ اس کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ پایا تھا اور بہت بے چین تھا۔ اسے نور افشاں کی بے اعتنائی بھی کھلتی تھی۔ آخر وہ اتنا بھی گیا گزارا نہیں تھا کہ کوئی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالے مگر وہ ہر مرتبہ اسی طرح بس ایک نظر دیکھ کر گزر گئی تھی۔

جن آنکھوں میں وہ اپنے لئے چاہت دیکھنے کا متمنی تھا۔ وہاں اجنبیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طویل سانس بھر کر وہ آرام سے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے اپنے وادین کو منانا تھا کہ وہ اس کی خاطر نور کے گھر میں رشتہ لے کر جائیں۔ مگر وہ یہ کتنی مرحلہ کیسے طے کرے گا۔ اس کے دماغ میں اس کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔

سب سے بڑی مخالفت اس کی ماں کی طرف سے ہوتا تھی۔ جو اپنی بیٹی کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ پھر یہ کہ گاؤں والوں کی طرح وہ بھی اسے اچھا نہ جانتے ہوں گے۔ شاہ میر کو اندازہ تھا کہ اس کا یہ مطالبہ گھر کی پرسکون فضا میں طوفان اٹھا دے گا مگر وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اسے یہ بات اپنے ماں باپ سے کرنا ہی تھی۔

☆☆.....☆☆

شاہ نواز نے اپنے دل میں چھپی محبت پوری طرح نہ صرف عیاں کر دی تھی بلکہ اس کے دل میں بھی محبت کی جوت جگا دی تھی۔ اب ملاقات کے لئے صرف وہ

روز انور کا چہرہ دیکھا۔  
نہی۔ آپاجی نے بغور اس

”نور پتیرے ابا کو کسی کے گھر جا کر سلائی سیکھنا اچھا نہیں لگتا۔“ وہ کہہ رہے تھے کہ تجھے وہاں جانے سے منع کر دوں۔

وہ جانے کو تیار کھڑی تھی جب آپاجی نے آہستہ سے کہا۔ نوری کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں کس نے اسے شاہ سے ملے تو نہیں دیکھ لیا اور بات ابا تک پہنچ گئی ہو۔ اس نے متذبذب نگاہوں سے ماں کا چہرہ کھویا۔ مگر وہاں کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ نوری نے گہرا سانس بھرا۔

”میری کچھ چیزیں ہیں وہاں پر..... میں انہیں لے آؤں..... کل سے نہیں جاؤں گی۔“ وہ اٹکتے ہوئے بولی تھی۔

آپاجی نے سر ہلا دیا۔ اندر ہی اندر انہیں حیرت بھی تھی کہ ہر بات پر ضد باندھ لینے والی نوری چپ چاپ کیوں مان گئی تھی۔ شام کو انہیں ماسٹر صاحب کو بھی بتانا تھا کہ انہوں نے نوری کو باہر نکلنے سے منع کر دیا ہے وہ روز بروز بخشنے حسین ہوتی جا رہی تھی۔ انہیں اس کے حسن سے خوف آنے لگا تھا۔ ”ایویں کسی جن بھوت کی نظر پڑ گئی تو مشکل میں پڑیں گے۔“ انہوں نے خود کو مطمئن کیا تھا۔

☆☆.....☆☆

چوہدرائے کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اگرچہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی مگر چوہدرائے کے دل میں خوف بیٹھ گیا کہ اب وہ جلد ہی مر جائے گی۔ ہفتہ بھر ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ آج گھر جا رہی تھی۔ شاہ میر نے شوقی سے کہا۔

”اب تو آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اب اس بیماری کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیں۔ ابھی تو آپ نے بہت سال جینا ہے۔“

گاڑی گاؤں کی جانب گامزن تھی۔  
”بس پترا! میں تو تیری شادی کا ارمان نکالنے کو

زندہ رہی ہوں۔ میں نے مرتے مرتے رب سے التجا کی تھی۔“ مولا مجھے اپنے اکو اک پترا کا دیاہ دیکھ لینے دے۔ میں نے سارے ارمان نکالنے ہیں۔ سب چاء پورے کرنے ہیں۔“ اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔  
”پترا ب مان جا..... کب تک ایسے ہی بھرتا رہے گا؟“

شاہ میر مسکرا دیا۔ اس کی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ موضوع خود بخود چھڑ گیا تھا۔ وہ تو خود اس بارے میں بات کرنے کو بے تاب تھا۔  
”ٹھیک ہے..... مان جاتا ہوں۔“ چوہدرائے کو یقین نہیں آیا۔

”تو سچ کہہ رہا ہے پترا؟..... اب مکرے گا تو نہیں؟“

اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چوہدرائے نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔  
”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں..... مگر میری ایک شرط ہے۔“ اس نے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔  
”ایک چھوٹے میں دس شرطیں ماننے کو تیار ہوں۔ بس تو اپنی بات پر قائم رہنا۔“

شاہ میر نے رک کر سوچا۔ بات پر قائم رہنا اس کے لئے مشکل ہو گیا یا اس کی ماں کے لئے۔ جو ابھی اس کی شرط نہیں جانتی تھی۔

”میں شادی کے لئے تیار ہوں..... ٹھیک ہے..... مگروں گا بھی نہیں۔ اوکے..... مگر شادی اپنی پسند سے کروں گا۔“

وہ ایک ایک فقرہ قول کر بولا تھا۔ چوہدرائے نے اس کا ہاتھ جھک دیا اور خٹکی سے بولی۔  
”یہ تو وہی بات ہے کہ نہ نومن تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔“ شاہ میر زور سے ہنسا۔

”نہیں..... نہیں رادھا..... میرا مطلب ہے کہ لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔ بس آگے آپ کا کام ہے کہ اسے اپنی بہو کب اور کیسے بناتی ہیں۔“

شاہ میر کی بات نے چوہدرائے پر شادی کا مرگ کی

کہیں گے جانے کیا کی تھی پتر میں کہ ایسی بہو پر راضی ہو بیٹھے۔ انہیں کسی اچھے گھرانے نے اپنی لڑکی ہی نہ دی۔ عقل کر کچھ پتر!“

چوہدرائیں جو بولی تھی تو شاہ میر کو خاموش کروا گئی۔ اس نے اپنا نچلاب دانتوں تلے دبا لیا۔ دربار دل میں محبت کی توہین سخت جرم گردانی جاتی ہے۔ اسے بھی یہ باتیں تازیانے کی طرح لگی تھیں۔ سو مصلحت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”میں نے اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ اگر آپ لوگ راضی نہیں تو کوئی بات نہیں۔ مگر پھر آپ میری شادی کا دوبارہ کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ اور میں شہر میں رہوں گا۔ گاؤں میں نہیں“ اس کے لہجے میں عجیب سی پیش تھی۔ چوہدرائیں بیٹے کے تئیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

☆☆.....☆☆

”دیکھو صفیہ! اسے کہنا میں بھی اسی آگ میں برابر جل رہی ہوں۔ لاکھ بے باک سبھی مگر میں اپنے ماں باپ کی عزت کے بارے میں بہت حساس ہوں۔ میری ماں کی آنکھوں میں میرے لئے شک لہرائے یا باپ کو مجھے نوکنا پڑے یہ مجھے گوارہ نہیں۔ آپا جی نے روکا ہے تو کوئی وجہ ضرور ہوگی میں اسے لفظوں میں سننا نہیں چاہتی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بات وہ لفظ مجھے کسی سے نگاہ ملانے کے قابل نہ چھوڑے۔ اسے کہنا ہمت کرے اور اس مشکل وقت کو سہہ جائے۔ جوان مرد وہی ہوتا ہے جو آزمائش کی گھڑی میں پورا اترے۔ اسے یہ بھی کہنا دباؤ ڈال کر شادی کی تاریخ طے کروالے اگر وہ ماسی کو منانے میں کامیاب ہو گیا کہ کم جہیز کوئی جرم نہیں ہے تو اسے کہنا آپا جی ”ہاں“ کہنے میں دیر نہیں کریں گی۔ اب اسے ہی ہمت کرنی ہوگی۔ دوسری صورت میں انتظار کرے جو میں بھی کر رہی ہوں سو وہ بھی کرے۔“

صفیہ کے ہاتھ پیغام میں نوری نے تقریر جھاڑ دی تھی۔ صفیہ بھائی کی بے چینی دیکھ کر آئی تھی یہ صاف جواب سن کر اسے غصہ آ گیا۔

کیفیت طاری کر دی تھی۔ بولی  
”بس پھر ٹھیک ہے میں آج ہی بھائی کے گھر جاتی ہوں۔“ شاہ میر ایک دم سیدھا ہوا۔

”کیا کرنے جائیں گی وہاں؟“ چوہدرائیں نے کہا۔  
”لو تو گھر بیٹھے تو رشتہ طے ہونے سے رہا۔“  
چوہدرائیں نے اچھٹے سے بیٹے کو دیکھا تھا۔ جو بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

”مگر میں ماموں کے گھر شادی کرنا نہیں چاہتا۔“  
ربیعہ بہت اچھی ہے مگر اس حوالے سے وہ مجھے پسند نہیں۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ وہ..... اپنے ماسٹر صاحب نہیں ہیں، اللہ یار صاحب ان کی بیٹی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔“

بلا جھجک ہر بات کرنے والا شاہ میر ماں کے تاثرات دیکھتے ہوئے انک انک گیا۔ چوہدرائیں نے بے یقینی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا جس پر گلاب کھل رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ چندال اس کے بیٹے کو پھانس چکی تھی..... جیسے وہ گاؤں میں مشہور تھی اس سے اس بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔

”کیا ہوا ماں جی آپ ایک دم خاموش کیوں ہو گئی ہیں..... کیا میں نے کوئی غلط بات کر دی؟“ وہ بے چین ہوا تھا۔

”پتر میں نے سوچا تھا کہ تو سمجھدار ہو چکا ہے پتر تو نے انتہائی بے عقلی کی بات کی ہے۔ تجھے علم ہے کہ وہ لڑکی کس قبیل کی ہے۔ ایک وہ کاسے لوک، اوپر سے اس ماسٹر نے دھی کی لگا میں اتنی ڈھیلی چھوڑی ہوئی تھیں کہ دو بے گاؤں تک اکیلی پھرتی تھی۔ بہانہ تھا پڑھنے جاتی ہے۔ سب کو پتہ تھا کہ وہ وہاں کیا پڑھنے جاتی تھی۔ میری بیٹی میں کیا کی تھی۔ جو تو نے اسے چھوڑ کر ایک راہ چلتی کو پسند کر لیا۔ پھر میرا کیا ہے۔ میں تو تیری محبت میں اندھی ہو کر گدگی کو سونے کی ننھ ڈال بھی دوں مگر اپنے باپ کا پتہ ہے نا۔ چوہدری کبھی نہیں مانے گا۔ آخر کو اس کی بھی گاؤں میں کوئی عزت ہے۔ لوگ نہ

”پہلے بھی تو ملتی رہی ہو۔ اب تمہارے پاس وہ دو گھڑیاں بھی نہیں ہیں میرے بھائی کے لئے۔ وہ تمہارے لئے چل رہا ہے اور تم خرے دکھا رہی ہو۔“  
صفیہ کے غصیلے لہجے کا نوری نے برا نہیں مانا۔

”صفیہ غصہ نہ کرو..... خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو میں تمہیں غلط نہیں لگوں گی۔ پہلے کی بات اور تھی۔ ایک تو خود مجھے محبت کا نیا نیا خمار چڑھا تھا۔ ارد گرد کا ہوش نہیں رہا تھا۔ دوسرے میں نے عقل استعمال کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اب تم خود سوچو کہ بالآخر مجھے ذہن تو تمہارے بھائی کی ہی بنتا ہے۔ اگر

میں عقل سے کام نہیں لوں گی تو صرف میرے ماں باپ ہی بدنام نہیں ہوں گے۔ بلکہ تم لوگوں کی عزت پر بھی حرف آئے گا۔ لوگ کہنے سے نہیں چوکیں گے۔

کہ اقبال جو یہ کہ بہو آوارہ ہے۔ شادی سے پہلے شوہر سے ملتی رہی ہے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں۔ سب ہمیں مجرم ہی سمجھیں گے۔ کیا یہ صورتحال تم لوگوں کے لئے قابل قبول ہوگی۔ یقین کرو اس پورے ہفتے میں میں نے اس معاملے کے ہر پہلو پر سوچا ہے۔ مگر میرے اندر سے بھی اس کی مخالفت ہی اٹھی ہے۔ ہاں دل بڑا کرلاتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے مجھے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی تو میں آدھی رات کے بعد چھت پر چلی جاتی ہوں کہ کسی جگہ ہی سہی دو گھڑی سکون مل جائے۔“

دلایل دیتے اور خود کو مضبوط ظاہر کرتے آخر میں نوری اپنا بھانڈا پھوڑ بیٹھی تھی۔ صفیہ ان دونوں کے لئے دکھی ہوگئی۔ اس نے شاہنواز کو اکثر بے چینی سے ادھر ادھر پھرتے دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ہر پل اضطراب ہلکے لپٹا رہتا تھا۔ مگر وہ چاہ کر بھی ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

”پھر بھی نوری کچھ تو سوچ..... کوئی تو حل ہوگا اس مسئلے کا۔“

”ہاں! میں نے بہت سوچا ہے۔ بس ایک ہی حل

ہے کہ ہر جمعرات کو آپا جی عصر سے مغرب کے درمیان مولوی جی کے گھر درس میں جاتی ہیں۔ اباجی گھر پر نہیں ہوتے۔ میں بیٹھک کی کھڑکی میں کھڑی ہو جاؤں گی وہ آجایا کرے ہم ایک دوسرے کو دیکھ لیا کریں۔“

صفیہ جانے کے لئے اٹھ گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ شاہ نواز دیکھ تو ہوگا مگر وہ اسے امید دلا سکتی ہے کہ وہ دونوں ملتے رہیں گے۔ دوسری طرف نوری نے ابھی سے جمعرات کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ انگلیوں کی پوروں پر دونوں کا حساب لگانے کے بعد وہ خود ہی پھکی سی ہنسی ہنس دی۔

”کیا چیز ہو تم شاہ..... تم نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے۔“

☆☆.....☆☆

شاہ میر ساکت سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے لگا تھا کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا گیا ہے۔ اسے اپنی محبت کے حصول کی راہ میں بہت سی رکاوٹوں کا ادراک تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اسے اپنے ماں باپ اور قریبی عزیزوں کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ نور کے گھر والے بھی راضی نہیں ہوں گے۔

مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی قسمت سب سے بڑے مخالف کا کردار ادا کرے گی۔ چوہدرائیں اپنی خوشی کو چھپائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک نوری کو نہیں دیکھا تھا۔ بس لوگوں کے منہ سے سنی ہوئی باتوں کی حد تک اس سے واقف تھی مگر بیٹے کی زبان سے اس کی فرمائش سن کر اس نے حویلی آتے ہی اپنی خاص ملازمہ کو کہا کہ نوری کے متعلق معلومات جمع کر لائے اور کسی بہانے اسے اپنے ساتھ بھی لائے تاکہ وہ اسے خود سے دیکھ سکے۔ کیونکہ وہ مغرور لڑکی کبھی حویلی نہیں آئی تھی اور چوہدرائیں کی کینوں کی کسی محفل میں شریک نہیں ہوتی تھی۔

شام کو ملازمہ دھاک خیز خبر کے ساتھ لوٹ آئی کہ نوری تو شادی شدہ تھی۔ بس رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ پھر

چوہدرائے نے اس کی کوئی بات توجہ سے نہ سنی اس کے دل میں لڑو پھوٹ رہے تھے۔ وہ میاں بیوی اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے سرخرو ہو گئے تھے۔

چوہدرائے جس طوفان سے خوف زدہ تھی وہ اس کے دروازے سے بغیر کوئی نقصان کے پلٹ گیا تھا۔ بیٹا اب انہیں الزام نہیں دے سکتا تھا۔ اور وہ ان کی ناپسندیدہ لڑکی کو ان کی بہو بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ چوہدرائے نے دس سیر شکر خوشخبری لانے والی ملازمہ کو دی۔

وہ شوہر اور بیٹے کے درمیان چھڑنے والی جنگ میں ناحق پسے سے بچ گئی تھی۔ چوہدری ابھی تک لاعلم تھا۔ چوہدرائے شاہ میر کے کمرے میں پہنچ گئی۔

اگرچہ اس کی طبیعت سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ مگر وہ خوشی میں اپنی طبیعت کو بھی فراہوش کر گئی۔ پندرہ بیس سیڑھیاں چڑھنے سے اس کا سانس بری طرح پھول گیا۔

ماں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر شاہ میر کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر وہ خفا ہوا۔

”جب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو ایسے میں سیڑھیاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر طبیعت مزید خراب ہو جاتی تو آپ..... آپ مجھے بلوائیتیں۔“

چوہدرائے کو صوفے پر بیٹھا کر وہ جلدی سے پانی لے آیا تھا۔

”ایسی کیا خاص بات تھی۔ جس کے لئے آپ نے اپنی تکلیف بھلا دی۔“ چوہدرائے کی طبیعت بحال ہوتے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔ چوہدرائے نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں ہمیشہ والی گرجوٹی مفقود تھی۔ اسے بات شروع کرنے میں دقت ہوئی۔ خواہ وہ ہی کھنکار کر گلا صاف کیا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”وہ دراصل ابھی ایک بات میں نوری کا ذکر ہوا تو“ وہ لمحہ بھر کو کی شاہ میر کا پورا بدن کان بن گیا۔ اتنی بے چینی پر شاہ میر کو خود پر ہنسی آئی۔ کیسے وہ ایک لڑکی اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ ذرا سی پلک جھپکتی تو اس

کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ کبھی تو اسے خود پر غصہ بھی آ جاتا۔ اتنا پڑھا لکھا سمجھا ہوا بندہ جسے دنیا بارڈ سٹون سمجھتی تھی ایک گاؤں کی لڑکی کے پیچھے گدھا بنا ہوا تھا۔ اب بھی نور کے ذکر پر اس کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔

اس کا اشتیاق دیکھ کر چوہدرائے نے نظریں چرا لیں، اسے ایک نظر دیکھنے پر ہی افسوس تھا۔ وہ فوری طور پر وہ بات بھی نہ کر سکی جو کرنے آئی تھی۔

”تم نوری سے کہاں ملے تھے۔“

شاہ میر الجھ گیا۔ یہ تو وہ جان گیا تھا کہ ماں اس سے اصل بات چھا رہی ہے۔ مگر کیا چھا رہی تھی یہ اس کے دہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

”کس کے سامنے ذکر ہوا تھا نور کا ابھی“ شاہ میر نے چوہدرائے کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”پہلے میرے سوال کا جواب دو۔“ وہ بھی اس کی ماں تھی۔

”میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ بس دو چار مرتبہ دور سے دیکھا ہے۔“ وہ الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چوہدرائے کے لیے بات کرنا آسان ہو گیا۔

”جیسی تجھے اصل بات کا پتہ نہ تھا۔ دیکھ پتر میں نے تیری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ نوری کے بارے میں پتہ کر آیا تو بچاں نے بتایا۔ خدا کی مرضی میں تو ہم دخل نہیں دے سکتے..... وہ نوری تو.....“

شادی شدہ ہے۔ چھ آٹھ مہینے پہلے نکاح ہوا تھا۔ اب کچھ دنوں میں رخصتی ہونے والی ہے۔

میں نے تو سوچ لیا تھا جیسے بھی ہوگا تیرے باپ کو منالوں کی مگر اب۔ ہم کسی کی بیوی کے لئے تو جھولی نہیں پھیلا سکتے پتر تو بھی دل کو سمجھا لے۔ ربیعہ سے یا کسی اور سے شادی کر لے۔

دو چار دنوں میں ہی دل بہل جائے گا۔ ہم نوری سے پہلے ہی تیری شادی کر دیں گے۔“

شاہ میر ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ اسے لگا تھا اس کے

کانوں میں پکھلا ہوا سیدھ انڈیل دیا گیا ہے۔ اس کی دکھ کی شدت سے پھٹی ہوئی آنکھیں ماں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چوہدرائے میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے دیکھ سکے۔ مگر جب چند لمحوں بعد بھی اس نے شاہ میر کو حسب سابق ہی دیکھتے پایا تو اسے تشویش ہوئی۔

”کیا ہوا پتر..... تو ایسے کیوں دکھ رہا ہے؟“

اس نے شانوں سے پڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ جھٹکا لگنے سے بھی شاہ میر کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا سوائے اس کے کہ اس کی نظریں چوہدرائی سے ہٹ کر دیوار پر ٹک گئی تھیں۔ چوہدرائی کو کچھ بہت غلط ہو جانے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے تڑپ کر دو ہنڑ اپنے سینے پر مارا اور چلائی۔

”ہائے میرے ربا..... میرا ایک ہی پتر ہے..... اسے کیا ہو گیا۔“ اس نے جھٹکا دے کر اپنے بھاری جسم کو صوفے سے اٹھایا اور پانی گلاس میں انڈیل کر شاہ میر کے لبوں سے لگا دیا۔ شاہ میر نے ایک نہایت اجنبی نظر اس پر ڈالی اور گلاس ہاتھ سے پرے ہٹا دیا۔ وہ اٹھا اور بیگانگی انداز میں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆

چوہدری سرفراز جونہی حویلی کے زنانے میں داخل ہوا چوہدرائے کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ شہر سے ابھی ابھی لوٹا تھا۔ اسے گھر میں ہونے والی کسی بات کی کوئی خبر نہ تھی۔

”چوہدری میں لٹ گئی..... میں برباد ہو گئی..... میرا اکواک پتر پتہ نہیں کہاں چلا گیا..... رب کا واسطہ اسے ڈھونڈ لاؤ۔“

بکھرے بال، سوچی آنکھیں، چوہدرائے چوہدری پر نظر پڑتے ہی داویلا کرنے لگی۔ چوہدری ہکا بکا رہ گیا۔ اتنے سال شہر میں اکیلا رہ کر پڑھنے والا جوان جہان بیٹا کیسے کھو گیا تھا۔ وہ کونسا کوئی دودھ پیتا بچہ تھا کہ گھر کا رستہ بھول گیا۔

”ایوں رولا نہ ڈال، خاموشی سے بتا کیا ہوا ہے؟“

شاہو کہاں ہے“ چوہدری نے دلاسہ دیتے لہجے میں پوچھا۔

”ہائے پتہ نہیں کہاں گیا میرا الال..... وہ“

چوہدرائی نے بروقت خود کو سنبھالا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ اپنی نوکرانی کو حکم دے رہی تھی کہ وہ چوہدری سمیت کسی کو بھی اصل بات نہیں بتائے گی۔ ویسے تو کسی کو بھی علم نہ تھا۔ گھبراہٹ میں وہ خود ہی بختو کے سامنے بات کر رہی تھی۔ منہ سے نکلے کوٹھے چڑھی یہ بات اتنی عام نہ تھی کہ نوکرانی اسے پی جاتی۔ چند لمحوں میں پوری حویلی بلکہ گاؤں کو پتہ چل جاتا کہ شاہ میر نوری کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہی نوری جو پہلے ہی کسی کی منکوحہ اور گاؤں کی ناپسندیدہ لڑکی تھی۔ اسی لئے چوہدرائی نے بختو کو دھمکی دی کہ اگر یہ بات نکل گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

بختو کو بخوبی پتہ تھا کہ شاہ میر از خود..... نوری کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کیونکہ نوری لڑکوں کو کبھی لفٹ نہیں کراتی تھی۔ وہ کبھی کسی پر مہربان نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے گاؤں کے اکثر لڑکوں کا خیال تھا کہ وہ دوسرے گاؤں کے کسی لڑکے سے متاثر تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے گاؤں کے کسی لڑکے کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

گاؤں میں اگر نوری کے بہت سے مخالف تھے تو کچھ ہمدرد بھی تھے جیسے شاہ نواز کا گھرانہ۔ جس نے بہت چاہ سے اسے اپنی بہو بنایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گاؤں میں لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ کسی غیر حاضر کی عزت کی دھجیاں اڑانا ہی تھا۔ اور نوری کے متعلق اڑنے والی افواہوں میں بھی کوئی صداقت نہ تھی۔ ایسی ہی ایک ہمدرد حویلی میں بھی موجود تھی۔ وہ بھی نجو۔ کام سے فراغت ملتے ہی اس نے نوری کے گھر کا رخ کیا تھا۔

☆☆☆☆

اتفاق سے نوری گھر میں اکیلی تھی۔ بختو نے سلام دعا کے بعد کہا۔

”اے نوری! تجھے کچھ پتہ بھی ہے حویلی میں کیا طوفان اٹھا ہے وہ بھی تیری وجہ سے۔“



نوری دھک سے رہ گئی۔ وہ تو کبھی حویلی گئی ہی نہ تھی تو اس کی وجہ سے وہاں طوفان کیسے آگیا۔  
”کیا کہہ رہی ہے تو نجو..... کیا ہوا ہے حویلی میں؟“

”وہ ہے نا چھوٹا چوہدری..... اس نے تمہیں کہیں دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے چوہدرائیں سے کہا کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ چوہدرائیں راضی نہیں تھی۔ مگر جب اسے پتہ چلا کہ تو شادی شدہ ہے تو اس نے فنانٹ یہ بات چھوٹے چوہدری کو جاسانی وہ اسی وقت اٹھ کر گھر سے چلا گیا۔ کل رات سے اب تک اس کا کوئی پتہ نہیں لگ سکا۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا..... چوہدرائیں کا تو رو رو کر برا حال ہے۔ سوائے میرے کسی کو حویلی میں اصل بات کا پتہ نہیں ہے۔

مجھے بھی بس پریشانی میں چوہدرائیں نے بتا دیا تھا۔ بعد میں مجھے دھمکیاں دینے لگی کہ کسی اور کو پتہ نہ لگے۔ ویسے حویلی میں بڑی کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ مگر میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ حویلی والوں کو بس اتنا ہی پتہ ہے کہ چوہدرائی سے کسی بات پر جھگڑا کر کے چلا گیا۔ بہانے بہانے سے سب دوستوں اور رشتہ داروں سے پتہ کروایا ہے وہ کسی کے پاس نہیں گیا۔ میں نے بس تیرے آگے بات کی ہے۔ مگر دیکھ تو آگے ماسٹر جی یا آپا جی کے آگے مت کرنا ورنہ میں ایوں ماری جاؤں گی۔“

خبر کی سنسنی خیزی کچھ کم ہوئی تو بختو کو اپنی فکر لاحق ہو گئی۔ نوری ابھی تک اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔  
”بختو تو واقعی سچ کہہ رہی ہے یا مذاق کر رہی ہے؟“

بختو فوراً برامان گئی۔  
”لے ایک تو میں تیری محبت میں دوڑی چلی آئی اوپر سے تو مجھے جھوٹی سمجھ رہی ہے۔“

نوری نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔  
”نہیں بختو میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہی۔ مگر مجھے یقین نہیں آ رہا۔ وہ اتنا پڑھا لکھا چوہدری، گاؤں کی

ایک معمولی لڑکی کی خاطر گھر چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے اور پھر مجھ سے تو وہ ابھی ملا بھی نہیں۔ بس دو چار بار گلی میں آتے جاتے اسے دیکھا ہے۔ ایسے میں مجھے یقین آئے بھی تو کیسے کہ وہ میری وجہ سے گھر والوں سے ناراض ہو کر حویلی چھوڑ گیا نہیں نجو..... یہ مجھے بدنام کرنے کی کوئی سازش ہوگی، تو تو جانتی ہے کہ گاؤں میں میرے بہت مخالف ہیں اور چوہدرائی بھی ان میں سے ایک ہے۔

بیٹا کسی اور بات پر ناراض ہوا ہوگا اس نے الزام دھردیا میرے سر پر۔ ورنہ تو خود بتا کہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ ملے بنا ہی صرف دیکھ کر اتنا عاشق ہو جائے کہ گھر ہی چھوڑ دے۔“ بختو نے سر پیٹ لیا۔

”نوری عقل کو ہاتھ مار..... اگر چوہدرائی نے تجھے بدنام کرنا ہوتا تو وہ سب کو بتاتی مگر اس نے تو چوہدری تک سے یہ بات چھپالی ہے۔ مان نہ مان یہ سچ بات ہے۔“

نوری نے سر ہلا دیا۔ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”اچھا ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ مگر بختو تو یہ بات کسی اور کو مت بتانا..... قسم کھا..... ورنہ میں بدنام ہو جاؤں گی۔ پہلے صرف انو ابیں تھیں اب تو تصدیق ہو جائے گی۔“

بختو نے اپنے چھوٹے بیٹے کی قسم کھا کر نوری کو یقین دلایا کہ وہ اب اور کسی کے سامنے بات نہیں کرے گی۔ اسے حویلی سے نکلے کافی دیر ہو گئی تھی۔ سو جلدی سے اٹھ کر چلی گئی۔ جب کہ ڈھلتی دھوپ میں سوچوں میں گھری نوری دروازے کی دہلیز پر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆.....☆☆  
چوہدری سرفراز نے سونے سے قبل نوکرانی سے شاہ میر کے بارے میں دریافت کیا۔ اب وہ اپنے بیٹے کے متعلق بہت فکر مند تھا۔ نوکرانی نے بتایا کہ وہ حویلی کے پچھلے حصے میں ایک درخت سے ٹیک لگائے سگریٹ پی

رہا ہے۔ چوہدری پریشانی سے اٹھا۔ موسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ بیمار پڑ سکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا دکھ پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ شاہ میر ننگے پاؤں، بکھرے بالوں اور بڑھی ہوئی شیوہ کے ساتھ درختوں کے نیچے چکرا رہا تھا۔ حویلی کا یہ حصہ ناقابل استعمال تھا اور یہاں خود رو پودے اور جھاڑیاں کئی بڑے درخت اگے ہوئے تھے۔ وہاں اس حلیے میں پھرتا ہوا شاہ میر چوہدری کو کوئی مجنون دہانہ لگا۔ ایک ہفتے سے اس کی یہی حالت تھی۔ کوئی زبردستی پکڑ کر دو چار نوالے کھلا دیتا تو کھا لیتا ورنہ سگریٹ پر سگریٹ چھونکے جاتا اور خاموشی سے ادھر ادھر بے مقصد پھرتا رہتا۔

چوہدری کو اصل بات پتہ چل گئی تھی۔ شاہ میر ناراض نہیں تھا بلکہ صدمے کے زیر اثر تھا۔ گھر سے نکل کر وہ سیدھا باغ کی طرف گیا تھا اور ایک جھکے ہوئے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ رات گہری ہو گئی تھی نہ کسی نے اسے لیکھا نہ وہ خود پلٹ کر گھر آیا۔ اگلے دن بعد دوپہر ایک مزارعے نے اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر گھر میں اطلاع دی تو چوہدری خود جا کر اسے وہاں سے لایا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ وہ کسی صدمے کے زیر اثر ہے۔ اس نے شاہ میر کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاہ میر اگر کسی سے کہہ سن لے یا پھر رو لے تو اس کی یہ کیفیت ختم ہو جائے مگر وہ بالکل چپ تھا۔

چوہدری اور چوہدرائے دونوں میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ جوان بیٹا ان کے سامنے کھل کھل کر ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر چوہدرائے ایک بار پھر بستر پر جا پڑی تھی۔ چوہدری اکیلا دونوں کے لئے فکر مند ہو رہا تھا۔

”شاہو پترا! کیوں اتنی ٹھنڈ میں ننگے پیر پھر رہا ہے۔ یار آخر تو کچھ بولتا نہیں نہیں..... کہنے سننے سے دکھ کم ہو جاتا ہے۔ یار..... اور تو توجی دار بندہ ہے پھر اس طرح کیوں کر رہا ہے۔“

اس وقت چوہدری سرفراز، چوہدری لگ ہی نہیں رہا تھا۔ اس وقت تو وہ ایک دھمی باپ تھا۔ اس کی ساری رعونت اور مغروری اس وقت نہیں منہ چھپائے پڑی تھی۔ چوہدری نے جو نبی شاہ میر کو چھوا تو وہ ٹھٹھک کر رکا۔ ایک نظر چوہدری کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

”او پترا..... تجھے تو بڑا تیز بخار ہے چل اندر چل شاداش“ چوہدری زبردستی اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آیا۔ اس کا حال دیکھ کر چوہدرائے تڑپ کر بستر سے اتر بیٹھی۔

گرد آلود کپڑے، خاک سے اٹے پال اور لہو لہان پاؤں شائد وہاں کوئی شیشے کا ٹکڑا پڑا تھا جو اس کے دونوں پاؤں زخمی کر گیا تھا۔ چوہدرائے بیٹے کے قدموں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ جو خود بھی حیران ہو کر اپنے زخمی پاؤں کو دیکھ رہا تھا۔

”ماں صدقے ماں واری..... میں نے کبھی کانٹا بھی نہ چسپنے نہ دیا تھا کیسے رل گیا میرا بچہ۔“

بے تابی سے اس کے زخمی پاؤں کو سہلاتے اور روتے ہوئے وہ بولی تو شاہ میر نے پاؤں اس کی گرفت سے چھڑا لئے وہ کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر تکلیف کے باعث نہ ہو سکا۔ چوہدرائے بری طرح بلکنے لگی۔

”چوہدری خدا کے لئے میرے بچے کو بچا لو۔ اسے نوری کا ساتھ نہ ملا تو یہ مر جائے گا۔ کچھ کرو چوہدری..... کچھ کرو۔“

شور مچاتی چلاتی ہوئی چوہدرائے جھٹکا کھا کر پیچھے کو گری تھی۔ اسے ڈانٹ کر چپ کرانے کو منہ کھولتا چوہدری بوکھلا کر اس کی طرف لپکا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے بری طرح قالین پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ناقابل بیان اذیت سے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ چوہدری نے چلا کر ملازم سے گاڑی نکالنے کو کہا اور خود نوکرائیوں کی مدد سے چوہدرائی کو تیزی سے گاڑی کی طرف لایا۔ گاڑی میں لٹانے تک چوہدرائے مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ گاڑی برق رفتاری سے حویلی سے نکل گئی۔ چوہدرائے کو دل کا تیسرا دورہ پڑا تھا۔ وہ راستے میں ہی

دم توڑ گئی حویلی میں آدھی رات کو ہی صف ماتم بچھ گئی۔

☆☆.....☆☆

چوہدران کا جنازہ تیار دیکھ کر شاہ میر کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا ضرور مگر بولا پھر بھی کچھ نہیں۔ چوہدری سرفراز توڑھے سا گیا۔ جوان بیٹے کو گلے لگا کر دلاسا دیتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ شاہ میر پہلے سے آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ پہلی زرد رنگت، آنکھوں کے گرد حلقے اور کثرت سگریٹ نوشی سے کالے پڑتے ہونٹ۔ جن پر چڑیاں جی ہوئی تھیں۔ چوہدری کو لگا یہ شاہ میر نہیں بلکہ اس کی لاش ہے۔ وہ دہل گیا۔ بیوی کے بعد بیٹے کی لاش اٹھانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ سو اس نے ایک لاش گرانے کا فیصلہ کر لیا۔

چوہدران کی موت کا شاہ میر پر بہت اثر ہوا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح بال بکھرے ننگے پاؤں یہاں وہاں نہیں پھرتا تھا۔ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتا یا پھر قبرستان میں ماں کی قبر کے سر ہانے جا بیٹھتا تھا۔ چوہدری نے ایک نوکر مسلسل شاہ میر کے ساتھ کر دیا تھا۔ تاکہ تنہائی میں وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے چوہدری جان گیا تھا کہ شاہ میر کو زندگی کی طرف واپس لانے کے لئے اسے جلد ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔

☆☆.....☆☆

چوکی پر بیٹھی نوری گھٹنوں پر چاولوں کی پرات دھرے چاول چن رہی تھی۔ اس کے انداز میں نہایت عجلت تھی۔ اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ آج جمعرات تھی اور شاہ نواز کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے میں اتنی مگن رہی تھی کہ اسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ وہ بہت خوش تھی۔ آج اسے دو خوشیاں ملی تھیں۔ ایک تو شاہ نواز سے بہت سی باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اگرچہ ان کے گھر کے باہر ویران زمین کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا پھر بھی اس طرف کوئی نہ کوئی آ جاتا تھا۔ اس لئے بات کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ مگر آج خوش قسمتی سے ادھر کوئی نہیں آیا تھا۔

شاہ نواز نے بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ اسے

یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ وہ اماں کو منانے میں تقریباً کامیاب ہو گیا ہے اور آج کل میں اماں شادی کی تاریخ لینے کے لئے آنے والی تھی۔ یہ اتنی بڑی خوشی تھی کہ نوری سے سنبھالے نہ سنبھال رہی تھی۔

”بس اب کچھ دنوں کی دوری ہے۔ پھر رو برو بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

شاہ نواز نے بہت جذبے سے کہا تھا اور نوری اس کی بات پر ایمان لے آئی تھی۔ مغرب کی اذان کے ساتھ وہ جانے کے لئے پلٹا تو نوری اسی طرح کھڑکی میں کھڑی اسے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

یہاں تک کہ وہ گلی کے موڑ پر پہنچ گیا۔ موڑ مڑنے سے قبل اس نے پلٹ کر دیکھا، نوری کو اپنی جگہ کھڑے دیکھ کر وہ حیرانی سے مڑا۔ نوری نے فوراً الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا دیا۔ وہ مسکراتا ہوا پلٹ کر موڑ مڑ گیا۔ تو نوری اس کے وجہ سر اچھے کو سوچتی ہوئی کھانا تیار کرنے لگی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر ابا گھر آ جاتے تھے مگر آج ابھی تک نہ لوٹے تھے۔ نوری کئی بار دروازے تک جا کر گلی میں جھانک آئی تھی۔ آپا جی بھی نہ آئی تھیں۔ اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی بھی بڑھنے لگی۔ دل کو طرح طرح کے وہم ستا رہے تھے۔ آخر جب رہا نہ گیا تو وہ چادر اوڑھنے لگی اسی وقت دور کہیں گولیاں چلی تھیں۔ نوری کا دل ہول گیا۔

”جانے کس کی لڑائی ہوئی ہے یا پھر کسی نے سانپ مارا ہوگا۔“ دروازے کو تالا لگاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ان کے گاؤں میں کبھی کبھار بڑے سانپ آ جاتے تھے تو انہیں اسی طرح گولی چلا کر مارا جاتا تھا۔ نوری چند گھر چھوڑ کر واقع ماسی رسولاں کے گھر چلی آئی ابھی اسے بیٹھے کچھ دیر ہوئی تھی کہ سیکین کا بھائی بھاگتا ہوا آیا۔ نوری کمرے میں تھی۔ وہ سیکین کو پکارتے ہوئے چلا یا۔

”سیکین تو جلدی سے نوری کے پاس چلی جا۔ وہ گھر میں اکیلی ہوگی۔“ اس کا غیر معمولی انداز دیکھ کر سیکین

نے فوراً پوچھا۔  
 ”خیر تو ہے..... کیا ہوا ہے۔“  
 ”مجھے نہیں پتہ..... وہ کریم بخش اور نور دین کے بیٹوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ وہاں گولی چل گئی اور وہ شاہ نواز جو بیہوش گولیاں لگنے سے موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ بے چارہ بچ بچا کر آنے آیا تھا۔ ماسٹر جی اور آپا جی بھی وہیں ہیں۔ نوری گھر میں اکیلی ہو گئی۔ اس لئے تو جا میں پھر وہیں جا رہا ہوں۔“

وہ کہہ کر وہ بجلت میں دروازے سے ہی پلٹ گیا اور کمرے کے دروازے تک پہنچی ہوئی نوری غش کھا کر گر گئی۔ سیکنہ بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے ہوش دلانے کی کوشش کرنے لگی۔ کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں مگر وہ حواس میں نہیں تھی۔ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھے جا رہی تھی۔ سیکنہ بری طرح رو پڑی۔

”نوری رو لے، رو..... تو برباد ہو گئی۔ سہاگن ہونے سے بھی پہلے بیوہ ہو گئی۔ تیرے پیار کو کسی کی نظر کھا گئی نوری..... ساری زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والا سفر کے آغاز سے بھی پہلے تجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“

ساکت بیٹھی ہوئی نوری کو جھنجھوڑتے ہوئے سیکنہ ہانپ گئی۔ مگر وہ شس سے مس نہ ہوئی۔ پورے گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ شاہ نواز کا گھر یہاں سے کافی دور تھا پھر بھی عورتوں کے رونے کی مدھم آوازیں وہاں تک آ رہی تھیں۔ سیکنہ نے ہمت کر کے نوری کو چادر اوڑھائی اور شاہ نواز کے گھر کی طرف بڑھی۔ نوری نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ خاموشی سے اس کے ساتھ گھسٹی چلی گئی۔ شاہ نواز کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ پولیس ابھی نہیں آئی تھی۔

نوری کو دیکھ کر سب لوگ خود بخود ادھر ادھر ہٹ گئے۔ اور اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ سیکنہ کے سہارے اندر چلی گئی۔ شاہ نواز کا وجود سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ جو سینے کے مقام سے بالکل سرخ ہو گئی

تھی۔ دراز پکوں والی آنکھیں۔ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھیں۔ اس کے جوان لاشے کے لئے چار پائی کا طول کم بڑ گیا تھا۔ پاؤں چار پائی سے باہر تھے۔ صفیہ نوری کو دیکھتے ہی چیخ مار کر اٹھی اور نوری سے لپٹ گئی۔  
 ”نوری یہ کیا ہو گیا..... میرا دیر، تیرا سہاگ چلا گیا۔ ظالموں نے میرے شیر جیسے بھائی کو بھری جوانی میں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ خدا کرے ان کی لاشیں بھی گریں۔ ان کے گھر میں ماتم ہوں۔ اک بندہ نہ بچے سب مارے جا سکیں۔“

صفیہ نوری کے گلے لگی بھائی کے قاتلوں کو بد دعائیں دے رہی تھی۔ نوری پھر بے ہوش ہو گئی۔ عورتوں نے ادھر ادھر ہو کر اس کے لئے جگہ بنائی اور ہوش میں لانے کے لئے پانی کے چھینے دینے لگیں۔ ہوش میں آتے ہی اس کا سکت ٹوٹ گیا۔ پھر وہ اس قدر روئی کہ کسی غیر کی آنکھ بھی خشک نہ رہی۔ وہ بن پانی کی چھلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔ نقصان تو سب کا ہوا تھا۔ شاہ نواز کے گھر والوں کا بھی اور ماسٹر اللہ یار کے گھر والوں کا بھی مگر اس اکیلی کا دکھ ان سب سے سوا تھا۔ اس کی محبت قتل ہو گئی تھی۔ آج ہی تو شاہ نواز نے اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ آج شام کی وہ آخری ملاقات جس میں وہ اسے تسلی دے کر آیا تھا کہ اب بہت جلد روبرو بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔ مگر اب وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ ہجر کا لمحہ قیامت تک طویل ہو گیا تھا۔ ساری رات ایک لمحے کے لئے بھی اس کے آسوس نہ تھے اگلے روز جب جنازہ اٹھا تو نوری پھر بے ہوش ہو گئی۔ شاہ نواز کی ماں اور صفیہ بھی غش کھا کر گر پڑی تھیں۔ ان کی عمر بھر کی کمائی خاک میں ملنے جا رہی تھی۔

☆☆.....☆☆

”پھر کیا سوچا ہے تو نے ماسٹر! میں نے چوتھی مرتبہ تجھ سے پوچھا ہے..... آخر کب تک جواب دے گا۔“  
 چوہدری نے ماسٹر صاحب کو اپنی حویلی طلب کیا تھا۔ ایک ہفتہ قبل وہ نوری کے لئے اپنے بیٹے کا پیغام

لگا۔ نوری کے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔ کریم بخش اور نور دین دونوں کے بیٹے چوہدری کے کارندے تھے۔ اس سے پہلے ان میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ اب بھی بظاہر صلح ہو جانے کے بعد آرام سے رہ رہے تھے۔ پھر چوہدری نے پولیس کو کارروائی نہیں کرنے دی تھی۔ بلکہ دباؤ ڈال کر صلح کرا دی تھی۔ بس یہ احسان کیا تھا کہ مجھ رقم خون بہا کے طور پر دلا دی تھی۔

نوری کے اندر طیش کی شدید لہر اٹھی۔ بختونے اسے شاہ میر کی حالت، چوہدرائین کی منتیں اور چوہدری کی سوچ و بچار سب کچھ کے بارے میں بتایا تھا۔ ساری کڑیاں مل رہی تھیں۔ فائرنگ کرنے والا جھگڑا شروع سے پہلے موجود تھا۔ پھر اس نے صرف اسی وقت گولی کیوں چلائی جب شاہ نواز گھر سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر کوئی بھی گولی شاہ نواز کے سوا کسی دوسرے کو نہ لگی تھی۔ پھر اس کا کفن بھی میلانہ ہوا تھا کہ چوہدری اپنے بیٹے کے لئے ہاتھ پھیلائے آ گیا تھا۔

”میں مجبور ہوں چوہدری کہ تجھ سے براہ راست انتقام نہیں لے سکتی۔ مگر جس بیٹے کے لئے تو اس قدر تڑپ رہا ہے اسے اذیت دے کر تو میں تجھ سے بدلہ لے سکتی ہوں نا۔“

نوری نے ایک سلگتی ہوئی نگاہ سے چوہدری کو دیکھ کر سر جھکا دیا۔

☆☆.....☆☆

شاہ میر کی تو خوشی کے مارے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اس نے بھی گمان بھی نہیں کیا تھا کہ قسمت اس طرح بھی اس پر مہربان ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا مگر ایسا ہو گیا تھا۔ جب نوری کے شوہر کی لڑائی میں موت ہو جانے کا اسے علم ہوا تھا تو وہ بہت دن اس کے لئے بے چین اور فکر مند رہا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ چلا تھا کہ نوری بہت صدمے میں تھی۔ پھر اس کے دل میں آس نے سر اٹھایا کہ ہو سکتا ہے وہ مان جائے تو وہ اس کے سارے دکھ اپنی پلکوں سے چن لے گا۔ وہ اس سے ملنے کا طریقہ سوچ رہا تھا جب چوہدری نے

لے کر گیا تھا۔ تب تو ماسٹر جی خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے کہ بیوگی کے مختص ڈیڑھ ماہ بعد ہی ان کی بیٹی کے لئے دوسرا بہترین رشتہ آ گیا تھا۔ بلکہ پہلے سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔ مگر اس کے بعد چوہدری نے دو مرتبہ بندہ بھیجا تو انہوں نے کہہ دیا۔

”ابھی میں فیصلہ نہیں کر سکا۔ چوہدری سے کہنا مجھے کچھ مہلت دے۔“ چوہدری اس جواب سے تپ گیا۔ معمولی ماسٹر کی یہ جرات کہ چوہدری کے بیٹے کے رشتے کے لئے سوچ و بچار کرے اسے تو فوراً ہاں کر دینی چاہیے تھی۔ اس نے ماسٹر جی کو حویلی طلب کر لیا۔ ماسٹر جی نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”چوہدری صاحب..... میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ لیکن میں مجبور ہوں مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے پن کا ثبوت دیتے ہوئے ہم جیسے غریب لوگوں کی بیٹی کو حویلی کی بہو بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ میری بیٹی جہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ وہ ایسی کسی بات کا ذکر تک کرنے نہیں دیتی شادی تو دور کی بات ہے۔“

اللہ یار کی بات سن کر چوہدری بولا۔

”مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرنے نہیں جاتا۔ دکھ تو سب کو ہی ہوتا ہے مگر خود کو سمجھانا پڑتا ہے۔ میری بھی گھر والی تین مہینے پہلے فوت ہوئی ہے۔ میں کبھی تو یہ دکھ سہہ رہا ہوں۔ تو شادی کی تیاری کر۔ نوری دھی سے میں خود بات کرتا ہوں۔“

وقت کے چکر نے چوہدری جیسے مغرور اور اونچے ٹیلے والے کو ایک فقیر کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کل تک وہ اس کے لئے گاؤں میں بسنے والی ایک کمتر مخلوق تھی مگر آج بیٹے کی خوشی کے لئے وہ اسے بہت عزت سے ”نوری دھی“ کہہ رہا تھا۔

ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی وہ ان کے گھر آیا تھا۔ درمی سیاه دوپٹہ لپیٹے سلام کرنے آئی تھی۔ چوہدری سے شادی کے لئے رضا مند کرنے کے لئے سمجھانے

اسے پہنا دیا۔

”نور میں جانتا ہوں کہ یہ سب تمہارے لئے بہت اجنبی اور بہت اچانک ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے پہلے تعلق کو بھلا نہیں سکی ہو۔ مگر یقین کرو میں اس بات پر تمہیں کبھی الزام نہیں دوں گا۔ میں کہنا چاہوں گا کہ میں نے تمہیں اپنی جان سے بڑھ کر چاہا ہے۔ میں تمہاری کسی بات کو برا جان ہی نہیں سکتا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس نئی زندگی میں ایڈجسٹ کرنے میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔ اگرچہ میرے اس رات کے لئے بہت سے ارمان تھے۔ لیکن اگر تم اچھا محسوس نہیں کر رہیں تو کوئی بات نہیں میں اپنے جذبوں کے اظہار کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ شاہ میرے چند لمحے اس کی جانب سے کسی جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اٹھ گیا۔

”تم تھک گئی ہو گی..... چہنچ کر کے آرام کرو۔“ سگی مجسمہ دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے کھٹک کر اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ شاہ میر، نوری کے رویے سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے انداز میں واضح سر دھری تھی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ شاہ میر کو تو ایسا بھی لگا جیسے وہ خود پر جبر کر کے اس کے سامنے بیٹھی رہی تھی۔ اس کے رویے پر غور کرتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا۔

وہ نور کی واپسی کا منتظر تھا۔ مگر انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ اسے عرصے کے بعد ایسی پرسکون نیند آئی تھی۔ صبح جب شاہ کی آنکھ کھلی تو بے ساختہ اس کی نظر بیڈ کے دوسرے سر پر گئی بیڈ خالی تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ رات بھر کمرے میں نہیں آئی تھی۔ رات بھر دماغ میں کلبلا تے خدشوں پر اسے یقین آنے لگا تھا۔ وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی۔

شاہ میر تیزی سے اٹھ کر ڈریسنگ روم میں گیا نور فشاں اسی طرح دلہن بنی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا۔ حسین

اسے اطلاع دی کہ وہ اس کے لئے نور کا رشتہ مانگنا چاہ رہا ہے۔ شاہ میر خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا تھا پہلے وہ اپنے باپ کو کوشش کرنے دے گا۔ اگر خدا نخواستہ وہ کامیاب نہ ہو سکا تو پھر وہ خود نور سے مل کر اسے اپنی محبت، اپنی بے تابی کا احساس دلانے گا۔ اسے راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔

اسے یقین تھا کہ اس کی محبت دیکھ کر وہ ضرور پکھل جائے گی۔ اس کا خیال تھا ایسا کرنے میں اسے کافی وقت لگ جائے گا۔ مگر تب اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ محض ایک ہفتے بعد اس کی شادی ہے۔ چوہدری سرفراز نے بیوی کی وفات کی وجہ سے شادی میں زیادہ دھوم دھڑکا کرنے سے منع کر دیا تھا۔

برادری والوں کو چوہدری کے اس اقدام سے اپنی ناک کٹتی محسوس ہوئی تھی کہ کمی کمین کی بیٹی حویلی کی بہو بن رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس شادی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ پھر بھی کافی چہل پہل تھی۔

شاہ میر کے دوستوں نے اس کا کمرہ بڑی خوبصورتی سے آراستہ کر دیا تھا۔ جب نور فشاں کو اس کمرے میں لاکر بیٹھایا گیا تو کمرے کی سجاوٹ اس کے خیرہ کن حسن کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔ شادی میں شریک سبھی لوگوں نے نور فشاں کے بے پناہ حسن کی بہت تعریف کی تھی۔ جو شہر کی معروف بیوٹیشن نے دو آکھتہ کر دیا تھا۔

شاہ میر تو جیسے سانس لینا ہی بھول گیا۔ وہ کتنے ہی لمحے ٹھٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس کے سچے سچے بیڈ کے وسط میں نور فشاں اپنے حسین وجود کے ساتھ موجود تھی۔ شاہ میر نے آہستگی سے اس کی سنوری قیامت کو سلام کیا۔ جواب نہارد وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور تمغیلیں کیس میں سے سونے کی زنجیر میں پرویا ہوا سچا موتی نکال کر اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھائے۔

”یہ تمہارا رونمائی کا گفٹ ہے۔“ وہ خاموش رہی۔ شاہ میر نے آہستگی سے لاکٹ

آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ شاہ میر کا دل تڑپ اٹھا وہ دوزانوں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”خدا کے لئے نور اس طرح مت روؤ..... میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا..... چلو اٹھو یہاں سے۔“

اس کے آنسو اپنی پوروں سے چن کر شاہ میر نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ اسے سہارا دیئے ہوئے بیڈنگ لایا۔

”تم رات بھر سوئی نہیں ہو..... یہ دودھ پی لو اور آرام سے سو جاؤ..... میں کمرے سے باہر جا رہا ہوں اور پلیر اب رونا نہیں جو کھوگی وہی ہوگا۔ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔“

شاہ نے اسے تھرماس سے دودھ نکال کر تمہایا اور خود سائیڈ ٹیبل کے دراز سے ڈھونڈ کر لائٹر اور سگریٹ نکالے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے محض ایک ہفتے کے بعد ہی دوبارہ ان کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

☆☆.....☆☆

چاندنی میں نہایا ہوا آنگن دھندلا سا ہو رہا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے دھند نہیں پڑی تھی۔ دو منٹ بعد ہی چاند بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ سگریٹ سے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے شاہ میر کچے آنگن میں بے مقصد گھوم رہا تھا۔ وہ سردی کے لحاظ سے ناکافی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ مگر سردی کے احساس سے بے نیاز تھا۔ گاؤں کے کھلے علاقے میں سردی ویسے بھی شدید پڑتی ہے۔ مگر اس کے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ سلگ رہا تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے اسے بخار تھا۔ مگر اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔

شروع شروع میں نور کی بے اعتنائی سے بچنے کے لئے اس نے خود کو دین کے معاملات میں الجھنا چاہا تھا مگر وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ پھر رفتہ رفتہ اپنے خول میں بند ہو گیا۔ شادی کی اولین رات ہی نور کے رویے نے اسے خود میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنے شدید

جذبات سے اسے آگاہ ہی نہیں کر سکا تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے انمول جذبے پذیرائی نہیں پاسکیں گے۔ محبت کرنے والے تو یوں بھی حساس ہوتے ہیں۔ پھر محبوب کی بے رخی تو اور بھی اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ نور کو حاصل کر لینے کے بعد بھی پائیں سکا تھا۔

وہ اس کے گھر میں، اس کے کمرے میں، اس کے دل میں رہ رہی تھی۔ مگر وہ اس کے خیالات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا کہ نور نے بھی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اگر وہ پہلے سے نہ جانتا ہوتا کہ وہ بول سکتی ہے تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ گونگی ہے۔

شاہ میر گھٹنوں اس کے پاس بیٹھا اس کی خوشی کی خاطر اسے منانے کے لئے یا اسے اس چپ کے حصار سے نکالنے کے لئے باتیں کیے جاتا تھا۔ مگر وہ خاموش بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی رہتی۔ پتہ نہیں اسے سنتی بھی تھی یا نہیں۔ اس نے کبھی پوچھے گئے کسی سوال کا جواب زبان سے نہیں دیا تھا۔ بس جی چاہتا تو سر ہلا دیا ورنہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

ان کی شادی کو چھ ماہ ہونے والے تھے مگر ابھی تک ایک مرتبہ بھی نور نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ جھکی نگاہوں سے بیٹھی رہتی تھی۔ وہ جو اس کی نگاہوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتا اس کی آنکھوں کے اصل رنگ سے بھی ناواقف تھا۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ اپنے حقوق سے بھی لاعلم نہیں تھا۔ ہاں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ضرور تھا۔ نور اپنے گرد لافعلقی کا حصار قائم کئے ہوئے تھی۔ کہ اسے کبھی اپنے دل کی بات کرنے کی ہمت ہی نہ ہو۔ اگر وہ چاہتا تو زبردستی بھی کر سکتا تھا مگر وہ نور کا دل جیتنا چاہتا تھا۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ نور کے دل میں اس کے لئے محض انتقام ہی تھا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی کسی کی نفرت کا شکار ہو گیا تھا۔

ہر روز وہ ایک نئے جذبے کے ساتھ اسے منانے کے جتن کرتا۔ مگر ہر روز ایک شدید اذیت کے ساتھ



اسے پسپائی اختیار کرنا پڑتی۔ یہ ایک ہفتہ قبل کی بات تھی جب وہ حوصلہ ہار گیا تھا۔ اس کے سامنے وہ رو پڑا تھا۔ اس نے نور کو دیکھنے، دل ہارنے، اپنی ماں کے اعتراض اور نور کی شادی کی خبر سے غم سے اپنے پاگل ہو جانے کا سبب احوال سنا دیا۔ یہ بھی کہ اس کی ماں اسی کی وجہ سے مر گئی تھی۔ وہ بیٹے کا دکھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ شاہ میر نے اپنی تمام بے سکون راتوں اور بے چین دنوں کا حال اسے سنایا تھا۔ نہ جانے کیسے اس نے نور سے محبت کی بھیک تک مانگ لی تھی۔

”نور خدا کے لئے..... میرے ساتھ یوں مت کرو..... میں مر جاؤں گا..... آخر میں نے کیا قصور کیا ہے جو تم میرے ساتھ بات کرنا میری طرف دیکھنا تک گوارہ نہیں کرتیں۔ اگر تمہیں مجھ سے کوئی گلہ ہے تو کہو..... میں ہر شکایت رفع کر دوں گا۔ کوئی غلطی ہوئی ہے؟ تو بتاؤ میں تلافی کر دوں گا۔ مگر مجھے چپ کی مار نہ مارو..... میں یہ سہہ نہیں پاؤں گا۔ مجھے جینے کے لئے تمہارا ساتھ، تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔ مجھے یوں نہ ترپاؤ نور پلیز.....“

نور نے پہلی مرتبہ نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بہت غور سے اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ ایک نظر جس میں شاہ میر کو اذیت میں دیکھ کر سکون اتر آیا تھا۔ پھر شاہ میر خود کو اذیت دینے پر تزلزل گیا۔

”وہ مجھے دکھی دیکھ کر خوش ہے تو اسے خوش ہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تب سے اب تک ہر روز رات کو شاہ میر جو حلی کے اس پچھلے صحن میں رات بھر سرگرم پھونکتا تھا۔ جس صحن میں شاہ کے بیڈروم کی ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ جس میں سے ایک مرتبہ لازماً اسے جھانک کر دیکھا جاتا تھا۔ ہر ایسے موقع پر شاہ میر کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔

ہم سا ہی دامن زمانے میں نہ ہو گا لوگو! جس کا بھری دنیا میں نہ کوئی اپنا نہ پرایا لوگو! جس کے لئے میں نے پھولوں کی مہکتی چھاؤں بنی اذیت کی کڑی دھوپ میں اس نے جلایا لوگو!

بے وفا ہے خوشی تو، اس کا بھروسہ کیا ہم راز غم کے سوا کسی کو نہ میں نے بنایا لوگو! جس کی راہوں میں سدا بہاروں کی دعا میں مانگیں اسی نے میرے لئے کانٹوں کا ہے رستہ بچھایا لوگو! لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں قابل گردن زنی جرم کیا ہے مرا یہ کسی نے نہ بتایا لوگو! میرے مقدر میں دور تک غموں کے سلسلے لکھے شاید میرا رونا میرے رب کو بہت بھایا لوگو! ”کیا بات ہے شاہو پتر! تو اس ویلے یہاں کیا کر رہا ہے۔ اتنی ٹھنڈ میں..... نوں کہاں ہے۔“ شاہ میر بری طرح چونکا۔

”کچھ نہیں ابا جان! میں ذرا..... دل گھبرا رہا تھا تو یہاں آ گیا..... نور سو رہی ہے..... آپ ابھی تک سوئے نہیں؟“

اس کے افسردہ انداز کو چوہدری نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔ اسی لئے اس کی سب باتوں کو نظر انداز کر کے براہ راست پوچھ لیا۔

”کیا بات ہے..... تم دونوں کے درمیان کوئی غصہ ناراضگی ہے۔ میں نے کبھی تجھے اپنی زنانی کے ساتھ ہشتے ہوئے نہیں دیکھا..... کوئی بات ہے؟ کوئی کمی ہے کڑی میں“ شاہ میر خاموش رہا۔

”وہی وہ کیوں کی اولاد حویلی کا راج پاٹ دیکھ کر آپے میں نہیں رہی۔ کبھی مجھے سلام کرنے نہیں آئی۔ بلکہ میں نے تو اسے شادی کے بعد تین چار بار ہی دیکھا ہے۔ حویلی کا بھی کوئی کام وہ نہیں کرتی۔ سب نوکرانیوں کے آسرے پر ہے۔ یہ پھنسن بڑے گھروں میں نہیں چلتے..... تو سمجھاتا کیوں نہیں؟“

چوہدری کے اندر نور فشاں کے لئے بھرا ہوا زہر زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکا تھا۔ اسے شادی کے بعد صرف تین یا چار بار نوری اپنی ساس کے رواجی تخت پر بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی۔ وہ سر جھکا کر اس سے پیار تو لیتی تھی مگر سلام کبھی نہیں سنا تھا چوہدری نے۔ بلکہ اس کی جتنی مرتبہ بھی نوری سے نظر ملی اس میں ایک غضبناک،

انتقام کی پیاس نظر آئی تھی اسے۔

چوہدری بچہ نہیں تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نوری۔ شاہ نواز کے قتل کے سلسلے میں اس پر شک کر رہی تھی۔ مگر چوہدری نے پروا نہ کی۔ وہ کچھ بھی جانتی نہ تھی۔ اور نہ ہی اس معاملے میں کچھ کر سکتی تھی۔ مگر اب اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت اچھے طریقے سے اس سے اپنا انتقام لے رہی تھی۔ وہ اس کے جان سے پیارے بیٹے کو قطرہ قطرہ موت سے ہسکتا کر رہی تھی۔ وہ بچھلی بہت سی راتوں سے شاہ میر کو اس صحن میں رات بھر سگریٹ کے ساتھ چلتے دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے رو برو آ ہی گیا تھا۔

”میں خود اس سے بات کرتا ہوں..... سمجھتی کیا ہے خود کو۔“

چوہدری غصے سے پلٹا شاہ میر ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

”نہیں ابا جان! آپ اس سے کسی سلسلے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ وہ ابھی خود کو ایڈ جسٹ نہیں کر پائی جب کر لے گی تو آپ کو کوئی گلہ نہیں رہے گا..... بس آپ یہ سمجھ لیں مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ آپ اس سے اس قسم کی بات کریں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ خود ہی سب سمجھ جائے گی۔“

چوہدری بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی۔ مگر دل میں ٹھان چکا تھا کہ وہ اس دو ٹوکے کی لڑکی کا دماغ ٹھکانے لگا دے گا۔ اور اس کے ماں باپ کی بھی اچھی طرح خبر لے گا جو بیٹی کو ان حرکتوں سے باز آنے کو نہ کہتے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں کچھ نہیں کہتا اسے۔ مگر اب تو کمرے میں جا کر آرام کر اس ٹھنڈ میں باہر نہ پھر بیٹا پڑ جائے گا۔“

شاہ میر نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا اور اس سے پہلے ہی حویلی میں جانے کو مڑ گیا۔

☆☆.....☆☆

نوری کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ چوہدری کی آنکھوں میں نظر آنے والی بے بسی کے تاثرات نے اس کے جلتے ہوئے دل پر جیسے پھواری ڈال دی تھی۔ وہ نوری کو سمجھانے بلکہ ڈانٹنے آیا تھا۔ کہ وہ نہ تو شاہ میر کے ساتھ اچھا سلوک کر رہی ہے اور نہ ہی حویلی کے کسی کام میں دلچسپی لے رہی تھی۔ نوری تو اب تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ وہ اصل صورت حال سے بے خبر ہے۔ مگر اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ چوہدری سب کچھ جانتا تھا۔ یہ بھی کہ نوری اور شاہ میر کے درمیان اول روز سے ہی ایک غلیج حائل ہے۔ نوری جانتی تھی کہ چوہدری شاہ میر کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لئے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کچھ نہیں بتائے گا۔ سودیدہ دلیری سے بولی۔

”چوہدری..... میں ابھی تک شاہ نواز کی لاش کو آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹا سکی۔ مجھے تمہارے بیٹے کا چہرہ کیسے نظر آئے۔“

یہ سنتے ہی چوہدری کا خون کھول اٹھا۔

”تجھے غیرت نہیں ہے۔ تو اتنی بے حیا ہے کسی کے نکاح میں ہو کر کسی دوسرے کے متعلق سوچتی ہے۔ تیرے تو نوٹے کر دینے چاہیں۔ لوگ تجھے ایویں تو بدکردار نہیں کہتے تھے۔ ایسے ہی پچھن تیرے پہلے بھی تھے۔“

چاہیے تو یہ تھا کہ نوری کے سینے میں آگ لگ جاتی ان الزامات کو سن کر۔ مگر وہ ٹھنڈے ٹھار لیچے میں بولی۔

”چوہدری میں تو پہلے ہی بدنام تھی۔ پھر بیوہ بھی..... تو نے مجھے اپنی نوں بنانے کا فیصلہ کیوں کر لیا؟..... چلو کوئی بات نہیں۔ کر لیا ہے تو اب بدل لے..... مجھے طلاق دلو ادا اپنے بیٹے سے میں آج ہی تیری حویلی چھوڑ جاتی ہوں..... پھر تو حویلی کا بندوبست کرنے والی اور کوئی غیرت مند اپنے گھر لے آتا۔“

چوہدری کو اس جوابی حملے کی توقع نہ تھی۔ وہ تملاک رہ گیا اسے پتہ تھا کہ نوری اس کی کمزوری جان گئی ہے۔ اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے خاموشی کی وجہ سے قائم بھرم

”تم جانتی نہیں ہو نور فشاں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم کوئی تحفہ دو اور مجھے پسند نہ آئے یہ تو ہو نہیں سکتا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ تمہاری طرف سے ملنے والے کم قیمت کے تحفے کی بھی میرے نزدیک بہت بڑی قیمت ہے۔ تم اگر مجھے ایک تنکا بھی دو گی تو وہ میرے لئے سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہوگا۔“

اس نے سخت جذباتی لہجے میں جلدی سے کہا۔ خوشی یا شائد اضطراب سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ نور فشاں نے جامد وساکت نگاہوں سے اس کا پرشوق انداز ملاحظہ کیا اور بندھنی اس کے سامنے کھول دی۔  
 ”یہ آپ رکھ لیں۔ بلکہ واپس لے لیں۔ یہ میرے کام کا نہیں۔“

اس نے تھیلی پر شعاعیں بکھیرتے سجے موتی کو شاہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر دھر دیا جو سونے کی ایک زنجیر میں پرویا ہوا تھا۔ وہ گنگ سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ بہت مضبوط جسامت کے مالک شاہ کا بدن اس وقت واضح طور پر لرز رہا تھا۔

اس کی بے یقینی سے پھیلی ہوئی آنکھیں نور فشاں کے چہرے پر گڑی تھیں۔ مگر وہ رخ موڑ گئی۔ شاہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا پھر اس کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے۔ اس نے مٹھی بھینچ لی اور شکستہ قدموں اور جھکے کندھوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ سب خوش فہمیاں دھری گئی تھیں۔ پچھلے کچھ ماہ سے نور کا رویہ پہلے سے قدرے بہتر ہو گیا تھا۔

اب وہ ہوں ہاں میں اس کی پوچھی گئی بات کا جواب دینے لگی تھی۔ اور جب وہ بات کرتا تو اس کی طرف خود سے دیکھ بھی لیتی تھی۔ شاہ میرے دل میں خوش گمانیاں جنم لینے لگیں کہ وہ اس کی محبت سے متاثر ہو رہی ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ پیاسے کو پانی کی جھلک دکھا کر اس کے سامنے بہا دینے والی مثال پر عمل کر رہی تھی۔ وہ اس کی اذیت کو سوا کرنے کے لئے اس پر قدرے مہربان ہو گئی تھی۔ اور شاہ میر خوش فہم یہی سوچ

اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا۔  
 ”چپ کر کے بیٹھ..... میں نے یہ بات نہیں کی تھی۔ میں ملتا ہوں تیرے باپ سے تجھے تو بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔ سنا تھا تو پنڈ کی سب سے بڑھی لکھی کڑی ہے۔“  
 وہ تمللاتا ہوا چلا گیا۔ نوری اس رات سکھ کی نیند سوئی تھی۔

☆☆.....☆☆

کھلی کھڑکی سے چاند کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی کے ساتھ مل کر چاندنی عجیب پر فسون ماحول بنا رہی تھی۔ نور فشاں کھڑکی کے سامنے چیر پر بیٹھی چاند پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ آج وہ ایک خطرناک فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے غور سے اپنی بندھنی کی جانب دیکھا جس میں اس کا فیصلہ دبا تھا۔ بھی کمرے کا بھاری دروازہ ہلکی آواز سے کھلا اور شاہ اندر داخل ہوا۔

ہلکی روشنی میں بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ سیدھا کھڑکی کے سامنے بیٹھی نور فشاں کے پاس آیا۔ اور ہاتھ میں تھا ماہوا گفٹ پیک اس کی طرف بڑھا دیا۔

”پپی فرسٹ میرج اینورسی“

اس نے گفٹ اس کی جھولی میں رکھ کر گجرا پہنانے کے لئے اس کی کلائی تھام لی۔ تب اس کی نگاہ نور فشاں کی بندھنی پر پڑی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”اس میں کیا ہے؟“ دل میں کہیں یہ خوش گمانی بھی جاگی۔

”ہو سکتا ہے اس میں میرے لئے کوئی تحفہ ہو“

اس نے یہ بات کہہ بھی دی۔

”ہاں اس میں آپ کے لئے ایک تحفہ ہے۔ مگر شاید آپ کو پسند نہ آئے۔“

شاہ میر کا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی شادی شدہ زندگی کے پورے گزشتہ ایک سال میں یہ پہلی طویل گفتگو تھی جو نور فشاں نے اس سے کی تھی۔

تم نے اپنی خوشی پانے کے لئے میری محبت کو قتل کروا دیا۔ اپنے باپ سے پوچھو جا کر، بلکہ پوچھنا کیا ہو سکتا ہے یہ کام تم نے اپنی نگرانی میں کروایا ہو۔ میں کیسے اپنی بربادی بھول کر شاہ نواز کے قاتلوں کی زندگی اور تیج سجا دوں۔“

شاہ میر ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ جو جرم اس نے کیا ہی نہ تھا اسے اس کی سزا مل رہی تھی۔ اس نے بھی اس سچ پر نہیں سوچا تھا کہ شاہ نواز لڑائی میں نہیں مارا گیا بلکہ اسے قتل کروایا گیا ہے۔ وہ سیدھا چوہدری سرفراز کے کمرے میں گیا تھا۔

چوہدری اس کے تیور دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا مگر خوش دلی سے بولا۔

”ارے میرا پتر آیا ہے..... آؤ آؤ بیٹھو شیر جوان“  
”مجھے یہ بتائیں کہ شاہ نواز کو آپ نے قتل کروایا ہے۔“ چوہدری بری طرح بدکا تھا۔  
”تجھ سے یہ کس نے کہا۔“

شاہ میر کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ چوہدری کے تاثرات اس الزام کے سچ ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ مارے صدمے کے شاہ میر کی آواز پھٹ گئی۔

”آپ نے وہ غلطی کی ہے کہ ابا جان! جس کا کوئی کفارہ نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے اس جان کے بدلے اب اپنی جان دینی پڑے گی۔ وہ کبھی مجھے معاف نہیں کرے گی۔ میں بے گناہ ہوں مگر وہ مجھے مجرم سمجھتی ہے۔ چلو میں مجرم نہ سہی مجرم کا بیٹا تو ہوں۔ میں تو بے خبر ہی رہا اور وہ سب کچھ جانتی تھی۔ آپ نے مجھے میری محبت کے سامنے رسوا کر دیا۔ مجھے سر اٹھا کر جینے لائق نہیں چھوڑا آپ نے یہ کیا کر دیا۔“

شاہ میر لڑکھڑاتے قدموں سے لوٹ گیا۔ چوہدری کو اسے روکنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆.....☆☆

نوری نے اپنے ماں باپ کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر چوہدری کو معاف

کر وہ آج تہیہ کر کے آیا تھا کہ آج کی رات وہ تمام باتیں نور سے کرے گا جو وہ گزشتہ سال اس رات میں نہیں کر سکا تھا۔ وہ سب دیواریں گرا دے گا جو نور نے اپنے گرد کھڑی کی تھیں۔

مگر نور نے ایسا کاری وار کیا تھا کہ اس کے سب ارادے بلیا میٹ ہو گئے۔ وہ ہار گیا تھا۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس کا دل نہیں جیت سکے گا۔ بہت دیر تک سگریٹ پھونکنے کے بعد وہ ایک بار پھر نور کے سامنے پہنچ گیا۔

”میں جان گیا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ تم مجھے اذیت دینے کا عزم کر کے میری زندگی میں شامل ہوئی ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری تمہیں راضی کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ بس میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم مجھے کس جرم کی سزا دے رہی ہو۔ شاہ نواز اگر قتل ہو گیا تھا تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ نہ ہی میں نے اس کی موت کی کبھی دعا مانگی تھی۔ پھر تم میرے ساتھ یہ سب کیوں کر رہی ہو۔“

سنگھار میز کے سامنے بیٹھی نور فشاں نے آنکھیں میں سے اپنے پیچھے کھڑے شاہ میر کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ تپتپایا ہوا تھا۔ وہ انجان تو نہ تھی کہ اسے پچھلے کافی عرصے سے بخار ہو رہا تھا۔ مگر وہ کوئی دوا نہیں لے رہا تھا۔

اگرچہ وہ شروع سے ڈریسنگ روم میں سو رہی تھی۔ مگر رات رات بھر اسے کھانسنے تو سنتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیماری بڑھ رہی ہے مگر اسے اس کی کیا پروا تھی۔ وہ جس کی خواہش پر اس کے باپ نے شاہ نواز کو قتل کروا دیا تھا۔ وہ اسے کیسے معاف کر دیتی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ گھوم کر شاہ میر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”میں شاہ نواز سے محبت کرتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد وہ محبت دگنی ہو گئی ہے۔ میں اپنی محبت کے قاتلوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کیا یہ جرم کم ہے کہ

چوہدری نہ زندہ ہے اور نہ ہی مردہ مگر میں پھر بھی اسے معاف نہ کروں گی۔“

پھول بکھیرے ہوئے اس نے چپکے سے کہا تھا۔ ماسٹر جی اسے سمجھانے کے لئے آئے تھے۔ ان کے طویل لپکھرنے سے اندھے انتقام سے کھینچ نکالا۔ وہ جو آنکھیں بند کئے دوسری مرتبہ اپنا سہاگ اجاڑ رہی تھی خود احتسابی کے کٹہرے میں جا کھڑی ہوئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک شدید غلطی کرتی رہی تھی۔ چوہدری نوری کو بتا چکا تھا کہ شاہ میر کو اس سارے قصے کا علم نہیں تھا۔ وہ تو اپنے حال میں مست سارا دن کمرہ بند کر کے دھواں اڑاتا رہتا تھا۔

سگریٹ پینا تو اس نے اس روز ترک کیا تھا جس دن چوہدری نے اسے بتایا تھا کہ اب سے ایک ہفتے بعد اس کی نوری کے ساتھ شادی ہے۔

نوری کو پچھتاؤں نے گھیر لیا۔ شاہ میر نے اس کا دل جیتنے کے لئے کتنی کوششیں کی تھیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ بلکہ الٹا اسے ہر طرح سے اذیت دیتی رہی تھی۔

اگر وہ چاہتا تو زبردستی اس سے ہر بات منوا سکتا تھا۔ مگر وہ اتنا نفیس انسان تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر اسے اپنے کمرے میں سونے پر بھی مجبور نہ کیا تھا۔ اسے آپاجی کی کبھی بات یاد آئی۔

”نوری تو کبھی عقل سے کام نہیں لیتی..... ہمیشہ ضد کرتی ہے اور ضد میں اچھے برے کی تمیز بھی بھلا دیتی ہے..... عورت کی ضد اس کی زندگی اجاڑ دیتی ہے۔ مگر تو جانے کب سمجھے گی۔“

وہ نہیں سمجھی تھی۔ اور ضد میں اس نے اپنا نقصان کر لیا تھا۔ وہ اپنے اتنے جانثار شوہر کو موت کے منہ میں دھکیل چکی تھی۔ وہ اب بھی چوہدری کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھی مگر شاہ میر کے بارے میں اس کے خیالات واضح طور پر تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ اسے بھانا چاہتی تھی..... وہ اس کی اچھائی اور عظمت کی قائل ہو چکی تھی۔ اسے اس کی محبت کا اور اک ہو گیا تھا۔ وہ حسین

کرنے پر تیار نہ تھی۔ چوہدری اپنے بیٹے کی زندگی کے لئے نوری سے رحم کی بھیک مانگنے لگا تھا۔

اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ مگر وہ کفارہ دینے کی بجائے معافی کا خواستگار تھا۔ اس کی سب اکڑ اور معزوری ہوا ہو گئی تھی۔ اس کا اکھوتا بیٹا اس کے سامنے دھیرے دھیرے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ مگر وہ بے بس تھا۔ شاہ میر کو شدید قسم کی ٹی بی ہو گئی تھی۔ مگر وہ ڈاکٹروں سے تعاون نہیں کر رہا تھا۔

ڈاکٹروں نے واضح لفظوں میں چوہدری کو بتا دیا تھا کہ اگر وہ خود میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار نہیں کرے گا۔ تو ڈاکٹر اسے بچانے میں ناکام ہو جائیں گے۔ وہ اگر اسی طرح صدمے کے زیر اثر رہا تو زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ زندہ رہ سکے گا۔ پہلے ہی وہ بیماری کی آخری سطح پر پہنچ چکا تھا۔

چوہدری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ کسی ماں کا کڑیل جوان بیٹا جھین کر بھی وہ اپنا بیٹا بچا نہیں سکا تھا۔ اسے پچھتاؤں کے ناگ ڈسنے لگے تھے۔ اس نے شاہ نواز کے ماں باپ سے معافی مانگ لی تھی۔ ان کو کافی ساری زمینیں بھی خون بہا میں دے دی تھیں۔ ان کی منیوں کی تھیں کہ گاؤں میں کسی کو اصل بات نہ بتائیں تاکہ وہ باقی ماندہ زندگی اسی گاؤں میں گزار سکے۔

مگر نوری اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تھی تو صفیہ نے حویلی آ کر اسے بہت طعنے دیئے تھے کہ ابھی تو اس کے بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور وہ شادی رچا کر بھی بیٹھ گئی۔ کیا اس کی محبت اتنی ہی بے وفا تھی۔ مگر اب وہ بھی اسے سمجھانے کے لئے آئی تھی۔ کہ وہ شاہ میر کی زندگی بچالے اور چوہدری کا بدلہ اس کے بیٹے سے نہ لے۔ صفیہ مان گئی تھی کہ نوری کی شاہ نواز کے لئے محبت بہت شدید اور جنونی تھی۔ جس کی خاطر اس نے اپنے محبت کرنے والے شوہر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ وہ صفیہ کے ساتھ شاہ نواز کی قبر پر گئی۔

”شاہ میں نے آپ کے قتل کا بدلہ لے لیا ہے۔

فحش کسی اور کے جرم کی سزا چپ چاپ برداشت کرتا رہا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ بھی نوری سے اس کے تکلف وہ رویے کی بنا پر سخت رویہ نہیں اپنایا تھا۔ اس نے تو کبھی بلند آواز سے اس کے ساتھ بات تک نہ کی تھی۔ نوری نے ڈرائیور کو بلایا۔

”تم جانتے ہو شاہ میر کو کس ہسپتال میں داخل کروایا گیا ہے۔“ ڈرائیور حیران تو ہوا مگر اس نے ظاہر نہ کیا۔

”چھوٹی بی بی! انہیں کونسل کے سینی ٹوریم میں رکھا گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم تیار رہنا میں آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر آتی ہوں مجھے شاہ کے پاس جانا ہے۔“

ڈرائیور نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ وہ بخنکو تیار ہونے کا کہہ کر خود بھی کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ اسے علم تھا کہ شاہ میر کے اندر جینے کی امنگ صرف اس کی مسکراہٹ اور توجہ ہی جگا سکتی ہے۔

بخنکو اس کی قابل بھروسہ ساتھی تھی۔ جس نے پچھلے دو سال سے اس کی جگہ حویلی کا سارا نظام سنبھال رکھا تھا۔ وہ اس کی سب ضروریات کا خیال رکھتی رہی تھی۔

تیار ہوتے ہوئے نوری شاہ میر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوش ہوگا۔ حیران یا پھر اسی رویے کا مظاہرے کرے گا جس کا مظاہرہ نوری کرتی رہی تھی۔

اب اسے شاہ کی صحت کی فکر بھی لاحق ہو رہی تھی۔ کثرت سگریٹ نوشی اور شدید غم نے اس کے پچھلے دلوں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ پچھلے تین ماہ سے وہ سینی ٹوریم میں تھا۔

چودھری تو ہفتے میں ایک بار اس سے ملنے جا رہا تھا مگر نوری ایک مرتبہ بھی نہیں گئی تھی۔ اب وہ جا رہی تھی تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس وقت تک لوٹ کر نہیں آئے گی جب تک کہ شاہ میر ٹھیک نہیں ہو جاتا۔

سارے راستے وہ شاہ میر سے معافی مانگنے کے

لئے الفاظ سوچتی اور ترتیب دیتی رہی۔ چودھری اس کی رونا لگی کی خبر سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ اسے امید بندھ گئی تھی کہ نوری کی توجہ شاہ میر کو تندرست ہونے میں مدد دے گی۔

نوری سوچ رہی تھی کہ اگر وہ رات میں کسی بھی وقت پہنچ گئی تو وہ اپنی شادی کی دوسری سالگرہ ضرور منائے گی۔ اس عزم کے ساتھ کہ وہ شاہ میر کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا ازالہ کر دے گی۔ ڈرائیور اپنی پوری کوشش کے باوجود بھی رات میں وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو نون نکل آیا تھا۔ آج کئی روز بعد کونسل میں سورج نے شکل دکھائی تھی۔ سڑکوں پر ابھی کوئی خاص چہل پہل نہیں تھی۔

ڈرائیور کے ساتھ وہ شاہ میر کے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔

ڈرائیور ڈاکٹر سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب اس نے نوری کا تعارف کروایا تو بے توجہی سے ڈرائیور کی بات سنتا ڈاکٹر بری طرح چوک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”آپ نور فشاں ہیں؟“

نوری حیران رہ گئی۔ کیونکہ ڈرائیور نے صرف اسے شاہ میر کی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ ”جی.....“ ڈاکٹر کے اندر میں مٹی در آئی۔

”آپ کو اب یاد آیا ہے۔ کہ کوئی ہسپتال میں آپ کا شدت سے انتظار کر رہا ہے۔ پچھلے تین ماہ سے آپ کہاں تھیں۔ آپ کو اس شخص کا خیال کیوں نہ آیا۔ وہ اتنا اچھا شخص تھا کہ اسے ملنے والے ہر شخص کو اس سے محبت ہو جاتی تھی۔ ایسے میں آپ کیسے اس کی دشمن بن گئیں۔ میں اس کا ڈاکٹر تھا۔ اس نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ آپ کی بے رخی نے اسے بستر تک پہنچا دیا تھا۔ میں نہیں جانتا اب آپ کس لئے آئی ہیں۔ مگر اسے اب آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ اسے اب کسی کی بھی ضرورت نہیں رہی وہ یہاں نہیں ہے اب۔“

نوری کا دماغ سامیں سامیں کرنے لگا۔ ڈاکٹر یہ کیا

”وہ جانے کس طرح رات میں ہسپتال سے نکل کر باہر چلا گیا تھا۔ ساری رات برف باری میں باہر رہا۔ جس سے اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ مگر اس کی فوری موت کا سبب ہارٹ ایک بنا ہے۔ نرس نے بتایا تھا کہ کل کی شام وہ بہت ڈپرینڈ اور بے چین تھا۔ اس نے برف میں ایک تصویر بنائی تھی۔ اس تصویر کے سامنے ہی وہ دم توڑ گیا تھا۔ صبح جب اسے بستر پر موجود نہ پایا تو ہم اس کی تلاش میں نکلے تھے۔ مگر وہاں اس کی صرف لاش موجود تھی۔ ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے تھے۔ آخری وقت میں وہ تنہا تھا اور شاید اس کی فوری موت کی وجہ بھی یہی تنہائی بنی تھی۔“

بری طرح ہچکیاں لیتی ہوئی نوری منہ پر ہاتھ رکھے اپنی پیچوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر نے اسے رونے دیا۔ وہ اس سنگدل لڑکی کو تسلی دلا سے کا کوئی لفظ نہیں کہہ پایا تھا۔ جس کی بے رخی نے ایک اچھے بھلے انسان کو زندگی مارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد خود پر قابو پا کر نوری نے سر اٹھایا۔

”میں وہ تصویر دیکھنا چاہتی ہوں ڈاکٹر صاحب!“ ڈاکٹر نے ایک نظر الجھت سے درخواست کرتی، روتی ہوئی نوری کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کافی دیر چلنے کے بعد وہ وہاں پہنچ گئے۔ جہاں آج صبح شاہ میر نے دم توڑا تھا۔ وہاں برف اب پھل رہی تھی۔ مگر تصویر ابھی تک واضح تھی۔

انگلیوں سے بنائی گئی تصویر جس میں شاہ میر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

ایک ہٹ کر کھڑکی میں ایک خوش باش جوڑا، عورت کی ہانہوں میں ایک ننھا بچہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں لکھا تھا۔

I Love you Noor

یہ شاہ میر کا اپنی خوشگوار زندگی کے لئے وہ حسرت ناک خواب تھا جس کی تعبیر اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ نوری غش کھا کر اس تصویر کے اوپر جاگری۔

☆☆.....☆☆

کہہ رہا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آ رہی تھی اور جو سمجھ آ رہا تھا اس پر وہ یقین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر انہیں ساتھ لے کر ایک اور کمرے میں آ گیا۔ وہاں ایک لاش رکھی تھی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر کپڑا ہٹا دیا۔

وہ شاہ میر کی لاش تھی۔ نوری کی چیخوں نے دروہام ہلا دیئے۔

”نہیں شاہ! میری غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ دیکھو میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ لوٹ آؤ شاہ..... لوٹ آؤ..... صرف ایک بار شاہ..... صرف ایک بار“

وہ گھٹنوں کے بل وہیں لاش کے پاس گر گئی۔ ڈاکٹر نے تاسف سے بری طرح روتی ہوئی۔ اس حسین لڑکی کو دیکھا اور ہٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

ڈرائیور نے اپنے اتنے اچھے مالک کے یوں مر جانے کا بہت دکھ محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنے صاف سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور چوہدری کو اطلاع دینے کے لئے چلا گیا۔

نوری شاہ میر کی لاش کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ شاہ میر کے ہاتھوں پاؤں کی انگلیاں اور ہونٹ نیلے ہو چکے تھے۔ اس کی خوبصورت آنکھیں نیم وا تھیں جیسے اسے ابھی بھی نور فشاں کا انتظار تھا۔

یہ دوسری جوان لاش تھی۔ یہ دوسرا رشتہ تھا جس کی شدید محبت نوری کے دل میں جاگ اٹھی تھی اور یہ دوسرا شخص تھا جو ہمیشہ کے لئے اس کی دسترس سے دور ہو چکا تھا۔

نوری دوسری مرتبہ بیوہ ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک رونے کے بعد نوری اٹھ کر باہر نکل آئی یہ سب وقت سے پہلے ہو گیا تھا۔ اسے اس کی وجہ معلوم کرنا تھی۔

”ڈاکٹر صاحب ان کے پاس تو ابھی تین مہینے کی مہلت تھی۔ پھر یہ ایک دم سے کیسے۔“

وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ آنسوؤں نے اس کی آواز بند کر دی تھی۔ اسے اب عمر بھر رونا ہی تو تھا۔ ڈاکٹر نے گہرا سانس بھرا اور بولا۔



## یوسف اور نازیہ

ریم رفیق



لئے ایک درزی کے پاس بیٹھا دیا۔ دوپہر کو یوسف سکول سے چھٹی ہونے پر گھر جلدی پہنچنے کے لئے ”شارٹ کٹ“ قبرستان کے راستے گھر جاتا۔ گھر والوں کو اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کس راستے سے آتا جاتا ہے۔ گھر جا کر وہ کھانا کھاتا پندرہ بیس منٹ آرام کرتا۔ پھر درزی کی دکان پر چلا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ امتحان دے کر فارغ ہو گیا۔ لیکن وہ نجانے کیوں بیٹھے بٹھائے اچانک قبرستان کے راستے پر چل پڑتا۔ وہاں جا کر قبروں پر فاتحہ پڑھتا۔ قبروں کی مٹی ٹھیک کرتا اور پھر

محمد حسین سات بھائی تھے۔ سب کے سب بہت خوبصورت تھے اونچے لمبے قد، ناریل کی گری جیسا رنگ اس پر گرے اور گرین آنکھیں۔

سب سے چھوٹا بھائی تو خوبصورتی میں سب کو پیچھے چھوڑ گیا اسی لئے دادا نے اس کا نام ہی یوسف رکھ دیا۔ یوسف بہت ذہین بچہ تھا۔ وہ پڑھائی کے میدان میں دوسرے بچوں کو پیچھے چھوڑ گیا اس کے کلاس فیلوز چھٹی جماعت میں تھے اور وہ میٹرک میں پہنچ گیا۔

دادا نے پڑھائی کے ساتھ اس کو ہنر سکھانے کے

دکان پر جانے کے وقت گھر آ جاتا۔

یوسف کی بھابی کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کہ دوپہر میں یوسف دکان سے پہلے کہیں جائے۔ کیوں کہ پھر کھانا دینے کے لئے وہ انتظار میں بیٹھی رہتی تھیں۔

قبرستان میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس کا دروازہ بند رہتا تھا۔ اس دروازے کی کڑی کے پاس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جس میں سے اکثر سکول آتے جاتے یوسف آنکھ لگا کر جھانکا کرتا تھا۔ لیکن ہمیشہ اسے دوسری طرف اندھیرا دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی یوں لگتا کہ دوسری طرف سے کوئی اور بھی اس سوراخ سے دیکھ رہا ہے۔

ایک دن یوسف کو ابا سے ڈانٹ پڑی۔ کیونکہ بھابی نے ابا کو بتایا کہ پڑوسن کا بچہ کہہ رہا تھا کہ یوسف بھابی قبرستان میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم روز انہیں دیکھتے ہیں۔ دادا جانتے تھے کہ قبرستان آسیب زدہ ہے۔ اس لئے وہ یوسف کو دوپہر کے وقت وہاں جانے سے روکتے تھے۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی یوسف کے قدم قبرستان والے راستے پر اٹھ جاتے۔

اس دن وہ ڈانٹ پڑنے پر دگر تھ تھا اور اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہ آئی کہ کیا ہوا۔ وہ چار پائی سے اٹھا اور قبرستان کے راستے پر چل تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ کمرے کے سامنے بیٹھ کر رو بنے لگا۔ تھوڑی دیر گزری کہ اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ روتا بھول گیا اور ”ہلنگی“ باندھ کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا دروازہ کھلا نہ کوئی باہر آیا نہ کوئی اندر گیا۔ دروازہ کیوں کھلا۔ لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر سے مٹین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی کپڑے سی رہا تھا۔

اس نے دروازے کے سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھا۔

ایک بہت پیاری سی لڑکی کالے کپڑے پہنے بیٹھی

کپڑے سی رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ پھر دکان پر جانے کے خیال سے گھر کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ قبرستان سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی نجانے کہاں سے سامنے آ گئی۔ یوسف کہاں جا رہے ہو؟ رکو.....

وہ رک گیا۔ تم رو رہے تھے؟ میں نے اسی لئے دروازہ کھولا تھا۔ کہ تم سے بات کروں۔ لیکن پھر سامنے سے اچانک میرے پایا آ گئے۔ اور میں نے دروازہ بند کر دیا۔ یوسف نے اس لڑکی کو اپنی بھابی کی ساری بات بتائی۔

وہ ہنس پڑی، بس..... اتنی سی بات اور تم رونے لگے۔ دیکھو یوسف تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ میں ہی دعا مانگتی ہوں کہ تم قبرستان آؤ، اور پھر تم آ جاتے ہو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ یوسف حیران پریشان کتے کی کیفیت میں کھڑا تھا۔

یوسف میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اس طرح کپڑے سینا سکھاؤ۔ جس طرح تمہیں درزی نے سکھائے ہیں۔ مجھے کپڑے سینے کا بہت شوق ہے۔ لڑکی نے یوسف کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ یوسف نے لڑکی کو دیکھا اور حیران ہو گیا۔ اتنا مکمل حسن اور آنکھیں.....

اف..... وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر گویا پتھر ہو گیا۔ پلک جھپکنا بھول گیا۔ ایسے کہ جیسے کوئی جادو کی گرفت تھی۔ یکا یک اس لڑکی نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ یوسف ہوش میں آ گیا اور کہنے لگا اب تو دیر ہو رہی ہے کل سے سیکھا دوں گا۔

اچھا ٹھیک ہے..... اس نے کہا اور کمرے کی طرف مڑی۔

بے ساختہ یوسف نے مڑ کر دیکھا تو حیران ہو گیا اس لڑکی کے بال اس کے پیروں تک لمبے تھے۔ وہ تیزی کے ساتھ چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یوسف نے اپنے ذہن کو جھٹکا۔ میں مرد ہو کر اتنا ڈرتا ہوں اور وہ لڑکی ہو کر بہاد رہے۔ یہ بھی تو قبرستان میں رہتی ہے۔

بعد یوسف نے جانے کی اجازت مانگی۔ ٹھیک ہے۔  
میں کل آؤں گی اس کو خدا حافظ کہہ کر اس نے گھر کی راہ  
لی۔

کہاں تھے تم ناشتہ بھی رکھا ہوا ہے۔ بھابی نے  
پوچھا۔

دوست کے پاس گیا تھا۔ ناشتہ بھی کر لیا ہے۔  
نجانے کن چکروں میں پھرتا ہے۔ بھابی بڑبڑائی۔  
دوسرے دن وہ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر  
رہا تھا۔

بھابی..... یوسف نے بھابی کو پکارا۔  
ہاں کیا ہے.....

ایک بات ہے۔ ہاں کہو.....  
وہ بھابی ایک لڑکی آج مجھ سے سلائی سیکھنے آئے  
گی۔

کیوں..... کیا تم ہی رہ گئے ہو دنیا میں سکھانے  
والے۔

پہلے سیکھنے آئے گی پھر شادی کے لئے ڈورے  
ڈالے گی۔

نہیں بھابی وہ ایسی نہیں ہے۔ چلو ٹھیک ہے بھابی  
اپنی مشین تو دے دیں۔ نہ بھئی نا.....

میں تو نہیں دیتی۔  
آج تو دے دیں..... میں نے کہہ دیا تھا کہ مشین  
ہے گھر میں۔

بھیا آئندہ میری چیز کی حامی نہ بھرتا۔  
آج تو میں دے دوں گی۔ کل سے اپنی مشین  
لائے۔ تھوڑی دیر گزری کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

یوسف نے دروازہ کھولا۔ سامنے وہ کھڑی تھی۔  
کندھے پر مشین رکھی تھی۔ ارے تم اتنا وزن اٹھا کر کس  
طرح آئی ہو۔ وہ ہنس دی۔

بھابی بھی دروازے پر آ گئیں۔ اسے دیکھ کر مبہوت  
رہ گئی۔ اتنی پیاری نازک سی سولہ سترہ سال کی لڑکی اور  
اتنی بھاری مشین، یوسف کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے  
ہوں۔ بچی سے مشین لے لو..... کندھا ہی رہ گیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح یوسف اس لڑکی سے ملنے  
قبرستان پہنچ گیا۔

وہ کپڑے سی رہی تھی۔ مشین کی آواز آرہی تھی۔  
اس نے دروازہ بجایا۔ لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس نے  
کہا کہ میں تمام رات سوچتا رہا ہوں۔

کیا؟ لڑکی نے مسکرائے پوچھا۔  
یہ کہ تم یہاں اکیلی ہوئی ہو اور تمہیں یہاں بیٹھ کر  
کپڑے سینا نہیں سکھا سکتا۔ ”اچھا“ لڑکی نے ٹھوڑی  
کے نیچے ہاتھ رکھ کر ایک ادا کے ساتھ اچھا کہا پھر کافی  
دیر خاموشی رہی۔ پھر یوسف نے خاموشی کو توڑا۔ کیا تم  
میرے گھر آ سکتی ہو؟

گھر..... رات..... لڑکی نے گھر کو لمبا کھینچا۔  
ہاں..... ہاں..... میرے گھر..... میرے گھر میں

میرے دادا۔ میرے ابا اور پانچ بھائی اور ایک بھابی  
رہتے ہیں۔ میرے تین بھتیجے اور چار بھتیجیاں ہیں۔ تمہیں  
گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

لڑکی نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ میں کیوں گھبراؤں گی۔  
ٹھیک ہے میں کل صبح دس بجے آ جاؤں گی۔ مشین بھی  
لاؤں لڑکی نے پوچھا۔

نہیں گھر میں ہے۔ ٹھیک ہے پھر لڑکی نے ایک  
چادر اٹھائی تو یوسف نے دیکھا کہ کسی سے بھرا جگ اور  
تین پرائیوٹ، مکھن اور دہی کے ساتھ رکھے تھے۔ لو کھالو  
اس نے کہا۔

نہیں تم کھاؤ میں کھا کر آیا ہوں۔  
کھاؤ تو سہی اور کسی پی کر دیکھو ایسی لسی تم نے کبھی

نہیں پی ہوگی۔ یہ کہہ کر اس نے کسی کا گلاس یوسف کے  
ہاتھ میں پکڑا دیا۔

جیسے ہی یوسف نے گھونٹ بھرا۔ وہ مان گیا کہ لسی  
واقعی مزیدار تھی۔ پھر اس نے پرائیوٹ کا نوالہ لیا۔ منہ میں  
رکھتے ہی حرا آ گیا۔ پرائیوٹ بھی لذیذ تھا۔

یہ تم نے پکائے ہیں۔ یوسف نے پوچھا۔  
ہاں..... اچھا ہے نا..... لڑکی بولی۔

بہت اچھا..... یوسف نے جواب دیا، ناشتے کے

یوسف نے مشین اس کے کندھے سے اتار دی اور برآمدے میں بچے تخت پوش پر رکھ دی۔

آؤ آؤ..... بھابی نے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ بیٹھو میں آتی ہوں بھابی نے کہا۔

بھابی اس کے لئے..... انار لے آئیں..... دانے نکال کر اس کو دیئے۔ لو کھا لو..... ساتھ میں تفصیل بھی پوچھتی رہیں۔ کہاں رہتی ہو باپ کا کیا کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ لڑکی مسکرا مسکرا کر یوسف کی بھابی کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔

پھر لڑکی مشین زمین پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یوسف کے دوست آ گئے۔ یوسف نے بھابی کو بتایا کہ میں ایک گھنٹے تک لوٹ آؤں گا۔ ضروری کام سے جا جا رہا ہوں۔ بھابی لڑکی کی خوش اخلاقی سے بہت خوش تھیں۔ وہ لڑکی اس طرح کھل گئی جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ اس نے بھابی کے ساتھ گھر کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ کھانا بنانے میں مدد کی اور پھر جانے کی اجازت مانگی۔

نہیں دوپہر میں اکیلی کیسے جاؤ گی۔ نہیں بھابی میں چلی جاؤں گی۔ ابھی دروازے پر دستک ہوئی۔ لو بھابی میرے ابا مجھے لینے آ گئے ہیں۔ میں جا رہی ہوں اور وہ تیزی سے گھر کے دروازے سے باہر چلی گئی۔

دوسرے دن رات کو سب سو رہے تھے کہ یوسف کے پاؤں کا اگٹھا ہلا۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور لڑکی کو دیکھ کر حیران ہوا۔

تم اس وقت.....؟

ہاں کیوں.....؟ التا سوال آیا اس کی طرف۔

رات کے ڈھائی بجے تم اندر کیسے آئیں۔

دیکھو یوسف میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں انسان نہیں ہوں۔ میرا تعلق جنات سے ہے، میں اس وقت سے تمہارے پیچھے ہوں جب تم آٹھویں جماعت میں تھے۔ میں ہر روز تمہارا انتظار کرتی

تھی کہ کب تم یہاں سے گزرو گے۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں تم اسے محبت کہہ سکتے ہو۔ یوسف نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔

تم فکر نہ کرو..... اگر کوئی جاگ بھی گیا تو میں اسے نظر نہیں آؤں گی۔ پھر اس نے ایک دن پہلے والا واقعہ یوسف کو سنایا۔ کہ کس طرح بھابی اس کو اکیلے جانے نہیں دے رہی تھیں اور اس نے ہاتھ بڑھا کر باہر کے دروازے کی کڑی بجائی اور اپنے ابا کے آنے کا بتا کر چلی گئی۔

یوسف بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس نے یوسف کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اگر گھر والے جاگ گئے اور ہنسنے کی وجہ پوچھی تو کیا بتاؤ گے؟

ہاں یوسف نے تابعداری سے گردن ہلائی۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پھر وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فجر کی اذان سے پہلے وہ چلی گئی اور کہا کہ صبح تمہاری بھابی کے پاس آؤں گی۔ بھابی سے جوتے نہ کھا بیٹھنا۔ یوسف ہنسا۔

نہیں..... تم دیکھنا وہ ہر وقت میرے گن گائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گئی۔ یوسف اس کے جانے کے بعد سوچتا رہا۔ وہ جن، میں انسان اللہ نے ہم دونوں کے دلوں میں محبت کیوں ڈالی۔

فجر کی نماز اور تلاوت کے بعد معمولات زندگی شروع ہو گئے۔ نہادھو کر یوسف نے ناشتہ کیا بھی ان کے والد اور بڑے بھائی آ گئے۔ والد نے بغور یوسف کو دیکھا تو کہنے لگے۔ یوسف کیا بات ہے۔ تیرا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو رہا ہے۔ کیا کھانا ٹھیک سے نہیں کھا رہے ہو۔

نہیں ابا..... سب کچھ کھاپی رہا ہوں۔ بس گری ہے ناس لئے ابا نے بھابی کو ہدایت کی کہ دودھ رات کو خود اپنے سامنے اسے پلائیں۔

کھانے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تمام کپڑے دھلے ہوئے تار پر سوکھ رہے تھے۔ گھر بھی دھل کر نکھرا ہوا تھا اور فرش کی ٹھنڈک پاؤں کے راستے آنکھوں میں پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے جوتا اتار کر ٹھنڈے فرش پر پاؤں رکھ دیئے۔

ارے یہ سب کام تم نے اتنی سی دیر میں کیسے کر لئے۔

بھابی میں نے تو روٹیاں بھی پکالی ہیں۔  
اب آپ مجھے اجازت دیں۔ میں چلتی ہوں۔  
ابا با ہر کب سے کھڑے ہیں۔ اچھا لیکن کھانا تو کھا

بھابی کو پڑوس سے بچہ بلانے آ گیا۔ میری دادی آپ کو بلارہی ہیں۔ ابھی چلیں۔

اس کے جانے کے بعد یوسف کی بھابی سوچنے لگیں کہ..... اتنے کم وقت میں یہ سب کام اس لڑکی نے کیسے کیا۔

اتنے کم وقت میں تو کوئی جن ہی کام کر سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کاتپ گئیں کیا یہ لڑکی ”جننی“ ہے۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں زہرہ مشتری کو بلایا اور پوچھا۔ یہ سب کام کیسے ہوا۔ پتہ نہیں ہم تو گڑیا سے کھیل رہے تھے۔ تم اتنی بڑی گھوڑی ہو گئی ہو۔ شرم نہ آئی کہ ایک غیر لڑکی کام کر رہی ہے اور تم کھیل رہی ہو۔

انہوں نے بارہ سالہ زہرہ کو گھوڑی کا خطاب دیا۔ وہ اماں..... باجی آج ہمارے لئے کپڑے کی گڑیاں لائی تھیں بنا کر۔ تو انہوں نے کہا تم ان کے کپڑے بناؤ۔ مشتری اور ثریا۔ گڑیاں کھیلیں زہرہ تم گڑیوں کے کپڑے سیو۔ انہیں تیار کرو میں کام کر رہی ہوں باہر مت آنا۔

وہ خاموش ہو گئیں۔ دوسرے دن انہوں نے موقعہ دیکھ کر یوسف سے بات کی۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔ تو انہوں نے یوسف سے کہا کہ سچ بچ بتاؤ یہ لڑکی کون ہے۔ یوسف گھبرا گیا کہنے لگا بھابی آپ کو کیا دہم ہے۔ بھابی نے کہا کہ یہ لڑکی انسان نہیں ہے۔ کیونکہ کل اس نے جس تیزی سے سارے کام کیے۔ وہ

دن کے ٹھیک دس بجے وہ آگئی۔ بھابی اسے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ لاؤ بھابی میں کرلیے چھیل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے بھابی کے ہاتھ سے سبزی کی ٹرے لے لی۔

پھر بھابی کو کہنے لگی۔ بھابی آپ نہالو۔ میں سالن بھی پکا دوں گی۔ نہیں میں کپڑے دھو کے پھر نہاؤں گی۔ ایک جوڑا بھی اتاریں تو آٹھ جوڑے ہوتے ہیں۔

اچھا بھابی جیسے آپ کی مرضی..... اور وہ بھابی سے باتیں کرنے لگی۔

بھابی کو پڑوس سے بچہ بلانے آ گیا۔ میری دادی آپ کو بلارہی ہیں۔ ابھی چلیں۔

اپنی دادی سے جا کے کہو کہ میں کھانا پکا رہی ہوں۔ شام کے وقت عصر کے بعد آؤں گی۔ بھابی نے بچے سے کہا۔ بچہ چلا گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ دوبارہ آ گیا۔

دادی کہتی ہیں کہ کام پھر کر لینا دو گھڑی کے لئے آ جاؤ۔ لڑکی نے بھابی سے کہا۔ بھابی آپ پتہ کر لیں۔ کیا معلوم کوئی ضروری بات ہو۔

آپ فکر نہ کریں۔ میں سب کام کر لوں گی۔ اور بہت اچھا کروں گی۔ آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔

اچھا..... بھابی نے بے دلی سے جانے کا ارادہ کیا۔ بھابی آپ دیکھنا میں اتنا اچھا کھانا بناؤں گی کہ آپ انگلیاں چاٹتی رہ جائیں گی۔ بھابی ہنس پڑیں۔ اچھا بابا..... تم بنا لو کھانا اور بچے کے ساتھ چلی گئیں۔

وہاں جا کے باتوں میں ایسی مگن ہوئیں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ظہر کی اذان کی آواز پر وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئیں اور جانے کی اجازت مانگی۔

بوڑھی اماں بھی پریشان ہو گئیں آئے ہائے..... وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ اب نماز کے بعد سب لوگ گھر آ کے کھانا مانگیں گے۔ تم کیا کہو گی۔ اللہ مالک ہے۔ یہ کہہ کر بھابی تیزی کے ساتھ صحن بار کر گئیں۔

گھر میں داخل ہوئیں تو حیران رہ گئیں۔ گھر میں

انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

آخر یوسف کو بتانا پڑا۔ کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا تعلق جنات سے ہے۔ لیکن بھابی ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بھابی خوف زدہ ہو گئیں۔

یوسف گھر میں بچیاں ہیں اللہ نہ کرے کسی کو کچھ ہو جائے۔ لیکن جنات سے دوستی اچھی نہیں ہے۔

بھابی..... اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے گھر کو اس کی قوم کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔

بس آپ یہ بات..... ابا اور بھابی کو نہ بتانا۔

بھابی بے بسی سے خاموش ہو گئیں۔

اپنے وقت پر وہ آگئی۔ آج یوسف کی بھابی خوف

زدہ تھی۔ ان کا رنگ اس کو دیکھ کر پیلا پڑ گیا۔

بھابی..... آپ ڈریں نہ..... میں وہی تو ہوں جس

سے آپ روز باتیں کرتی تھیں۔ آپ بھول جائیں کہ

میرا تعلق جنات سے ہے۔ بھابی نے اس کے سامنے

ہاتھ جوڑ دیئے۔

دیکھو خدا کے لئے ہمارا چچھا چھوڑ دو۔

نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے اپنی دیورانی بنا

لیں۔ لیکن بھابی کسی طور اس کو قبول نہیں کر رہی تھیں۔ وہ

بہت ڈری ہوئی تھیں۔ تم ایسا کرو۔ چلی جاؤ..... اس

وقت آتا جب یوسف گھر ہو۔

وہ بہت ہنسی۔ بھابی اگر مجھے کچھ کرنا ہو گا تو یوسف

بھی نہیں روک سکے گا۔ خیر میں چلی جاتی ہوں اور وہ

غائب ہو گئی۔

لیکن یہ کیا نجانے کیسے بھابی کو بیٹھے بیٹھے نیند

آگئی۔ اور جب ان کی آنکھ کھلی تو حیران رہ گئیں۔ گھر

میں پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو کسی بھی ظہیر

کی اذان کی آواز آئی۔ ارے میں اتنی دیر تک سوئی

رہی۔ ابھی نماز کے بعد سب کھانا کھانے آ جائیں

گے۔

وہ گھبرا کے کچن کی طرف دوڑیں۔ پھر جو کچھ دیکھا

وہ دیکھ کر سکتے میں آ گئیں۔ پلاؤ دم پر رکھی تھی۔ شامی

نکیاں تو بے پر تلی جا رہی تھیں۔ کون تل رہا تھا۔ وہ ہستی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس گرم گرم نکیاں پلیٹ میں رکھی جا رہی تھیں اور پچی نکیاں تو بے پر۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوتیں۔ انہیں نازیہ نظر آ گئی۔ بھابی یہ سب میں نے کیا ہے۔ آپ ڈریں مت۔

بھابی کچن سے کمرے میں آ گئیں۔ کچھ دیر بعد

سب مرد نماز پڑھ کے کھانا کھانے آ گئے۔ وہ زہرہ اور

مشتی کے ساتھ کھانا لگانے لگیں۔ یوسف سے انہوں

نے کہا کہ اس سے کو تم سے واسطہ رکھے ہمارا پیچھا چھوڑ

دے۔

یوسف ہنسا بھابی آپ کی دیورانی ہے۔ اللہ نہ

کرے۔ میں تو کبھی ”جنوں“ سے رشتے داری نہ

کروں۔

بھابی آپ اسے برا بھلا نہ کہا کریں۔ میں اسے

سمجھا دوں گا۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ بھابی بولی۔

انہی دنوں یوسف کا جھنجھا پیدا ہوا۔ وہ بچے کے

کپڑے بنا کر لائی۔ بہت خوبصورت کڑھائی والے

کرتے اور پاجامے، بستر، چاندی کی کنوڑی جج وغیرہ،

یوسف بچے کا نام امجد رکھو۔ مجھے بہت پسند ہے اور

یوسف نے بھابی سے کہا یہ میرا امجد ہے۔ اس کا نام نہیں

لیا ورنہ بھابی بھی بھی یہ نام نہ رکھتیں۔

بھابی کو تو اس سے خدا واسطے کا پیر تھا۔ جب بھی

ذکر ہوتا بھابی اس کو گالیاں اور کوسے دیتیں۔ کیونکہ اس

نے ان کے سب سے لاڈلے دیور پر قبضہ جمالیا تھا۔ وہ

یہ سمجھتی تھیں کہ یوسف اس کے جن ہونے کی وجہ سے

ڈرتا ہے۔ اور اس وجہ سے اسے کچھ نہیں کہتا۔ بھابی نے

یوسف کے بھائی اپنے شوہر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا

اور پھر انہوں نے ساری بات زہرہ کے ابو کو بتائی۔ وہ

بھی پریشان ہو گئے انہوں نے کہا کہ میں کسی عامل کا پتہ

کرتا ہوں اور یوسف کو اکیلا نہ بیٹھنے دینا۔ اپنی نظر میں

رکھنا۔

رات کو وہ جن زادی بڑے غصے میں یوسف کے

پاس آئی اور کہنے لگی۔ تمہاری بھابی نے اچھا نہیں کیا، یہ

کچھ بھی کر لیں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ اور ان کو سزا بھی ضرور ملے گی۔

نہیں بدتمیزی نہ کرنا۔ وہ میری بھابی ماں کی جگہ ہیں۔ دوسرے دن بھابی دوپہر کے کھانے کے لئے آنا گوندھ رہی تھیں کہ امجد کی بلک بلک کے رونے کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے ہاتھ دھو کر کمرے کی طرف بھاگیں۔ جیسے ہی وہ لکڑی کے جھولے کی طرف بڑھیں ان کی جان ہی نکل گئی۔ ایک بہت بڑا کالا سانپ پورے جھولے کے کناروں پر لیٹا ہوا پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔

انہوں نے رونا شروع کر دیا ہائے میرا بچہ..... تبھی باہر سے یوسف آ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نے بھابی کو تنگ کرنے کے لئے سانپ کا روپ دھارا ہے۔

یوسف نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ بھابی کو کیوں پریشان کر رہی ہو۔ ہٹو تبھی سانپ غائب ہو گیا اور وہ سامنے آ گئی۔ بھابی مجھے گالیاں نہ دیا کرو۔ میں تمہارا کیا لیتی ہوں۔ یوسف سے میں شادی کروں گی۔ خوشی سے کروں گی تو تم فائدے میں رہو گی نہیں تو میں یوسف کو ساتھ لے جاؤں گی۔ تم شکل کو ترسو گے۔

جادو دفعہ ہو تو..... کالا منہ تیرا یہ کہہ کر بھابی نے امجد کو جھولے سے نکال لیا۔

دوسرے دن بھابی نے نہلا کر امجد کو کپڑے پہنائے اور جھولے میں لٹا دیا۔ خود سبزی بنانے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ سبزی بنانے کے فارغ ہوئیں تو جھولے پر نظر گئی۔ یہ کیا جھولا خالی تھا۔ امجد کہاں ہے۔ انہوں نے گھبرا کے بیٹی کو آواز دی۔

زہرہ..... زہرہ..... دونوں ہمیں تقریباً دوڑتی ہوئی آئیں۔ جی امی..... اری امجد کہاں ہے۔ امی بھیا تو آپ کے پاس تھا۔ ہم تو فرش دھو رہے تھے۔ اری او کم بختو دفعہ کہا ہے کہ جب میں کام کر رہی ہوں تم بھابی کا دھیان رکھا کرو۔

امی وہ تو جھولے میں لیٹا رہتا ہے۔ چلتا تو نہیں ہے جو کہیں چلا جائے گا۔ انہوں نے رونا شروع کر دیا۔

## ماہِ صیام

آؤ خوشی منائیں ماہِ صیام آیا  
سوتوں کو اب جگائیں ماہِ صیام آیا  
لگ جائے گا کنارے اس شخص کا سفینہ  
پایا جہاں میں جس نے رحمت کا یہ مہینہ  
رکھے گا جو بھی روزہ وہ عالی شان ہو گا  
جنت کی دادیوں میں اس کا مکان ہو گا  
روزے کو رکھ کے جس نے کھانے سے منہ کو موڑا  
اپنے خدا سے گویا رشتہ ہے اس نے جوڑا  
سب رحمتیں اسی پر سات آسمان اسی کے  
جس نے بھی روزہ رکھا دونوں جہاں اسی کے  
لطف و کرم کے اس نے کیا کیا مزے نہ چکھے  
ہر حال میں بھی جس نے روزے تمام رکھے  
(افضل عاجز، لاہور)

اری جا کے چاچا کو بلا کے لا۔ وہی ذیل کینٹی لے گئی۔  
میرے بچے کو۔ بھی کسی کے تہمتوں کے آواز آنے لگی۔  
جو سب نے سنی۔

پڑوسن بھی رونے کی آواز سن کر آ گئی اور پھر  
پورے محلے میں بات پھیل گئی۔ قبرستان والی جن زادی  
امجد کو اٹھا کے لے گئی ہے۔

دادا یوسف کے ابا کو پتہ چلا تو وہ سب گھر والوں پر  
ناراض ہوئے۔ گھر میں یہ سب ہو رہا تھا۔ مجھے کیوں  
نہیں بتایا۔ یوسف کو بلا کر پوچھا تو پتہ چلا کہ امجد تو بالکل  
ٹھیک ہے۔ وہ ماں کی طرح اس کا خیال رکھ رہی ہے۔  
صرف بھابی کو تنگ کرنے کی وجہ سے وہ امجد کو لے گئی  
ہے۔

کیوں؟ بھابی کو کیوں تنگ کر رہی ہے۔ ابا نے  
پوچھا۔

بھابی اس کو گالیاں دیتی ہیں۔ بڑی ناراض ہے وہ۔ میں نے بھابی سے کہا بھی تھا کہ گالیاں نہ دیا کریں۔  
بہو تم کیوں گالیاں دیتی ہو۔

اس لئے ابا کے وہ یوسف کا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہیں ہے۔ اور جب دل چاہتا ہے سارے گھر کا کام منٹوں میں کر جاتی ہے۔ کھانا پکانے جاؤں تو پہلے سے ہی پکا رکھا ہوتا ہے۔ اور جب ناراض ہوتی ہے تو صاف گھر کو پلک جھپکنے میں گندا کر دیتی ہے۔ باورچی خانے کی چیزیں سٹور میں ہاتھ روم کی چیزیں باورچی خانے میں۔ سب کے کمروں کا بھی سامان الٹ پلٹ کر دیتی ہے۔ پھر بھابی سارا گھر سیٹ بھی تو وہی کرتی ہے۔ یوسف نے طرف داری کی۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پرسوں کی بات ہے میں سارا گھر دھو دھلا کر نہا کر بیٹھی تھی کہ ساتھ والی اماں اپنی بہو کے میکے والوں کو ملوانے لے آئیں وہ کراچی سے آئے ہیں۔ ان سے مل کر انہیں کمرے میں بٹھانے کے لئے اندر لائی تو پورے کمرے میں مٹی تھی فرش تو نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ کرسیوں کے کش مٹی سے آٹے ہوئے تھے۔ پورا کمرہ دھول مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوئی۔ آخر انہیں برآمدے میں چارپائی پر بٹھایا۔ اس کے علاوہ جب زہرہ چائے بنا کر لائی تو چائے میں سے مریچ کا ذائقہ آ رہا تھا۔ ایسا تھا کہ جیسے پتی کے بجائے مریچ کی چائے بنائی ہو۔ اس قدر شرمندگی ہوئی کہ پوچھیں مت۔ بھابی نے وضاحت کی۔ بھی وہ سامنے آ گئی۔

نہیں ابا جی..... بھابی نے پوری بات نہیں بتائی ہے۔ بھابی جب نہانے گئیں۔ میں نے ان کی بالٹی میں خوشبو اور گلاب کی پیتاں ڈال دیں، یہ ایک پیغام تھا صلح کا۔ انہوں نے گالیاں اور کوسنے دینے شروع کر دیے۔ اگر میں گھر کے کام کرتی ہوں تو کیا برائی ہے۔ یہ بھی بھابی کے خیال سے کہ ابھی ”چھلے“ سے اٹھی ہیں چھوٹا سا بچہ ہے۔ زیادہ کام نہ کریں۔ یہ اس پر بھی گالیاں دیتی

ہیں۔ بس اسی لئے میں نے مہمانوں کے سامنے انہیں ”بھوہڑ“ ثابت کیا۔ یہ میری غلطی ہے۔ لیکن میں بہت غصے میں تھی۔ میں نے بلا سوچے سمجھے گند پھیلا دیا۔ منجھے معاف کر دیں اور پھر وہ ابا کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میں یوسف کو بہت چاہتی ہوں۔ آپ مجھے بہو بنالیں۔ میں سب کی تابعدار اور خدمت گزار رہوں گی۔  
نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر ابا جی گھر سے باہر نکل گئے۔ وہ بھابی کے قدموں میں آ بیٹھی۔

بھابی خدا کے لئے..... آپ میری مدد کریں۔ دیکھیں آپ بھی عورت ہیں۔ عورت ہونے کے ناطے آپ میرے مسئلے کو سمجھ سکتی ہیں۔ میرا پیار نہ چھینیں میں اور یوسف ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ان باتوں کو چھوڑو۔ میرا بچہ لے کے آؤ۔ بھابی نے سخت لہجہ اختیار کیا۔

ٹھیک ہے بھابی آئندہ میں آپ کے کام میں مداخلت نہیں کر دوں گی۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ لیکن میں یوسف کو نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ اس کام کے لئے کوشش بھی نہ کرنا۔ ورنہ بہت پچھتا میں گے آپ لوگ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر بھابی کمرے میں گئیں تو دیکھا امجد جھولے میں لیٹا کھیل رہا ہے۔ بہت خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے اور پہلے سے صحت بھی اچھی ہو رہی تھی۔ گال سرخ نماڑ ہو رہے تھے۔

بھابی نے جلدی سے لپک کر امجد کو گود میں اٹھالیا اور بے اختیار روئے لگیں۔ روتی رہو گی یا جھولے پر نظر بھی ڈالو گی۔ نازہ کی آواز کان کے قریب سنائی دی۔ انہوں نے چونک کر جھولے کی طرف دیکھا۔

کلڑی کے جھولے پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا اور گنگ لگے ہوئے تھے۔ جھولے کے کناروں پر چاندی کے پھول لڑیوں میں لٹک رہے تھے اور جھولے کے بستر پر نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں یہ روپے امجد کی پڑھائی اور کاروبار کے لئے ہیں۔



ابھی وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں کہ محمد حسین امجد کے ابو آگئے۔ وہ بھی یہ سب دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے دل میں نازیہ کے لئے نرم گوشہ اس وقت پیدا ہوا جب نازیہ اباجی کے قدموں میں بیٹھی التجائیں کر رہی تھی۔ ان کی بھی بیٹیاں تھیں۔ نجانے کب کوئی محبت کی اسپر ہو جائے۔ تو کیا وہ بیٹی کا دل توڑ دیں گے۔ نہیں نہیں..... میں کسی کا دل نہیں دکھاؤں گا۔ یوسف بھی مرجھا کر رہ گیا ہے۔ میں یوسف کا ساتھ دوں گا۔ انہوں نے فیصلہ کیا۔ لیکن اباجی اور ان کی بہو کی ”ناں“ ”ہاں“ میں نہ بدلی۔

آخر انہوں نے ایک عامل ڈھونڈ ہی لیا۔ جو کہ جنات کو جلا کر ”بھسم“ کرنے کا وعیدار تھا۔ محمد حسین نے روکنے کی کوشش کی تو وہ محمد حسین سے ناراض ہو گئے۔

شام کے وقت صحن میں تخت بچھا کر بستر بچھا دیا گیا۔ پیر صاحب نے اپنی پڑھائی شروع کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد ”نازیہ“ حاضر ہو گئی۔ ساتھ میں اس کی ماں بھی تھی۔ مولوی نے ان دونوں کو حصار میں قید کر دیا اور بھسم کرنے کا عمل شروع کر دیا۔

یوسف رونے لگا۔ بھائی جی..... میری نازیہ..... بھائی جی میں مرجاؤں گا۔ میری نازیہ کو بچالو۔ یوسف کو محمد حسین نے گلے سے لگا لیا اور نازیہ کو بچانے کی ترکیب سوچنے لگے۔

مولوی نے کہا تھا کہ حصار سے دور رہنا۔ اگر کسی کا پاؤں یا کوئی چیز حصار کی لکیر سے گزر گئی تو حصار ختم ہو جائے گا۔ ان کے ذہن میں فوراً ترکیب آ گئی۔ انہوں نے امجد کو زمین پر بٹھا دیا، امجد گھٹنوں کے بل چلتا ہوا حصار کے دائرے کے پاس پہنچ گیا اور دونوں ہاتھ اور سر سے دائرے میں داخل ہو گیا۔ یہ سب آنا فانا ہوا اور نازیہ نے امجد کو گود میں اٹھا لیا اور دونوں ماں بیٹی دائرے سے فرار ہو گئیں۔

مولوی نے اپنا سر پیٹ لیا یہ کیا کیا تم نے بچے کو

کیوں چھوڑا۔ میری ساری محنت ضائع ہو گئی ہے۔ اب تم لوگوں کی خیر نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن محمد حسین مطمئن تھے۔ انہوں نے نازیہ کی مدد کی تھی۔ پھر وہ کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لیکن سب لوگ ناراض ہو رہے تھے۔ ارے امجد کو تو لے آؤ اس چڑیل سے۔ کبھی میرے بچے کا کلیجہ کھا جائے۔ کیا تک رہی ہو۔ محمد حسین نے بیوی کو ڈانٹا۔ امجد تو یوسف کی گود میں ہے۔ جو منہ میں آتا ہے کہے چلے جاتی ہو۔

☆.....☆.....☆

عشاء کی نماز پڑھ کر انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ یوسف اور نازیہ کے نکاح کا اور اسی وقت اس پر عمل بھی کر لیا۔ نازیہ کے ماں باپ کو یوسف نے بلایا، محمد حسین نے بات کی اور پھر مسجد میں نازیہ اور یوسف کا نکاح پڑھا دیا۔ نازیہ کی سہیلیوں نے مہندی لگائی۔ لہٰذا بنایا اسی طرح یوسف کو بھی منٹوں میں دلہا بنا دیا۔ پھر گھر جا کے چھت پر جو کمرہ تھا اس میں تیج بھی بنا دی اور پھر نازیہ کو رخصت کر دیا۔ محمد حسین نے نازیہ سے وعدہ لیا کہ وہ گھر میں کسی کو دکھائی نہ دے اور نہ ہی کوئی گھر کا کام کرے۔ محمد حسین نے گھر کا راستہ لیا۔ نازیہ یوسف کا ہاتھ پکڑ کے ان سے پہلے ہی گھر پہنچ گئی۔ یوسف نے اپنے ابا سے کہا کہ میں اوپر والے کمرے میں رہنا چاہتا ہوں۔ کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور پڑھائی کا عذر پیش کیا۔ بچوں کے شور کی وجہ سے پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے ابا نے اجازت دے دی۔

لیکن بھابی کو تجسس تھا کہ ایک تو نازیہ نہیں آرہی ہے۔ نہ ہی یوسف قبرستان جاتا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے وہ ٹوہ میں لگ گئیں۔

آخر ایک رات انہوں نے پکڑ ہی لیا۔ نازیہ اور یوسف دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے رات کے دو بجے تھے اس وقت سب گھر والے سو رہے تھے اور نازیہ انسان کے روپ میں تھی کہ اچانک بھابی آگئیں اور جوتا اٹھا کر دو جوتے کمر میں مارے۔ نازیہ ٹھکری ہو گئی اور

بدتمیزی کی وجہ پوچھی۔  
تم دفعان کیوں نہیں ہوتی ہو ہماری زندگی سے۔  
عید کے چاند میں یوسف کی شادی کر دوں گی۔ تم بچپنا  
چھوڑ دو اس کا۔ ہماری شادی ہو گئی ہے۔ آپ کو تکلیف  
کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھابی نے سوچا ابا کو  
بتاؤں گی اور نیچے آ گئیں۔ جہی نازیہ کی ماں آ گئی۔ میں  
چاہتی تو اس کا ہاتھ توڑ دیتی۔ اب میں اپنی بیٹی کو یہاں  
نہیں رہنے دوں گی۔

لیکن نازیہ نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اماں  
یوسف کے بھائی جی بہت اچھے ہیں۔ ہوا کریں بس  
بہت ہو گئی محبت اب یوسف قربانی دے۔ اس کی باری  
ہے۔ تم نے تو قبیلہ بھی چھوڑ دیا۔ اس کے لئے۔ اب یہ  
اپنا خاندان چھوڑے گا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا یوسف نے  
کہا۔ تمہاری بیٹی میرے پیچھے پڑی تھی میں نہیں۔ اس  
کے اندر کا غصیلا مرد بولا۔  
تم اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔ نازیہ کی ماں نے نازیہ کو  
بالوں سے پکڑا اور غائب ہو گئی۔

صبح وہ اداس اداس بھابی کے پاس آ بیٹھا۔ بھابی  
آپ نے اچھا نہیں کیا۔ تو چپ رہ تھے نہیں معلوم تو  
کس بلا کے سنجے میں ہے۔ خیر میں نے بندوبست کر لیا  
ہے۔ تیری جان چھڑانے کا۔  
نازیہ کی ماں نے نازیہ کو قید کر دیا۔ نازیہ کی  
سہیلیوں کو پتہ چلا تو وہ مدد کو آ گئیں۔ انہوں نے سارا  
پر وگرام ترتیب دے لیا۔

یوسف مغرب کی نماز پڑھ کر آ رہا تھا کہ راستے سے  
غائب ہو گیا نازیہ کی سہیلیوں نے یوسف کو اٹھا کر نازیہ  
کے پاس پہنچا دیا۔ محمد حسین سمجھ گئے کہ کوئی گڑبڑ ہوئی  
ہے جس کی بناء پر یوسف کو اغواء کیا گیا ہے۔  
رات کو نازیہ کے ماں باپ کے قریبی عزیز اکٹھے  
ہوئے اور انہوں نے فیصلہ دیا کہ یوسف ہر مہینے اپنے  
گھر والوں سے ملنے جا سکتا ہے۔ اس کے گھر والوں کا  
ہم سب خیال رکھیں گے اور عید والی رات بھی جائے گا  
اور نماز عید کے بعد اسے واپس لے آئیں گے۔ اگر یہ

بھابی اکثر یاد کر کے روتی تھیں اور اپنی اولاد کی  
اولاد کو یہ قصہ سناتی تھیں۔

☆.....☆.....☆



کہانیاں رنٹ گی کی  
(مختصر کہانیاں)

## بی امی

مزن گت غفار

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران  
اے قائد اعظم تیرا احسان ہے تیرا احسان  
یہ تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے  
اپنے پرچم تلے ہم سپاہی چلیں  
غرضیکہ ہر بچہ اپنی بساط اور عمر کے حساب سے  
اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ آج ”یوم آزادی“  
کا دن تھا۔ 14 اگست اس دن کے لئے ہمارے آباد  
اجداد نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ہمیشہ ہمیں یاد رہیں  
گی۔ ننھے فرہانے اپنی تقریر ختم۔ کی باری باری بچے  
اپنے حصے کے جذبات بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش  
کر رہے تھے۔ محلے کے اس گھر میں جہاں بی امی تنہا  
رہتی تھیں۔ برسوں سے وہ بچوں کو دینی اور دنیاوی  
تعلیم سے روشناس کروا رہی تھیں۔ یکم اگست سے تیرہ  
اگست تک وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ مل کر یوم  
آزادی کا جشن شایان شان طریقے سے منانے کے  
انتظامات کرتی تھیں۔ اس محلے میں متوسط طبقے کے  
لوگ تھے۔ ان کی حیثیت کے مطابق یہ جشن آزادی کا  
پروگرام بہت اچھا ہوتا تھا۔ امی بی کا گھر بہت بڑا  
تھا۔

باقاعدہ ٹینٹ لگایا جاتا تھا۔ امی بی کے ٹرینڈ کئے  
بچے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ سال میں ایک بار  
امی بی دل کھول کر خرچہ کرتیں۔ بچوں کے ساتھ مل کر  
جھنڈیاں بناتیں۔ بیئر بناتیں۔ ننھے بچوں کے لئے بیج  
خود تیار کرتیں اور یہ سب مفت تقسیم کرتیں۔

ایک معصہ تھا کہ بی امی پندرہ اگست کو سارا دن  
دروازہ بند رکھتیں نہ کسی سے ملتیں نہ باہر نکلتیں پھر زندگی  
معمول پر آ جانی..... نعموں، ٹیبلو اور تقاریر میں فرسٹ  
سینئر تھرو اور خصوصی انعامات تقسیم کرتیں۔

بڑوں نے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ  
پندرہ اگست کو آخر امی بی کیوں دنیا سے کٹ کر رہ جاتی  
ہیں۔ مگر اس بار عمیر نے دل میں ٹھان لی کہ وہ اس بار  
بی امی سے ضرور پوچھ کر رہے گا..... وہ اپنے چند  
ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد بی امی کے گھر کی  
طرف چل پڑا۔

وہ دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا مگر نہ دروازہ کھلا نہ  
جواب ملا۔

آخر اس نے غیر اخلاقی حرکت کی اور دروازے  
کی جھری میں سے اندر جھانکا تو بی امی تخت پر ایک  
صندوق لیے بیٹھی تھیں اور صندوق کا تالا کھول کر چند  
تصاویر اور تمنغے نکال نکالتی تھیں۔ وہ کبھی ایک تصویر کو  
آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ کبھی ایک تصویر کو  
چومتی آنکھوں سے لگاتیں تو کبھی دوسری..... اور اسی  
طرح ان تمنغوں کو بھی باری باری چوم کر دوبارہ  
صندوق میں رکھتی جاتیں۔ جب اس کام سے فارغ  
ہوتیں تو جائے نماز بچھا کر مسلسل نفلیں پڑھنے لگتیں۔  
کبھی تھک جاتیں تو قرآن پاک کی تلاوت کرنے  
لگتیں۔ یوں عمیر کو اس جھری میں جھانکتے جھانکتے  
گھنٹوں گزر گئے۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ بی امی کے گھر پہنچ  
گیا۔ بی امی نماز فجر سے فارغ ہو کر باغ میں گئے  
پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔ وہ عمیر کو اپنے سامنے دیکھ  
کر حیران رہ گئیں۔

بی امی اسلام علیکم عمیر نے سلام کیا تو انہوں نے  
شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعائیں  
دے دیں۔

بیٹا آج اتنی جلدی کیسے آگئے انہوں نے عمیر سے  
سوال کیا۔

بی امی میں آج آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔  
اس نے ان کے ہاتھ سے پائپ لے لیا۔

کیا پوچھو گے عمیر..... یہی نا..... کہ کل میں نے تمہاری بار بار دی جانے والی دستک کے باوجود دروازہ کیوں نہیں کھولا..... انہوں نے عمیر کی طرف دیکھا تو وہ چونک گیا بی اماں آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں آیا تھا۔ تمہاری دستک سے..... وہ مسکرائیں..... اچھا تو جب آپ نے میرے آنے کا مقصد جان ہی لیا ہے تو بتا دیجئے کہ آپ نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا اور ہر سال آپ پندرہ اگست کو سارا دن گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتیں کسی کو گھر آنے کی اجازت بھی نہیں دیتیں.....؟

وہ لان میں پڑی اس کرسی پر بیٹھ گیا جو بی اماں کے ساتھ خالی پڑی تھی۔  
تم اس سوال کا جواب سن کر کیا کرو گے؟  
بی اماں میں بھی کوئی ایسا کام کروں گا جس سے آپ کو خوشی ملے۔  
اس نے بڑے یقین سے کہا تو بی اماں نے اسے اپنی کہانی سنا ڈالی۔

میری فیملی میں بھری ماں دو بہنیں چار بھائی ایک باپ اور ایک شوہر تھے۔ بہت ہی اچھے انداز میں زندگی گزر رہی تھی۔ ہم لوگ ہندوستان میں رہتے تھے۔ میرے میاں فوج میں تھے..... ابھی شادی کو صرف پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ اچانک جنگ چھڑ گئی۔ پاکستان بنانے کے لئے آزاد مملکت کے لئے آزاد فضاء میں سانس لینے کے لئے ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگوں ہی نے نہیں بلکہ ہر بچے بوڑھے جوان نے اپنے سرخ لہو کی قربانی دی ہے۔

الگ ملک بنانے کے لئے غلامی کی زنجیروں سے نجات حاصل کرنے کے لئے صرف جان ہی کی نہیں بلکہ مال اور عزت و ناموس کی بھی دھجیاں اڑائی گئیں۔ تب کہیں جا کر آج ہم اس آزاد فضاء میں سانس لے رہے ہیں..... اس جنگ میں میرا سارا

خاندان مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا..... میں زندہ رہ گئی..... اور کس طرح پاکستان پہنچی یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

الختصر بیوگی کے نو ماہ بعد اللہ نے مجھے چاند سا بیٹا عطا کیا فضل الرحمن کی شہادت کے بعد میں نے نو ماہ بعد چھوٹے فضل الرحمن کو اپنی آغوش میں دیکھا میرا بیٹا اپنے باپ کی طرح تھا۔ لگتا تھا جیسے فضل الرحمن شیر خوار بچے کے روپ میں ایک بار پھر مجھے مل گئے ہیں۔

میں نے بڑی مصیبتوں اور کڑے امتحانوں سے گزر کر اپنے بیٹے کی پرورش کی تعلیم و تربیت دلائی میں نے اسے بھی فوجی بنایا میرا فضل الرحمن 71ء کی جنگ میں شہید ہو گیا۔ جب میں نے اپنے بیٹے کو خشک آنکھوں کے ساتھ رخصت کیا تو اس دم مجھے خیال آیا کہ..... وطن کی سلامتی اور بقاء کے لئے اگر دس بھی فضل الرحمن ہوتے تو میں اسی طرح خشک آنکھوں سے انہیں وطن کی مٹی کے سپرد کرتی۔

بیٹا..... میں سارا سال تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہوں لیکن پندرہ اگست کو میں اپنے ان پیاروں کے ساتھ رہتی ہوں جو مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہیں.....

بس میری ایک ہی خواہش سمجھو یادعا کہ تم میں سے ایک بار پھر کوئی فضل الرحمن تیار ہو جائے اور ایک بار پھر اپنے وطن عزیز کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرے۔

بی اماں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے عمیر کی جانب دیکھا اسی لمحے عمیر نے پورے جوش کے ساتھ نعرہ لگایا۔

پاکستان زندہ باد  
پاکستان زندہ باد  
☆.....☆.....☆

## قدیر محبت سے رہائی

سحر ملک

اس کی جاب لگ گئی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ باقی سب گھر والوں سے زیادہ خوش۔ وہ ای کے ساتھ ان کے کمرے کی صفائی کروا رہی تھی۔ جب فیضان نے اشارے سے اسے اوپر چھت پر آنے کو کہا۔ اس نے بہت منع کیا۔ امی کا ڈر بھی دیا۔ لیکن وہ فیضان ہی کیا جو ٹل جائے۔ ناچار امی سے بہانہ کر کے باہر نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ فیضان پر بھڑکتی۔

”ماوی آج میں بہت خوش ہوں۔ کینز جو چاہے مانگ سکتی ہے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر نہایت شاہانہ انداز سے اس نے ماوی کو کینز کہا تو ماوی ہنس پڑی۔

ماوی کو وہ پیار سے ماوی پکارتا تھا۔

”عالم پناہ ایک تو کینز کو اپنی خوشی کی وجہ بتائیے اور دوسرا..... اپنا ساتھ زندگی بھر کے لئے عنایت کر دیں۔“ اس نے آداب بجالاتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

”آج مجھے پہلی Pay ملی ہے اور گستاخ کینز کو اب تنہ نہیں، بلکہ سزا میں سرخ جھکڑیاں پہنائی جائیں گی۔“

فیضان کی بات سمجھتے ہی وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

”جی“..... ”جی“ فیضان نے اس کی ناک پر چٹکی کاٹی۔

”اب وہ دن دور نہیں جب فیضان ایک عدد خوبصورت اور نخرے باز بیوی کے شوہر کہلائیں گے۔“

ماوی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے کار جھڑے۔ اس کے بدلتے تیور دیکھ کر مصنوعی حنکھی سے وہ ہاتھ جھڑوا کر بچہ کی طرف بھاگی۔

فیضان ماوی کے چچا کا بیٹا تھا۔ دونوں کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے گھر والوں نے ماوی کو فیضان سے منسوب کر دیا تھا۔ چونکہ فیضان کی اب جاب لگ گئی تھی لہذا امید کی جا سکتی تھی کہ جلد ہی ماوی، ماوی فیضان بننے والی ہے۔

شام کو سب اکٹھے ہوئے تو اس بات پہ خوشی کے اظہار کے لئے آئس کریم پارلر جانا قرار پایا۔ سب خوش تھے۔

فیضان سب سے نظر بچا کر اسے دیکھتا تو وہ شرما کر نظر چرا جاتی۔ پھر اگلے ہی دن وہ اس کے لئے چوڑیاں لے آئی۔

”ماوی گڑیا پتا ہے یہ چوڑیاں میرے پیار کی جھکڑیاں ہیں، تم نہیں توڑنا انہیں“ سرخ چوڑیاں ہاتھ میں لے کر وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ محبتوں کے خزانے لٹاتی نظریں ماوی کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

میٹھی چاندنی ان پر محبت کا نور بن کر برس رہی تھی۔ تب ہی نیچے بیڑھیوں کے پاس اسے ابو کی آواز سنائی دی۔ اس کے ہاتھ کانپ اٹھے اور کانچ کی نازک چوڑیاں اس کے قدموں میں گر کر اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں۔ ابو شاید دادی کے کمرے میں تھے۔

ماوی کے آنسو رک نہیں رہے تھے۔ فیضان نے سب کھڑے سیٹھنے کی کوشش میں ہاتھ زخمی کر لئے۔ وہ روئے جا رہی تھی۔

”میں اپنی گڑیا کو اور چوڑیاں لا دوں گا“ اس نے پیار سے پکارتے ہوئے کہا تو وہ اور رونے لگی اور پھر فیضان نے نئی چوڑیاں لا کر دینے کے وعدے پر اسے چپ کر دیا۔

کئی دن تک اس کے کانوں میں فیضان کی بات ”یہ چوڑیاں میرے پیار کی جھکڑیاں ہیں، تم نہیں توڑنا انہیں“ گونجتی رہی فیضان نے لاکھ یقین دلایا کہ تمہارا کوئی قصور نہیں لیکن وہ مطمئن نہیں ہو پائی۔

ٹوٹی چوڑیوں کے سرخ ٹکڑے اس نے عملی ڈبیہ میں سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ شادی کی رات فیضان نے اسے وہ ٹکڑے دکھائے تو اس نے سوچا شاید پوری دنیا میں مجھ سے خوش نصیب کوئی نہیں۔ جسے اتنا پیار کرنے والا، من چاہا ساسھی ملا ہے۔

لیکن آج اسے لگ رہا تھا ساری زندگی اس نے ایک بھرم میں گزار دی اور یہ بھرم تو تب سے تھا جب میٹھی مسکراہٹوں اور چور نظروں کا مطلب بھی نہیں پتا تھا۔ اس کی دماغی صلاحیتیں جیسے سلب کر لی گئی تھیں۔ شام کی کڑواہٹ اب اس کی زندگی میں گھٹنے والی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے فیضان کے جنک آمیز رویے کی بار بار یاد آ رہی تھی۔

بہت ہی خوبصورت کپ لایا تھا وہ آفس کولیک نے گفت کئے تھے۔ دو کپ۔ صرف دو کپ، آف وائٹ بیک گراؤنڈ پر سرخ پھول۔ وہ برتن دھو رہی تھی۔ جب آفس سے آکر سیدھا وہ کچن میں چلا آیا۔

”ماویٰ یہ کپ سنیاں لو ذرا“ وہ کپ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اس نے سوچا پہلے صابن والے ہاتھ دھو لو لیکن فیضان نے اس کے دیکھتے ہی کپ والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ماویٰ نے خشک کپڑے سے جلجت میں ہاتھ پونچھا اور کپ پکڑنے کے لئے آگے بڑھی۔

انہی کپ فیضان کے ہاتھ میں ہی تھے کہ فیضان کا موبائل بج اٹھا۔ بے دھیانی کے اس ایک لمحے میں نہ صرف کپ ٹوٹ گئے بلکہ فیضان سے جڑا ہر اچھا گمان کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ساکت تھی اور وہ..... پھٹی پھٹی نظروں سے زمین پر پھرے رنگ برنگے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

”تم پاگل ہو یا اندھی“ اصل میں تم اس لائق ہی نہیں کہ تمہیں کوئی نازک ذمہ داری سونپی جائے۔ اسے اچھی طرح سمجھو اور یہ بتا کر کہ وہ خود کس لائق ہے کچن سے باہر جا چکا تھا۔

اسے لگا جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید فیضان کی محبت کا مجسمہ تھا جو فیضان کے روپے سے شرمندہ ہو کر اپنا آپ مٹا رہا تھا۔ وہ سن ہو کر سنک سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ ٹل سے بننے والے پانی نے اس کے کپڑوں کو بھگو دیا تھا۔ لیکن اسے صرف اور صرف فیضان کے کہے جملوں کی بازگشت سنانی دے رہی تھی۔

کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں ٹل ہو گئیں تو وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ زمین سے ٹکرائے تو چوڑیوں کی کھنک نے اسے چونکا دیا۔ ہاتھ گود میں رکھے کچھ دیر خالی خالی نظروں سے سنہری سبز چوڑیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر جنونی کیفیت میں چوڑیاں ہتھ بٹھک کر اتارنے لگی۔

چند دن پہلے جب وہ اس نے گھر میں شفت ہوئے تھے اس نے گھر میں میلاد کروایا تھا۔ سی گرین ڈریس کے ساتھ یہ چوڑیاں امی اور صبا لائیں تھیں۔ دونوں بازوؤں میں کہنی تک بھری ہوئی چوڑیاں نوج نوج کر وہ دور پھینکنے

لگی۔ اس سعی میں اس کے ہاتھ اور بازو لہلہاں ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بہت توجہ سے شغل فرما رہی تھی۔ جیسے فیضان کو یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ میں نہیں قید تہا رہی محبت میں۔ اک آنسو بھی نہیں روئی۔ پھر نڈھال سی اٹھ کر بستر پر جا گری اس جیسا دکھ کس نے دیکھا تھا۔ سب کچھ پا کر بھی خالی ہاتھ تھی۔ سراب کو منزل سمجھ کر خوش تھی۔

جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا جب وہ گھر لوٹا۔ ماویٰ کو دیکھا تو ڈر گیا کہ کہیں کچھ کر نہ لیا ہو۔ وہ نیند میں تھی یا اپنے خود ساختہ دکھ کے نشے میں، وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا۔ بازوؤں پر خون جما ہوا تھا۔ ابھی وہ ٹھیک سے اٹھی نہیں تھی۔ وہ جا کر بیڈنگ کا سامان لے آیا۔ تب تک وہ واش روم جا چکی تھی۔ واپس آئی تو دھلے ہوئے بازوؤں پر جگہ جگہ لٹ لگے ہوئے تھے۔

”ادھر آؤ میرے پاس“ وہ لینے لگی تھی کہ اس نے پکار لیا۔ وہ چپ چاپ بیڈ کے کونے پر ٹپک گئی۔

”یار مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی کپ ٹوٹنے کی۔ بات شروع کرنے کی غرض سے اس نے صرف اتنا کہا۔ ”سرخ چوڑیوں سے بھی زیادہ“ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن صرف سوچ کر رہ گئی۔ بہت شدت سے وہ فیضان کی محبت میں گرفتار تھی لیکن اب اس نے ایک چپ کو خود پہ طاری کر لیا تھا۔ اور اب صرف چپ رہتا تھا اور پھر وہ پتا نہیں کیا کچھ کہتا رہا۔ اسے کچھ بھی سنا نہیں دیا۔ بس اک خاموشی سی تھی۔

دکھ، آنسو، ملال کچھ نہیں تھا۔ بچپن کے اختتام اور جوانی کے آغاز میں ہونے والی غلطیاں اکثر سنگین ہوتی ہیں اور پوری زندگی پر محیط ہوتی ہیں۔ وہ صحرا کو سمندر سمجھے بیٹھی تھی جبکہ پہلے ہی جھٹکے نے اسے آئینہ دکھا دیا تھا اور اس نے شدت سے خواہش کی ”کاش! مجھے تم نہ ملے ہوتے“ سرخ چوڑیوں کے ٹکڑے اس نے مٹلی ڈبیہ سمیت پھینک دیئے تھے۔ یقیناً صبح کام والی انہیں کچرے میں ڈال دے گی۔ وہ پرسکون تھی کیونکہ آج وہ محبت یا نام نہاد محبت کی قید سے آزاد تھی۔

☆.....☆.....☆

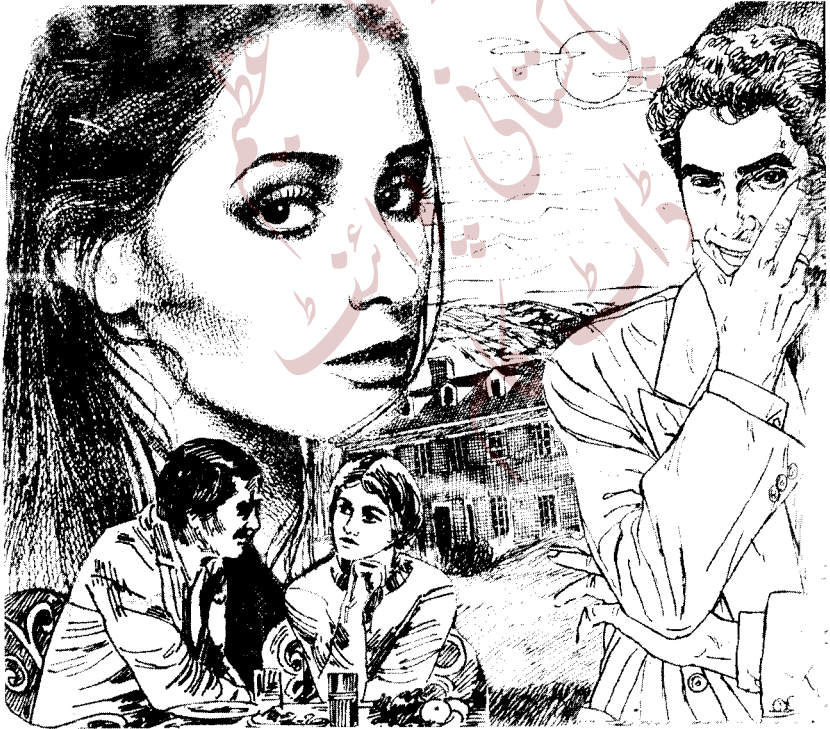


## بھروسہ

صدف راشد

شوخی و چنچل اداؤں کے پردے میں  
دل کا درد چھپا لینا بھی ایک فن ہوتا ہے  
اور اس فن میں وہ بھی بہت ماہر تھی لیکن  
فنکار چاہے جتنا بڑا ہو ایک نہ ایک دن اس کا  
اصل روپ سامنے آ ہی جاتا ہے۔۔۔۔۔

اپنے مقصد کے حصول کیلئے روپ بدلنے والی ایک لڑکی کا افسانہ



اپنی آشفٹہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے  
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا





کر..... لیکن کون تھا جو اسے روکتا..... حویلی کے منتظم اکبر میاں پرانے آدمی تھے۔ وہی دل میں اس خاندان کا درد رکھتے تھے..... لیکن آقا زادے کو صرف سمجھا سکتے تھے..... اسے سرنش نہیں کر سکتے تھے اور پھر شہزاد یوں بھی بہت خود سر تھا..... وہ سب کی بات چٹکیوں میں اڑا دیتا تھا۔

ماں کا دل ٹھنڈا رکھنے کے لئے قدرت نے ذیشان کو انتہائی نیک فطرت بخشی تھی۔ وہ اپنے جڑواں بھائی کا الٹ تھا۔ نیک فطرت خاموش طبع، ذہین اور محنتی، تعلیم میں بھی وہ شہزادے آگے تھا اور تعلیم کے اختتام کے بعد بھی اس کے جوہر نمایاں تھے۔ چنانچہ یہ وہی تھا جس نے کمپاس کے کارخانے کی بنیاد رکھی تھی، اور اب وہ کارخانہ خوب چل رہا تھا.....

ذیشان جمہوریت کے اس دور میں باپ دادا کی عزت برقرار رکھنے کے لئے کوشاں تھا۔ وہ وقت کی ضرورت کو پوری کرتے ہوئے اپنے خاندان کو نمایاں رکھنے کی فکر میں لگا ہوا تھا اور شہزاد جیسے تہیہ کر چکا تھا کہ خاندان کی عزت کو مٹی میں ملا کر دم لے گا۔ دن رات آوارہ گردی ہوتی۔ دوستوں کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھے آباد ہوتے..... جوئے خانوں میں اس کے نام کا طوطی بولتا۔ سینکڑوں مفت خورے اس کے پیسے سے پل رہے تھے۔ ہر وقت اسے گھیرے رہتے، کوٹھی کا ایک حصہ اس کے لئے مخصوص تھا جہاں آوارہ گردوں کی محفل جی رہتی اور شوکت جہاں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں۔ انہیں بہت سے دھڑ کے لگے رہتے۔

کبھی دونوں بھائیوں میں ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ ذیشان تو بہت ہی نرم اور ٹھنڈا انسان تھا، لیکن شہزاد..... اس سے تو ہر وقت خطرہ تھا۔ نہ جانے کب اکھڑ جائے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ دونوں بھائیوں میں آج تک کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ذیشان نے کبھی شہزاد کی ضرورتیں پوری کرنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ گو سارے اخراجات شوکت جہاں کے

سلطانہ شوکت جہاں کبھی سلطانہ تھیں۔ اب تو ریاستیں ختم ہو گئی تھیں صرف وظیفے کی حد تک سلطانہ باقی رہ گئی تھیں۔ تاہم باقی لاکھ لے کر بھی سوا لاکھ کا۔ عایشاں حویلی کی وہی آن بان تھی۔ لنگر خانے میں اسی طرح بھیڑ بھاڑ رہتی تھی اور ضرورت مند ضرورتیں پوری کر کے ہی جاتے تھے۔ یہ سب کچھ کہاں سے آتا تھا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ مشہور تھا کہ ریاست چھین جانے کے بعد بھی عالم پور کی حویلی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سلطانہ شوکت جہاں کے پاس ان کا آبائی خزانہ موجود ہے جسے ان کی پشت در پشت خرچ کریں تب بھی ختم نہ ہو، اور یہ سب کچھ سچ ہی معلوم ہوتا تھا ورنہ اتنے ٹھوڑے سے وظیفے میں یہ عیش و عشرت کہاں.....؟

نواب عالم سلطان اسی وقت انتقال کر گئے تھے جب حکومت نے ریاست تحویل میں لینے کا اعلان کیا تھا۔ دو بیٹے چھوڑے تھے جو ماں کی زیر نگرانی پروان چڑھے تھے۔ شوکت جہاں کی گود ایک ہی بار ہری ہوئی تھی، لیکن قدرت نے ایک دفعہ میں ہی دو بیٹے دے دیئے تھے اور انہیں دوسری دفعہ کی جھنجھٹ سے نجات مل گئی تھی۔ بس اس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی جبکہ نواب سلطان عالم اور شوکت جہاں، دونوں کو ہی مزید اولاد کی خواہش تھی۔ نواب سلطان کی موت کے بعد شوکت جہاں نے شکر ہی کیا تھا کہ ان کے ہاں اور اولاد نہیں ہوئی۔ دو بیٹوں کی ذمہ داری ہی بھاری پڑ گئی تھی اور ان کی پرورش میں انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں باصلاحیت نہیں ہیں۔ بچوں کی صحیح پرورش ایک مشکل کام ہے اور اس کا عملی ثبوت موجود تھا.....!

عالی شان حویلی میں عیش و عشرت میں پرورش پانے والے دونوں ہم عمر لڑکوں کی فطرت میں بے پناہ تضاد تھا۔ شہزاد عالم تند خو اور اوباش فطرت کا مالک تھا اس کی صحبت اچھی نہیں آئی۔ عالم پور کے اوباش اس کے گرد جمع رہتے تھے۔ کسی کو بچ ذات نہیں کہا جاسکتا تھا۔ شوکت جہاں کا جی خون ہوتا تھا شہزاد کی حالت دیکھ

لگے گی۔“

”سب پھر دن میں ایک بار..... کسی بھی وقت.....“  
 ”ہاں یہ ٹھیک ہے.....“ شہزاد نے کہا تھا اور چند روز اس کی پابندی ہوئی اور اس کے بعد پھر وہی دلیل و نہار اس کے علاوہ نیکیوں کی تلقین، مصروفیات پر باز پرس بھی ہوتی تھی۔ اس لئے شہزاد ماں کے سامنے جاتے ہوئے کتراتا تھا۔

”کیا بات ہے شہزاد.....؟“ شوکت جہاں کی آواز ابھری۔

”بس سلام کرنے حاضر ہو گیا تھا امی۔ شہزاد نے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ ماں نے کڑی نظروں سے اس کے ہاتھ میں دے ہوئے پیکٹ کو دیکھا۔ لیکن شہزاد نے اطمینان سے سگریٹ ہونٹوں میں ڈالی اور پھر اسے ایک خوبصورت لائٹر سے سلا کر دھواں اگل دیا۔

”ماشاء اللہ! سگریٹ پینے کی تمہیں خاصی مشق ہو گئی ہے۔ شوکت جہاں نے طنزیہ انداز میں کہا۔  
 ”میں تو دھویں کے دائرے بھی بنا سکتا ہوں امی۔ یہ دیکھئے۔“ شہزاد نے ہونٹ گول کر کے سفید سفید دائرے فضاء میں بنانے شروع کر دیئے..... ڈیشان مسکرا دیا تھا۔

”اللہ تعالیٰ اور ترقی دے۔“ شوکت جہاں جھنجھلا کر بولیں۔

”آمین..... آمین.....“ شہزاد نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”ویسے کیا مصروفیت ہے.....؟“

”تمہیں ان باتوں سے کیا دلچسپی؟“ شوکت جہاں بولیں۔

”بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا ویسے ایک کام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔“

”یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔“ شوکت جہاں بدستور طنزیہ انداز میں بولیں۔

یقیناً یقیناً..... مجھے آپ کی ذہانت پر فخر ہے امی.....

ہاتھ ہی میں رہتے تھے اور کبھی کبھی وہ شہزاد سے تکرار بھی کر لیتی تھیں۔ لیکن ڈیشان کے خلاف شہزاد کے دل میں کبھی رجحش نہیں ہوئی تھی۔ اور شوکت جہاں ہمیشہ خدا سے یہی دعا کرتی تھیں کہ ایسا نہ ہو.....!

آج بھی شوکت جہاں اور ڈیشان کسی مسئلے پر سر جوڑے بیٹھے تھے کہ شہزاد اندر داخل ہوا۔ خوبصورت جدید تراش کے لباس میں وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ پیشانی پر جھونکے والے خشک سیاہ بال گھٹاؤں کی طرح سجے ہوئے تھے لیکن آنکھوں کی تیز چمک اس کے پورے چہرے کی معصومیت سے ہم آہنگ نہیں تھی۔

”خادم..... کورنش بجالاتا ہے.....“ اس نے جھک کر فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

”آئیے بھیا.....“ ڈیشان نے مسکرا کر کہا۔ شوکت جہاں البتہ سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔ شہزاد کی آمد بے مقصد نہیں ہوتی تھی۔ ہفتوں وہ اندر نہیں آتا تھا۔ ہفتوں شوکت جہاں اس کی شکل نہیں دیکھ پاتی تھیں۔ حالانکہ یہ دونوں ہی ان کی آنکھوں کے تارے تھے۔ انہی سے ان کی بینائی قائم تھی۔ وہ صبح اٹھ کر ان دونوں کی شکل ہی دیکھنا چاہتی تھیں، لیکن شہزاد نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ماں کو سلام کرنے بھی نہیں آتا تھا..... ڈیشان نے آج تک اس سے کسی معاملے میں کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس معاملے میں اس نے زبان کھولی تھی۔

”بھیا اگر برانہ مائیں تو ایک بات کہوں.....؟“

”کہہ دو یار..... تمہاری بات کا برا کون کا فرمانے گا۔“

”میری خواہش ہے کہ آپ دن بھر خواہ امی سے نہ ملیں لیکن صبح کو ان کی خدمت میں حاضری ضرور دیا کریں..... ماں کی دعا ہر آفت نالتی ہے اور پھر یہ امی کی خواہش بھی ہے۔“

”یار..... بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اپن کو دیر سے اٹھنے کی عادت ہے۔ اگر یہ صبح کی حاضری کا چکر چل گیا تو پھر دیر سے اٹھنے پر بھی باز پرس ہونے

”شہزاد بھیا..... کیوں امی کو تنگ کر رہے ہیں۔“  
ذیشان مسکراتے ہوئے بول پڑا۔

”ارے توبہ..... توبہ..... اے لڑکے کیا جہنمی بننا ہے..... ماں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے۔ امی ذرا پاؤں ہٹائیے۔“ شہزاد جھک کر بولا۔

”نہیں بیٹے..... مجھ جیسی ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت نہیں ہوتی جنت ان ماؤں کے قدموں تلے ہوتی ہے جو نیک بیٹے جنم دیتی ہیں۔ شوکت جہاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ارے تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے امی جان۔ کیا آپ نے جان بوجھ کر مجھ جیسے بد فطرت کو جنم دیا تھا۔ بس غلطی ہو گئی، اور پھر میری کسر میرے بھائی نے

پوری کر دی ہے..... آدھی جنت تو ضرور ہوگی آپ کے قدموں کے نیچے، ذرا دیکھوں.....؟“  
”ہوگی بھی تو تجھے نظر نہیں آئے گی۔“ شوکت

جہاں جھلا کر بولیں۔

”اونہہ..... آپ اس کی فکر نہ کریں امی۔ میری بینائی بہت اچھی ہے۔“ شہزاد نے کہا اور پھر بولا۔

”یار امی جان..... دراصل آپ کے بھروسے پر ہی تو گناہ کر لیتے ہیں۔ جنت تو ماں کی طرف سے مل ہی جائے گی۔ بس ذرا آپ نے پاؤں ہٹائے اور اپن غراپ سے اندر..... ٹشو.....“ شہزاد نے منہ سے آواز نکال کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”امی..... بھیا آپ کو یونہی پریشان کرتے رہیں گے۔ آپ ان سے پوچھ کیوں نہیں کہیں کہ وہ کس کام سے آئے ہیں۔“

”ہاں..... سیدھی سی بات ہے۔“ شہزاد نے دونوں شانے ہلائے۔

”پہلے اسے حق فرزندگی تو ادا کر لینے دو بیٹے..... ورنہ وہ کہے گا ماں نے اسے اس کا حق نہیں دیا۔“ شوکت جہاں بولیں۔

”اہو ہو..... ای شاید سیر لیس ہو گئیں..... اہو میری پیاری امی۔ بس ایک معمولی سی ضرورت آپڑی

ہے۔ صرف ایک ہفتے کی اجازت اور دس ہزار روپے..... دراصل.....“

”شہزاد..... شوکت جہاں تیز ہو کر بولیں۔

”پلیز..... پوری بات سن لیں..... دراصل میرے

ایک بہت گہرے دوست کی بہن کی شادی ہے۔ غریب انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ تھا۔ مجھ سے نہ دیکھا گیا اور میں نے کہا۔ زندگی اس طرح کھو دینے کی چیز نہیں۔ غفورے، تو تنہا نہیں ہے۔ میں بھی اس کا خیر میں حصہ لوں گا، خودکشی کریں گے تو دونوں ساتھ ساتھ کریں گے، اس سے قبل مجھے ایک کوشش کر لینے دے۔

میں اپنی نیک دل امی کے ضمیر کو جھنجھوڑوں گا، للہ..... للہ..... یہ تین زندگیوں کا سوال ہے۔ غفورے کی بہن حسینہ، جس کی شادی نہ ہو سکی تو وہ غیرت اور بے بسی کے احساس سے مر جائے گی۔ کڑیل جوان غفورا، جو اپنا فرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے خودکشی کر لے گا اور اس کا دوست، اس کا جگری یار شہزاد، جو اس کو تنہا نہ مرنے دے گا۔ بچا لیجئے ان تین زندگیوں کو..... اللہ بھلا کرے گا۔“

”بری عادتیں انسان کی غیرت بھی نگل لیتی ہیں..... کسی کی بہن کی شادی کی فرضی کہانی سنا کر تم مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو..... مجھے تمہاری ذہنیت پر بہت افسوس ہے شہزاد۔“

”اوہ..... داؤد خالی گیا استاد.....“ شہزاد ایک آنکھ دبا کر بولا، اور پھر جلدی سے کہنے لگا۔“ آپ نے درست کہا امی..... درحقیقت بہنیں سب کی یکساں ہوتی ہیں..... بات یہ ہے امی جان کہ میرے دوست شرفو کے باپ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے..... آہ..... غریب بوڑھا قدرت کی نعمت سے محروم ہو گیا..... اب وہ زندگی بھر بے سہارے کے سہارے چلے گا۔ لیکن امی..... میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے معذور نہ ہونے دوں گا، میں یورپ سے اس کے لئے مصنوعی ٹانگ.....“

”شہزاد..... تم باز نہیں آؤ گے.....؟“ شوکت

جہاں زوج ہو کر بولیں۔

”امی..... دیدیں نادس ہزار..... اس بار تو بھیا نے بہت دن کے بعد مانگے ہیں.....“ ذیشان ہنستے ہوئے بولا۔

”ہرگز نہیں..... میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتی۔“ امی فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

”ہائے اتنی سنگ دل نہ بنیں امی..... آپ کا بیٹا پچیس گلاس پانی پی کر خودکشی کر لے گا، اور مرنے کے بعد اس کے ہر موئے تن سے آواز نکلے گی۔ صرف دس ہزار کا سوال ہے بابا..... ہے کوئی سخی داتا..... صرف دس ہزار.....“

”نہیں دوں گی۔ خدا کی قسم نہیں دوں گی۔ میں تمہاری حرکتوں سے عاجز آ گئی ہوں.....“

”ارے واقعی آپ سیریس ہیں امی.....“ شہزاد حیرت سے بولا۔

”ہاں..... میں قسم کھا چکی ہوں۔“

”مگر میری عزت خطرے میں پڑ جائے گی امی..... میں دوستوں سے وعدہ کر چکا ہوں.....“ شہزاد بھی کسی قدر سنجیدہ ہو کر بولا۔

”تمہاری کوئی عزت ہے؟ اور تمہارے دوستوں میں سے کوئی عزت کا مفہوم جانتا ہے.....؟“

”ہاں امی..... ہم سب جانتے ہیں..... آپ نے ہمیں بہت حقیر سمجھ لیا ہے۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ شہزاد نے افسردگی سے کہا۔

”امی پلیز..... دیدیں بھیا کو پیسے..... نہ جانے کیا ضرورت ہو؟“

”میں کہتی ہوں تم مداخلت نہ کرو.....! میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گی سمجھے شہزاد.....“

”بہت بہتر امی.....“ شہزاد نے آہستہ سے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ ذیشان کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آرہے تھے۔ چند منٹ دونوں ماں بیٹے خاموش رہے۔ پھر شوکت جہاں نے کہا۔

”چھوڑو..... تم کس چکر میں الجھ گئے..... ہاں تو

پھر کیا فیصلہ کیا؟“

”فیصلہ تو آپ کریں گی امی..... میں کیا عرض کروں.....“

”اس نے کچھ سمجھ کر ہی ہمیں لکھا ہو گا ذیشان بیٹے..... یوں بھی خدا اور رسول کا حکم ہے کہ کسی بے سہارا کی مدد کرو.....“

”یقیناً امی.....“

”تب پھر میری رائے ہے کہ اسے فوراً بلوایا جائے۔ تم اسے ٹرین کا ٹکٹ منگوا کر بھیج دو۔ ملازم یہاں اسے اتار لیں گے۔“

”جو حکم.....“

”بس ایک الجھن ہے جو بار بار ذہن سے ٹکرائی ہے۔“ شوکت جہاں پر خیال انداز میں بولیں۔

”وہ کیا امی.....؟“

”میں بتا چکی ہوں نفیس احمد سے ہماری کوئی خاص رشتہ داری نہیں ہے یوں سمجھو..... میری بڑی بہن حشمت جہاں مرحومہ کی نند کے سسرال سے ان کا تعلق تھا نہ جانے حشمت جہاں کی نند کے شوہر کے کیا لگتے تھے۔ ایک آدھ بار کسی تقریب میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ معمولی سا گھرانہ تھا۔ بچی نہ جانے کتنی بڑی ہوگی۔ پرانی عزت کو گھر میں لا کر اس کی حفاظت بھی تو کرنا ہوگی۔“

”کیوں امی..... اسے یہاں کیا خطرہ ہے؟“

”اگر جوان لڑکی ہوئی تو.....“

”تو کیا ہے..... کیا اس گھر میں کوئی جوان لڑکی نہیں رہ سکتی۔ ملازموں کی کئی لڑکیاں جوان ہیں۔“

”اوہ..... ملازموں کی بات اور ہے..... وہ ملازموں کی طرح تو یہاں نہیں رہے گی۔ رشتے داری کیسی بھی سہی۔ بہر حال رشتے داری ہے۔ ہم اس کی مجبوری سے فائدہ تو نہیں اٹھائیں گے.....“

”ہاں..... یہ تو درست ہے لیکن.....“

”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں بیٹے..... شہزاد اور اس کے لفتے دوستوں سے مجھے خطرہ ہے۔“

”نہیں کام چلے گا میری جان..... پورے کر دو..... کہیں سے پورے کر دو۔“  
 ”آپ کو معلوم ہے بھیا..... میں امی کو پیسے کا حساب دیتا ہوں۔“

”غلطی کرتے ہو۔ خیر آگے بڑھو۔“  
 ”بس آپ کے لئے کچھ بے ایمانی کر لیتا ہوں۔“

جس پر بہر حال ضمیر ملامت کرتا ہے۔  
 ”یار میرے لئے کچھ کرتے ہو ضمیر ملامت کرتا ہے۔ میرے لئے، یعنی شہزاد کے لئے۔“ شہزاد نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”بے ایمانی بہر حال بے ایمانی ہے۔“  
 ”خیر چھوڑو ان باتوں کو یار، کبھی کسی قابل ہوئے تو تمہارے احسانات کا بدلہ چکا دیں گے۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ چار ہزار کا گھپلا کہاں سے کر دو گے؟“  
 ”کوئی چارہ نہیں ہے بھیا..... چھ سے کام چلائیں۔“

”نہیں چلے گا پیارے بھائی..... خدا کے لئے کچھ کرو..... اچھا یوں کرو..... ایمانداری سے بتاؤ یہ چھ ہزار کتنے دن میں مارے.....؟“  
 ”چار ماہ میں.....“

”تو پھر دو ماہ کا ایڈوانس مار لو..... وعدہ کرتا ہوں آئندہ تین ماہ تک تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔“  
 ”ہوں..... ٹھیک ہے بھیا..... اللہ تعالیٰ معاف کرے۔“

”ارے ضرورت مندوں کی مدد کرنا تو ثواب ہے۔ نہ جانے تم کیوں نہیں سوچتے..... بس جلدی کرو..... چیک دو گے یا کیش.....؟“

”چیک بنا دیتا ہوں.....“ ڈیشان نے کہا اور شہزاد نے دوڑ کر اسے گلے لگا لیا۔ ڈیشان مسکرانے لگا تھا۔ پھر اس نے دس ہزار کا چیک لکھ کر شہزاد کے حوالے کر دیا۔ اور شہزاد اچھلتا ہوا باہر نکل گیا۔

ڈیشان نے ایک گہری سانس لی اور مسکرانے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے سے پرچہ

”بھیا کے دوست تو کبھی کے الگ تھلگ جھے تک محدود رہتے ہیں۔ آج تک کسی نے اس طرف آنے کی جرأت نہیں کی..... اور رہ گئے بھیا..... تو امی..... بہر حال وہ ابھی اتنے نہیں گرے۔“

”خدا کرے وہ اس سے زیادہ نہ گرے۔“ شوکت جہاں تشویش سے بولیں۔

”آپ بے فکر رہیں امی..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اور شوکت جہاں گردن ہلانے لگیں۔ ”تو میں اکبر چچا سے کہہ دوں۔“ ڈیشان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کہہ دو.....“ شوکت جہاں نے پر خیال انداز میں کہا..... اور ڈیشان اٹھ کھڑا ہوا۔

”لایئے..... یہ خط مجھے دیدیں۔ میں اکبر چچا کو پتہ سمجھا دوں گا؟ ڈیشان نے کہا اور شوکت جہاں نے سفید رنگ کا لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔ ڈیشان لفافہ لے کر چل پڑا۔ اس نے خط جیب میں رکھا اور تیزی سے شہزاد کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

شہزاد اپنے کمرے میں کھڑکی کے نزدیک کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر وہی شری مسکراہٹ چیل گئی۔

”اتنی دیر لگا دی یار..... دل دھڑکنے لگا تھا۔“ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”معافی چاہتا ہوں بھیا..... دیر ہو گئی۔“ ڈیشان نے کہا۔

”جلدی سے بتاؤ..... کیا پوزیشن ہے؟“ شہزاد نے بے چینی سے کہا۔

”امی جان آمادہ نہیں ہیں۔“  
 ”کھ.....؟ آگے بولو..... آگے بولو.....“

”آپ کے لئے بے ایمانی کرنی پڑے گی۔ امی سے.....“ ڈیشان مسکراتے ہوئے بولا۔

”جیتے رہو..... کسی کے لئے کچھ کرو گے تو خوش رہو گے۔ ہاں آگے بڑھو..... آگے بڑھو۔“

”صرف چھ ہزار ہیں میرے پاس۔“ ڈیشان نے کہا۔

نکال لیا اور اسے پڑھنے لگا۔  
 ”بیگم سلطانہ شوکت جہاں..... آداب!“  
 اس نے خط کا پتہ انہیں نوٹ کرایا اور ضروری ہدایات دینے لگا۔

☆.....☆.....☆

شہزاد ایک ہفتے کے لئے کہہ کر گیا تھا۔ لیکن آج تک اس نے کونسے وعدے کی پابندی کی تھی۔ یہ ایک ہفتہ ایک ماہ بھی بن سکتا تھا۔ کہاں گیا ہے یہ اس نے نہیں بتایا تھا اور پوچھنے کے لئے منع بھی کر دیا تھا۔ بہر حال اس کے خط کہیں نہ کہیں سے ضرور آ جاتے تھے۔ اس بار بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کب تک واپس آئے گا۔

ذیشان اپنے معمولات میں مصروف تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کپاس کے کارخانے کو خوب ترقی دینے کے بعد کاغذ کا کارخانہ بھی قائم کرے عالم پور میں اس کے روشن امکانات تھے کیونکہ یہاں کے دلدلی علاقوں میں کاغذ بنانے کا خام مال دستیاب ہو سکتا تھا۔ اس نے اس کے لئے ضروری کارروائی شروع کر دی تھی۔ اسی سلسلے میں اسے دو دن کے لئے باہر جانا پڑا۔ تیسرے دن وہ واپس آیا تو سیدھا شوکت جہاں کے کمرے کی طرف چل پڑا اور حسب عادت بے بھجک اندر داخل ہو گیا۔

شوکت جہاں دوپہر کو سونے کی عادی تھیں اور یہ دوپہر ہی کا وقت تھا وہ اپنی مسہری پر ریشمی چادر اوڑھے سو رہی تھیں۔ گرمی ہو یا سردی، چادر سے منہ ڈھک کر سونا ان کی عادت تھی۔

ذیشان مسکراتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ امی چت سو رہی تھیں۔ ذیشان کی عادت تھی کہ اگر کبھی سوتے میں انہیں جگانا ہوتا تو خاموشی سے ان کے سینے پر سر رکھ کر ان سے لپٹ جاتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ چند لمحات انہیں دیکھتا رہا..... اور پھر کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور سیدھا امی کے سینے سے جا لپٹا۔ اس نے پورے بدن کا وزن ان پر ڈال دیا تھا۔

لیکن..... ان کے سینے پر گال رکھتے ہی اسے ایک احساس ہوا..... ایک انوکھا احساس..... ماں کے نرم

کسی رشتے کا کیا ذکر کروں، اس کے تار تو بہت کمزور ہیں۔ اتنے کمزور کہ نظر بھی نہیں آتے۔ ہاں انسانیت کا رشتہ ہمت دلا رہا ہے اور یہاں یہ تاثر بھی ذہن میں آیا ہے کہ

پھر کسی غیر سے کیوں شکوہ بیداد کروں  
 شاید نفیس احمد آپ کے ذہن میں ہوں۔ نہ ہوں تو میں یاد دلا دوں۔ میں آپ کی بڑی بہن کی نند کے سسرال سے تعلق رکھتی ہوں۔ شاید رحیم آباد کے زلزلے کے بارے میں آپ کو معلوم ہو۔ ہمارا سارا خاندان تباہ ہو گیا تھا۔ میں بد نصیب جب ہوش میں آئی تو ہسپتال میں تھی۔ نہ جانے زندگی کیوں باقی رہ گئی تھی۔ ہسپتال سے باہر آ کر دیکھا تو چاروں طرف خاک اڑ رہی تھی۔ کوئی نشین نہیں تھا۔ کوئی آشنا نہیں تھا فقط یادیں تھیں اور میں۔ زندگی ایک ویران صحرا تھی۔ موت کی آرزو مند ہوئی لیکن خودکشی کی جرات نہیں کر سکی۔ بھگتی رہی۔ بے سہارا پھرتی رہی۔ حادثے ہوئے۔ زندگی عزت دونوں پیاری تھیں۔ بھوک مرنی رہی۔ ایک عارضی پناہ مل گئی۔ لیکن وہ بھی میری طرح فلاح لوگ ہیں۔ ان پر بار نہیں بن سکتی۔ بنی رہی تو ایک دن دھتکار دیں گے۔ اپنوں کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو کوئی نظر نہیں آیا۔ تب آپ یاد آئیں۔ مجھے سہارا چاہیے۔ آپ اس قابل ہیں۔ میری عزت کی حفاظت کی ذمہ داری میں مجھے روٹی دیں اور کپڑا دے دیں۔ ساری زندگی جو خدمت لیں گی انجام دوں گی!

بد نصیب عشرت نفیس  
 ذیشان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بے چاری واقعی مصیبت زدہ ہے۔ تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہے۔ خط سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہی لکھا ہے اس نے۔ انسانیت کا رشتہ سارے رشتوں سے عظیم ہے۔“ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اکبر چچا کے کمرے میں پہنچ کر



”اوہ..... آپ سلطانہ شوکت جہاں کے صاحبزادے ہیں.....؟“

”جی ہاں..... اور آپ.....؟“

”میں آپ کے نگروں پر پلے آئی ہوں.....“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

”خاتون عشرت.....؟“

”جی.....“

”میرا نام ذیشان ہے۔“

”آپ کا تعارف ہو چکا ہے۔“

”خوب..... آپ بے حد شائستہ خاتون ہیں۔“

لیکن آپ کی ایک بات مجھے پسند نہیں آئی.....“

”کیا.....؟“

”آپ کے جملے..... آپ نے کہا تھا کہ آپ

ہمارے نگروں پر پلے آئی ہیں.....“

”غلط تو نہیں کہا تھا میں نے.....“

”یہاں کوئی اتنا کم ظرف نہیں ہے کہ اس انداز

میں سوچے۔ غیر بھی ایک دن اپنے ہو جاتے ہیں۔

آپ نے ہمیں اسی لئے یاد کیا تھا کہ ہم آپ کو اپنے نظر

آئے تھے۔ کیا آپ اس اپنائیت کو دل سے قبول نہیں

کرتیں.....؟“

”خدا کرے..... خدا کرے آپ سب فرشتے ہی

ہوں۔ یوں سمجھ لیں ذیشان صاحب..... درندوں کی بستی

سے نکل کر آئی ہوں..... اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ ذہن

و دل زخموں سے چور ہیں..... اگر کوئی زخم چیخ اٹھے تو

مجبور سمجھ کر معاف کر دیں.....“ اس کی آواز آنسوؤں

میں ڈوب گئی۔

”اس گھر کو اپنا ہی سمجھیں..... آپ یہاں رہنے

والوں کو برا نہیں پائیں گی۔“ ذیشان نے کہا اور پھر

بولاً۔ ”امی جان کوئے کمرے میں ہیں؟“

”مجھے معلوم نہیں..... میں سو گئی تھی۔“

”میں تلاش کئے لیتا ہوں۔“ وہ دروازے کی

طرف بڑھ گیا اور پھر اس نے دروازے پر رک کر جھپنی

ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

سینے کا لمس اس کے روئیں، روئیں کو یاد تھا۔ لیکن یہ سینہ..... یہ بدن..... یہ گداز..... یہ تو اجنبی تھا..... یہ تو بالکل اجنبی تھا۔

اور سونے والا ہڑ بڑا کراٹھ گیا..... اس نے چہرے سے چادر پلٹی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی.....!

اور یہ چیخ کسی زبردست ہتھوڑے کی طرح ذیشان

کے سر پر پڑی وہ اس قدر بوکھلایا..... کہ اچھل کر مسہری

سے نیچے آ کر.....! اور سوتی ہوئی قیامت کھڑی ہو گئی۔

ذیشان کسی زخمی پرندے کی مانند سہا سہا زمین پر پڑا

تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار کھل اور بند ہو رہی تھیں۔ اس

کی سوچنے بجھنے کی قوت ختم ہو گئی تھی۔ گہرائی ہوئی لڑکی

بھی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی حسین

آنکھوں سے خیر ٹپک رہا تھا۔ اس کا خوبصورت دہانہ

تعجب سے کھلا ہوا تھا۔ پھر اسے صورتحال کا احساس ہوا۔

وہ سنبھلی اور بے ساختہ اس نے آگے بڑھ کر ذیشان کو

ہاتھ کا سہارا پیش کیا۔ ذیشان کی کیفیت تو عجیب ہو رہی

تھی۔ وہ اس سہارے کو کیا قبول کرتا۔

”اب اٹھیے بھی.....“ ایک شیریں آواز اس کے

کانوں سے ٹکرائی۔ اور اسے اپنے کمرے ہونے کا

احساس ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”وہ..... وہ..... دیکھئے..... دیکھئے.....“ اس نے

بھلائے ہوئے لہجے میں کہنا چاہا۔

”کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے..... مجھے

اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔“

اس نے نرم مسکراہٹ سے کہا اور ذیشان اس کی شکل

دیکھتا رہ گیا۔

”آپ ناراض تو نہیں ہوئیں.....؟“

”آپ نے دانستہ تو..... کوئی بات نہیں کی.....

مجھے علم ہے کہ میں چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ آپ کے

سمجھتے تھے؟“

”امی جان کو..... خدا کی قسم امی جان کو.....“

ذیشان نے ہکھکھاتے ہوئے کہا۔



ہوئیں۔

”آگئے ذیشان.....“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ پیشانی چومی اور سینے سے لگا لیا۔ اور پھر بٹھاتے ہوئے اس سے اس کے کام کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ ذیشان نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ نہ جانے عشرت کہاں گئی..... وہ سوچ رہا تھا، لیکن اس نے چہرے سے ذرا بھی اظہار نہیں ہونے دیا۔ اور پھر چند منٹ کے بعد ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر عشرت اندر آ گئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور ان سے پانی کے ننھے ننھے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تھوڑی دیر قبل ذیشان نے خوابیدہ چہرہ مخمور آنکھیں دیکھی تھیں اور ان کی بے پناہ کشش کا قائل ہو گیا تھا۔ اب اس نے ایک دھلا دھلا، نکھر نکھرا چہرہ دیکھا، جس کی کشش اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئی.....!

”ارے آؤ..... آؤ..... عشرت..... ذیشان یہ عشرت ہیں۔ پہچان گئے؟“  
 ”آداب.....“ ذیشان نے کھڑے ہو کر کہا۔  
 ”آداب.....“ عشرت نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔

”بڑی پیاری بچی ہے..... میں تمہیں کیا بتاؤں اس کے آنے سے میرا دل کیسا خوش ہو گیا ہے۔ مگر یہ دیوانی ابھی تک کھل کر نہیں ہنسی..... میں اس کی ہنسی دیکھنے کی خواہشمند ہوں۔“

”ابھی دیر لگے گی امی۔ دنیا کے دیئے ہوئے زخم خشک ہوں گے۔ کھرٹ بنیں گے اور پھر صاف ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے اس وقت تک ان سے شکوہ نہ کیا جائے۔“

”میرا بس چلے تو میں اس کے دل کے سارے داغ ایک ساتھ دھو دوں، نہ جانے یہ زخم لگانے والے کیسے ہوتے ہیں۔ دل نہیں دکھتا ان کا۔“ شوکت جہاں نے ہمدردی سے کہا۔ عشرت اپنی جگہ کھڑی تھی۔ ”ارے تم کھڑی کیوں ہو بس اب تکلف ترک کر دو..... میں

”دیکھئے..... سینے.....“

”جی.....؟“ اس نے آہستہ سے کہا..... اور غم پلکیں اٹھا کر ذیشان کی طرف دیکھا۔

”اس واقعے کا آپ..... امی سے تذکرہ نہ کریں۔“

”نہیں کروں گی۔“ اس نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔

”بہت بہت شکریہ..... میں آپ سے اجنبیت کا اظہار کروں گا۔“

”بہتر.....“ وہ آہستہ سے بولی اور وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس سے جدا ہونے کے بعد اس پر گزرے ہوئے لمحات کا احساس طاری ہو گیا اور اس کا بدن کا پٹنے لگا۔ وہ گدازلس، وہ سنسنی خیز لمحات، اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ اور پھر عشرت کی فراخ دلی کیسی حقیقت پسند ہے وہ..... اس نے ذرا بھی تو شبہ نہیں کیا اس کی نیت پر.....!

”خدا کی پناہ.....“ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنی حالت درست کرنے کے بعد ہی وہ امی کے سامنے جا سکتا تھا۔ اور حالت درست کرنے میں اسے کئی منٹ لگ گئے۔ جب اس کے اعصاب پرسکون ہو گئے تو وہ اسی طرح باہر نکل آیا۔ ایک ملازم کو اشارہ کر کے اس نے شوکت جہاں کے بارے میں پوچھا۔  
 ”ابھی ابھی اپنے کمرے میں گئی ہیں سرکار۔“

ملازم نے بتایا۔  
 ”مر گئے.....“ ذیشان نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب پھر اس کے سامنے جانا پڑے گا۔ امی سے ملاقات اسی کے سامنے ہوگی۔ کہیں گڑبڑ نہ جائے۔“ بہر حال جانا تو تھا ہی۔

وہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوا امی کے کمرے کی طرف چل دیا اور پھر ہمت کر کے اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن کمرے میں صرف امی تھیں۔ ”ہیلو..... امی جان اسلام علیکم۔“ اس نے کہا اور امی خوش

کہہ چکی ہوں بیٹی..... کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے اور اب خدا نے یہ حسرت بھی پوری کر دی..... اگر ہو سکے تو میری یہ بات دل سے قبول کر لو.....!“

”خالہ جان..... میں..... میں..... کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”خالہ جان نہیں..... ذیشان کی طرح تم بھی مجھے اسی جان ہی کہا کرو۔“

”جی..... بہتر.....“

”بیٹے ذیشان تم آگئے ہو۔ عشرت کے لئے کپڑوں وغیرہ کا بندوبست کرنا ہے۔ اس کی ساری ضرورتیں پوری کر دو..... اس کے دل سے محرومی کے سارے داغ مٹا دو..... اس کے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ یہ یہاں پناہ لینے آئی ہے۔ اسے یقین دلا دو کہ یہ اس کا اپنا مکان ہے۔ ہم اس کے اپنے ہیں.....“

شوکت جہاں نے انداز میں کہا۔  
عشرت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ تب شوکت جہاں نے آگے بڑھ کر اسے سینے میں بچھنچ لیا۔  
ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اب ذیشان کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ ماں کی اجازت مل ہی گئی تھی۔ اب تکلف کس بات کا۔ اس نے عشرت کے لئے کپڑوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ اسے عالم پور کے نواح کی خوب سیر کرائی تھی۔ عشرت کا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔ خوبصورت تو وہ پہلے بھی تھی لیکن اب تو اس کا چہرہ سیب کی طرح نکل آیا تھا۔ بڑی بڑی اداس آنکھوں میں سکون نظر آنے لگا تھا۔

ویسے ذیشان نے اخلاقی قدروں کا پورا پورا خیال رکھا تھا ہاں وہ کس آج تک اس کے ذہن سے چپکا ہوا تھا جو عشرت سے پہلی ملاقات میں اسے حاصل ہوا تھا۔ وہ انوکھا کس، اس کے دل کی دھڑکنوں میں رچ بس گیا تھا۔

عشرت کو آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہونے والا تھا۔ لیکن آج کل شوکت جہاں کچھ اداس نظر آنے لگی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے کسی خیال میں گم ہو جاتیں۔ بھی بھی

ان سے کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ عشرت محسوس کر رہی تھی لیکن شاید اس نے ذاتی معاملات میں مداخلت کی جرات نہیں کی۔

ہاں ایک صبح ناشتے کی میز پر ذیشان ہی نے ان سے سوال کر لیا۔ ”کیا بات ہے امی۔ کیسی طبیعت ہے؟“

”ٹھیک ہوں..... کیوں.....؟“ شوکت جہاں نے چونک کر پوچھا۔

”رات بھی آپ نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اس وقت ناشتہ بھی ایسے ہی کر رہی ہیں۔“  
”امی کی یہ کیفیت تو کئی دن سے ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”ارے.....“ ذیشان نے ناشتے سے ہاتھ روک لیا۔ ”کیا بات ہے امی، آپ کو میری قسم بتائیے۔ کیسی طبیعت ہے۔ کیا بات ہے؟“ اور شوکت جہاں کے گالوں پر آنسو لڑھک پڑے۔

”امی..... امی..... ارے بتائیے..... خدا کے واسطے بتائیے۔ کوئی گستاخی ہوئی مجھ سے.....؟“ ذیشان بے چین ہو کر ماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔ ”بتائیے کیا بات ہے امی..... بتائیے.....“

”ذیشان..... شہزاد کا کوئی خط آیا کہیں سے.....؟“ شوکت جہاں نے بھاری آواز سے کہا۔  
”اوہ.....“ ذیشان ماں کی اداسی کی وجہ سمجھ گیا..... وہ خود بھی اداس ہو گیا.....

”ایک ماہ تو ہو گیا اسے.....“ شوکت جہاں نے کہا۔

”ہاں، پندرہ دن ہو گئے ان کے خط کو۔“  
”واپس ہی نہیں آیا موزی کہیں کا.....“

”آجائیں گے امی..... آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں..... ان کی عادت سے واقف ہوتے ہوئے بھی.....؟“

”دل نہیں مانتا ذیشان..... میں دل کو سمجھانے کی

بہت کوشش کرتی ہوں..... زبان پر میں نے قابو پا لیا ہے۔ لیکن دل.....“ شوکت جہاں سسکیاں لینے لگیں۔

”ارے..... ارے ای..... خدا کے واسطے..... دیکھئے..... آجائیں گے وہ، اور آئندہ میں ان پر پابندی لگا دوں گا کہ وہ اتنے دنوں کے لئے کبھی باہر نہیں جا سکتے۔ ای براہ کرم خاموش ہو جائیں۔“

”ہاں بیٹے..... میں خاموش ہوں..... چلو ناشتہ کرو تم لوگ..... ارے عشرت بیٹی..... معاف کرنا، ناشتہ کرو۔“

”ای..... آپ..... آپ روئیں نہیں۔“ عشرت نے بھاری آواز میں کہا۔

”نہیں میری بچی..... میں نہیں رو رہی..... چلو ناشتہ کرو.....“ شوکت جہاں خود بھی ناشتہ کرنے لگیں۔ عشرت اور ذیشان بھی خاموشی سے ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

”آپ کا دل گھبرا رہا ہے امی۔ چلئے آج آپ کو سیر کرا لاؤں۔“ ناشتے کے بعد ذیشان نے کہا۔

”نہیں بیٹے..... میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ بس اب میں ٹھیک ہوں۔ تم آج کارخانے نہیں جاؤ گے؟“

”جاؤں گا امی.....“

”عشرت کو دکھایا ہے کارخانہ؟“

”اتفاق نہیں ہوا آج تک.....“

”آج دکھا دو۔“

”عشرت، آپ چلیں گی کارخانے.....؟“

”نہیں..... آج امی اداس ہیں..... آج نہیں جاؤں گی.....“

”نہیں بیٹی..... میں اداس نہیں ہوں۔ یقین کرو بالکل ٹھیک ہوں تم لوگ اس قدر احساس کرو گے تو میں شرمندہ ہو جاؤں گی۔ براہ کرم تم کارخانے چلی جاؤ۔“ شوکت جہاں نے جھل انداز میں کہا اور پھر منجائش نہیں رہی۔ تیاریاں وغیرہ کرنے کے بعد عشرت ذیشان کے ساتھ چل پڑی۔ ذیشان کارڈرائیو کر رہا

تھا..... اور عشرت اس کے نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ پھر عشرت نے ہی اسے مخاطب کیا۔

”آپ بھی اداس ہو گئے ذیشان.....؟“

”نہیں عشرت..... اداس تو نہیں، ہاں سوچ رہا ہوں.....“

”کیا.....؟“

”شہزاد کے بارے میں.....“

”اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی بتا دیں۔ یہ کون ہیں؟“

”ای نے بھی تمہیں بھیا کے بارے میں نہیں بتایا.....؟“

”نہیں..... میں نے پہلی بار ان کا نام سنا ہے.....“

”ادہ تب تو میری بھی غلطی ہے..... نہ جانے کیوں میں نے تمہیں آج تک ان کے بارے میں نہیں بتایا۔ شاید تذکرہ ہی نہ آیا ہو۔ ویسے بڑی عجیب بات ہے۔ پورے ایک ماہ میں آپ کے سامنے بھیا کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوا۔“

”آپ کے سگے بھائی ہیں.....؟“

”نہ صرف سگے..... بلکہ جڑواں۔“

”ارے..... لیکن ان کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا گھر میں.....“

”ہاں..... حیرت کی بات ہے۔ میں اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں میں نے آج تک ان کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہماری گفتگو محدود رہی ہے۔“

”ممکن ہے۔ ویسے میں نے گفتگو کبھی محدود نہیں کی۔ آپ ہی محتاط رہے۔“ عشرت نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”محتاط!.....“ ذیشان نے شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا اور عشرت کے ہونٹوں پر دلاؤیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ لفظ ناگوار گزرا ہے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ناگوار تو نہیں لیکن سخت ضرور ہے..... آپ اگر غور کریں.....“

”آپ کہہ رہے ہیں تو یقیناً ہو گا۔ میں معافی چاہتی ہوں.....“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ ”لیکن اب تو مجھے ان کے بارے میں تفصیل بتادیں۔“

”اودہ..... تفصیل مختصر ہے۔ شہزاد میرے بھیا ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی عمر کے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہیں۔ بس عادتوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ بھیا سیر و تفریح کے رسیا ہیں، زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہت کم گھر میں رہتے ہیں۔ کونھی کا دوسرا حصہ ان کے لئے مخصوص ہے، امی ان کی لا ابالی فطرت سے ٹالاں رہتی ہیں۔ لیکن وہ کسی بات کی پروا نہیں کرتے۔ میں ذرا مختلف طبیعت کا مالک ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ میں بھی ان کی طرح ہو جاتا تو باقی معاملات کون دیکھتا۔“

”کمال ہے۔ لیکن گھر میں ان کا تذکرہ اتنا مختصر کیوں ہے؟“

”اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔ امی نے بھی کبھی آپ سے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا.....؟“

”کبھی نہیں.....“

”امی ان سے ناراض رہتی ہیں۔“

”بہت زیادہ.....“

”ہاں.....!“

”عجب ہے۔ امی جان تو نہایت نرم دل ہیں۔“

”بھیا انہیں زچ بھی بہت کرتے ہیں۔“

”گئے کہاں ہیں؟“

”بس کچھ معلوم نہیں..... موڈی آدمی ہیں..... دوستوں کے ساتھ نکل جاتے ہیں اور پھر جب دل چاہتا ہے واپس آتے ہیں۔ کوئی پابندی نہیں قبول کی انہوں نے آج تک.....“

”خوب بتا کر بھی نہیں جاتے کہاں جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں امی جان ان سے بہت ناراض رہتی

ہیں.....؟“

”ہاں..... بس ماں کی ناراضگی بھی کیا..... انہیں بس اس بات کا احساس ہے کہ بھیا خاندانی روایات کا پاس نہیں کرتے۔“

”ان کی کسر آپ پوری کر دیتے ہیں۔“ عشرت نے کسی قدر شوخی سے کہا۔

”میں کس قابل ہوں.....“ ذیشان آہستہ سے بولا۔ اور عشرت مسکرانے لگی..... ذیشان نے اسے کارخانے کی سیر کرائی اور سارے حالات بتاتا رہا۔ عشرت بڑے غور اور دلچسپی سے سب کچھ سن رہی تھی۔ درمیان میں وہ سوالات بھی کرتی جا رہی تھی۔

ذیشان کو ایک انوکھے سرور کا احساس ہو رہا تھا۔ عشرت کی حسین معیت اسے بہت دلکش لگ رہی تھی۔ بہر حال شام کو وہ خوش و خرم گھر واپس لوٹے دونوں شوکت جہاں کے کمرے میں گئے تھے۔ لیکن ایک ملازم نے بتایا کہ شوکت جہاں اکبر صاحب کے گھر گئی ہیں۔ ان کے بیٹے کی اہلیہ کے ہاں ولادت ہوئی تھی۔

”بہت خوب.....“ ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کے لئے کہہ گئی ہیں کہ انہیں لینے چلے جائیں..... وہ آپ کا انتظار کریں گی.....؟“

”اودہ..... کوئی وقت بتایا تھا؟“

”جی نہیں سرکار۔ کہہ گئی تھیں، آپ جب بھی آ جائیں۔ آپ سے کہہ دیا جائے۔“

”اچھا.....“ ذیشان نے گردن ہلائی اور پھر وہ عشرت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اجازت دیں گی مس عشرت.....؟“

”جی ضرور..... عشرت محبوب سے انداز میں بولی اور ذیشان مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ عشرت اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے لباس تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے خود کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ واقعی عالم پور کی آب و ہوا اسے خوب راس آئی تھی۔

چہرہ ہی بدل گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے لباس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے۔ ایسا لباس اس نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ ایسے عیش و عشرت اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے اندر سے اس کی طبیعت عجیب ہونے لگی اور وہ ایک کرسی پر آنکھیں بند کر کے دراز ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اس کا ذہن سن ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیا کیا خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ تب اچانک دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہو گیا۔ عشرت نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں دیر تک بند رہنے کی وجہ سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ سامنے کی چیز صاف نہیں نظر آرہی تھی۔ پھر جب دھند چھٹی تو ذیشان نظر آیا۔ وہ دوسرا لباس پہنے ہوئے جانے کے لئے تیار تھا۔

”ارے آپ گئے نہیں.....؟“ وہ چونک کر بولی۔  
”آپ کو چھوڑ کر اب کہاں جاؤں.....؟“ ذیشان بے باکی سے بولا۔

”کک..... کیا مطلب.....؟“ عشرت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”وہی جو کہا ہے.....“  
”امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”کرنے دیں..... کیا فرق پڑتا ہے۔“ ذیشان لا پرواہی سے بولا۔

”کمال ہے..... کیا ہو گیا آپ کو.....“ عشرت نے پریشانی سے کہا۔

”تھوڑی دیر قبل نارمل تھا..... اب کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”ذیشان صاحب..... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“

”ذیشان صاحب.....“ ذیشان نے زیر لب دوہرایا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بھئی بھئی مجھے پر ایسے دورے پڑتے ہیں۔ میری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔ خود کو بھی بھول جاتا ہوں اور دوسروں کو بھی۔ آپ کو

حیرت ہوگی کہ مجھے آپ کا نام بھی یاد نہیں ہے۔“  
”میں یہ مذاق نہیں سمجھ سکی۔“ عشرت اچھے ہوئے انداز میں بولی۔

”میری زندگی کے سب سے بڑے ایسے کو آپ مذاق سمجھ رہی ہیں۔ افسوس.....“ ذیشان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”خدارا آپ امی کو لے آئیے۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”ہرگز نہیں..... پہلے چائے پیوؤں گا۔ سخت تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“

”اوہ..... اچھا..... میں ملازم سے منگواتی ہوں۔“  
”منگوائیے..... اور ہاں کچھ کھانے کو بھی اور اسی کمرے میں۔“

”کمال ہے.....“ عشرت مسکراتے ہوئے بولی۔  
اور باہر نکل گئی۔ پھر وہ چائے کی ٹرے اور کھانے کی چیزیں لے کر خود ہی اندر آئی تھی۔

”بہت بہت شکریہ..... چائے بنا دیں.....“ وہ میز پر پاؤں پھیلاتے ہوئے بولا اور عشرت آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔ درحقیقت ذیشان عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اسے اتنا موڈی اور بے پروا نہیں دیکھا تھا۔ بہر حال اس نے چائے بنا کر ذیشان کو پیش کر دی اور کھانے کی چیزیں بھی اس کی طرف بڑھا دیں۔ ذیشان عجیب بے تکے انداز میں کھا رہا تھا۔

عشرت مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی..... اسے ذیشان کی یہ بدلی ہوئی حرکتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ لباس کے معاملے میں بھی اس نے لا پرواہی سے کام لیا تھا۔ کپڑے انتہائی نفیس تھے، لیکن شاید استعمال کئے ہوئے تھے، ان پر کہیں کہیں دھبے بھی پڑے ہوئے تھے۔

”ارے ارے..... آپ بھی لیں..... آپ تکلف کر رہی ہیں.....؟“

”شکریہ..... میں صرف چائے پیوں گی۔“

کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ اور شہزاد کی شکل اس کی آنکھوں میں گھوم گئی۔ شہزاد ذیشان کا بھائی..... جڑواں بھائی..... ذرا فرق نہیں ہے دونوں میں..... اوہ..... وہ میرے لئے اجنبی تھا..... لیکن اس نے کس بے تکلفی سے مجھے گفتگو کی..... اور ہاں ذیشان میں تو یہ عادتیں کسی طور نہیں پیدا ہو سکتیں۔

وہ دونوں بھائیوں کے تضاد پر غور کرنے لگی۔ اور پھر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ بار بار اس کی نگاہوں میں ذیشان اور شہزاد کی تصویریں آ جاتی تھیں۔ دونوں تصویریں یکساں تھیں۔ صرف لباس کا تضاد تھا اور گفتگو کا بھی..... ایک کی گفتگو میں نرمی، حلیمی اور ٹھہراؤ تھا، اور دوسرے کی باتوں میں شوخی اور خاصی حد تک لاپرواہی تھی۔

خوب ہیں یہ جڑواں بھائی..... اس نے دل میں سوچا..... اور پھر اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھر آئی..... ایک اور تصویر..... ایک بھیاں تصویر..... اور اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ پھر اسے احساس ہوا جیسے کمرے میں قدموں کی دبی دبی چاپ ابھری ہو..... اور وہ سہم گئی..... اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور پورے کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس کے اعصاب پر تھکن سوار ہو گئی اور وہ نڈھال ہو کر کرسی پر گر پڑی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہولے ہولے کراہنے لگی۔ ان کراہوں میں اسے سکون مل رہا تھا۔

پھر شوکت جہاں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونکی اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچی تو شوکت جہاں اسی طرف آرہی تھیں..... ان کے ساتھ ذیشان بھی تھا..... شوکت جہاں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔

”پریشان تو نہیں ہوئیں“ تنہائی میں..... مجھے بڑا احساس تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی مرضی۔“ اس نے بدستور لاپرواہی سے کہا۔ ”پھر چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔“ میرا خیال ہے آپ نے میری شخصیت میں تبدیلی کو محسوس نہیں کیا ہے۔“

”اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ عشرت بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

”آجائے گی۔ لیکن ایک شرط پر.....“ اس نے کہا۔

”کیا.....؟“ عشرت نے بے تکلفی سے کہا۔

”آپ از سر نو اپنا تعارف کرا میں.....“

”ادنبہ..... کیا فضول ہے۔“ عشرت شرما گئی۔

”ٹھیک ہے فضول سہی۔ لیکن کیا آپ میری اتنی چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کریں گی.....؟“

”ذیشان صاحب..... کیوں پریشان کر رہے ہیں.....؟“

”کیونکہ ذیشان اور پریشان ہم قافیہ ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ اور پھر اس کی طرف جھک کر بولا۔ ”بتا بھی دیں.....“

”کیا بتاؤں.....؟“

”اپنا نام.....“

”عشرت، عشرت، عشرت۔“ اس نے محبوبانہ انداز میں کہا۔

”تین دفعہ..... پہلا شاید نام، دوسری عرفیت اور تیسرا تخلص۔ شاید آپ شاعری بھی کرتی ہیں۔“ وہ بولا اور عشرت ہنس پڑی۔

”کرتی ہیں آپ شاعری.....؟“

”جی نہیں.....“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کی آنکھیں کرتی ہیں..... خیر..... اس نے چائے کی پہلی میز پر رکھ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چائے کا بہت بہت شکریہ..... ویسے خادم کو..... شہزاد کہتے ہیں“ اس نے جھک کر کہا..... اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیکن عشرت کے دماغ پر جیسے ہتھوڑا پڑا تھا۔ وہ منہ پھاڑے دروازے کو لکتی رہ گئی۔

”شہزاد..... شہزاد..... شہزاد.....“ ایک ہی لفظ اس

”نہیں امی جان..... پریشانی کی کیا بات تھی۔“  
اس نے جواب دیا۔

”ہاں..... ہمارے پرانے رفیق اکبر میاں کی بہو کے ہاں ولادت ہوئی تھی۔ میرا جانا ضروری تھا۔“  
شوکت جہاں نے بتایا۔

”جی.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔  
”امی..... میں لباس بدل لوں۔“ ذیشان نے پوچھا۔

”ارے ہاں جاؤ بیٹے..... تم تھک گئے ہو گے۔“  
شوکت جہاں نے کہا اور عشرت نے ایک اچلتی نگاہ ذیشان پر ڈالی۔ دونوں کی چال ڈھال میں بھی فرق تھا۔  
ذیشان کی چال ڈھیلی ڈھالی تھی لیکن اس میں وقار تھا اور شہزادی کی چال شوخ اور لالباہی تھی۔

”آؤ بھی..... بیٹھیں.....“ شوکت جہاں نے کہا اور عشرت ان کے ساتھ چل پڑی۔ ایک خوبصورت کمرے میں پہنچ کر وہ بیٹھ گئیں۔

”چائے لے آؤں آپ کے لئے امی.....؟“  
”ارے نہیں..... میرا تو دل نہیں چاہ رہا۔ تم بیٹا چاہو تو ملازم سے منگوا لو.....“

”نہیں..... میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پی تھی۔“  
عشرت نے کہا اور اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ ابھی تک تذبذب میں تھی کہ شوکت جہاں کو شہزاد کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ لیکن اگر وہ بے باک انسان خود اس ملاقات کا تذکرہ کر بیٹھا تو..... شوکت جہاں یہ نہ سوچنے لگیں، کہ اس نے اس بات کو کیوں چھپایا؟

”بی بی..... اچھا کیا.....“ شوکت جہاں نے بے خیالی میں کہا۔

”اور تمہا نہیں پی.....“  
”اچھا..... پھر.....؟“

”میں نے ذیشان صاحب کے ساتھ پی تھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اوہو..... ذیشان کے جانے سے پہلے؟“  
”نہیں..... ان کے جانے کے بعد.....“

”اس.....؟“ شوکت جہاں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”جی ہاں امی..... بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ ذیشان صاحب آپ کو لینے چلے گئے۔ لیکن پھر اچانک واپس آ گئے۔ نئے لباس میں۔ انہوں نے اجنبیوں کی طرح میرا نام پوچھا۔ اور پھر چائے منگوانے کے لئے کہا۔“  
”بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ شوکت جہاں الجھن سے بولیں۔

”چائے پینے کے بعد اپنا نام شہزاد بتایا اور چلے گئے۔“ عشرت نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”اس.....“ شوکت جہاں اچھل پڑیں..... ”شہزاد آ گیا.....؟“

”جی ہاں.....!“  
”ارے کہاں ہے؟“ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ماں کے جذبات نمایاں تھے۔ لیکن کھڑے ہونے کے بعد ان کے چہرے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ جذبات سرد پڑ گئے اور پھر انہوں نے دروازے کی طرف رخ کئے کئے کہا۔ ”میرے بارے میں پوچھا تھا اس نے؟“

”جی..... جی ہاں..... اندر داخل ہوتے ہی پوچھا تھا۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔ ماں کے چہرے پر پیدا ہونے والے تغیر کو اس نے محسوس کر لیا تھا حالانکہ اسے یاد تھا کہ شہزاد نے ایک بار بھی ان کا نام نہیں لیا تھا۔

شوکت جہاں آہستہ سے اس کی طرف مڑیں۔ وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولیں۔ ”تم میرا دل رکھنے کے لئے تو نہیں کہہ رہیں؟“

”جی..... جی نہیں..... انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا کہ امی جان کہاں ہیں؟“

”پورا ایک ماہ ہو گیا اسے دیکھے ہوئے۔ لیکن اب تو اسے میرے آنے کی اطلاع ہو گئی ہو گی۔ اسے آنا چاہیے۔“ شوکت جہاں نے کہا اور پھر وہ واپس کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔

کرو۔“ شہزاد منہ بنا کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“ ذیشان نے کہا۔

”ارے میں جانتا ہوں تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ تم بھلا مجھے کچھ کرنے دو گے۔ اسی بھروسے پر کہہ دیا تھا۔ مگر تم فوراً تیار ہو گئے۔ بیٹے ہو پورے بیٹے۔“ اور ذیشان ہنسنے لگا۔

”امی دیکھا۔ بھیا نے کس چالاکی سے آپ کا سوال اڑا دیا۔“ اس نے کہا۔

”اللہ تعالیٰ اسے اور ذہانت دے.....“ شوکت جہاں طنزیہ انداز میں بولیں۔

”آمین..... آمین..... ویسے امی ان خاتون کا تعارف ابھی تک نہیں ہوا۔“ شہزاد تو چکنا گھڑا تھا۔

”تم خود اسے اپنی اصلیت بتا کر جا چکے ہو۔“ شوکت جہاں نے کہا۔

”اوہو..... وہ..... اس وقت..... غالباً انہوں نے میری شکایت کی ہوگی۔ لیکن امی، میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں تو شریف خواتین کی بے پناہ عزت کرتا ہوں..... آپ یقین کر لیں۔“

”کیا مطلب.....؟ عشرت سے بھیا کی ملاقات ہو چکی ہے؟“

”ہاں ذیشان بھیا..... میں سیدھا ادھر ہی چلا آیا تھا۔ یہ خاتون نظر پڑیں..... میں کوئی شرارت نہ کرتا لیکن انہوں نے مجھے آپ کی جگہ سمجھا تھا۔ اس دلچسپ غلط فہمی پر مجھے شرارت سوجھی، لیکن میں نے ان سے چائے کی فرمائش کرنے کے علاوہ اور کوئی بد تمیزی نہیں کی تھی۔“ شہزاد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ یہ لہجہ ذیشان اور شوکت جہاں دونوں کے لئے نیا تھا۔ اس میں معذرت کا انداز تھا۔ اپنی صفائی پیش کی جا رہی تھی۔ دبی دبی شکایت تھی اور یہ سب کچھ شہزاد کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ تو جھکنا ہی نہیں جانتا تھا۔ آج کی یہ تبدیلی..... کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”اچھا خیر..... چھوڑ بیٹے ان باتوں کو..... آپ

”حکم ہو تو میں انہیں اطلاع دے دوں.....؟“

”نہیں بیٹی..... اگر اسے آنا ہوگا تو خود ہی آجائے

گا۔“ شوکت جہاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ عشرت کو الجھن ہونے لگی تھی، لیکن پھر قدرت اس پر مہربان ہو گئی۔ ذیشان اور شہزاد ایک ساتھ اندر آئے تھے۔

”امی..... امی..... دیکھئے کون آیا ہے.....؟“

ذیشان کی مسرت بھری آواز سنائی دی۔

”آداب امی.....“ شہزاد نے کہا۔

”جیتے رہو.....“ شوکت جہاں گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ شہزاد نے مسکراتی نگاہوں سے عشرت کی طرف دیکھا اور پھر چھت کی طرف دیکھنے لگا..... شوکت جہاں کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہزاد بھی دوڑ کر ان کے سینے سے لپٹ جائے گا۔ ان کی خواہش بھی یہی تھی لیکن شہزاد کی طرف سے ایسا کوئی اظہار نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں!

کئی منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ تو ذیشان ہی بولا۔ ”ارے یہ خاموشی کیسی ہے؟“

”امی شاید انتظار کر رہی ہیں کہ اب میں ان سے کوئی فرمائش کرنے والا ہوں۔“ شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر آپ کیا سوچ رہی ہیں امی.....؟“ شہزاد نے کہا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ مجھے تم سے ایک ماہ کی گمشدگی کے بارے میں پوچھنے کا حق ہے یا نہیں؟“

”اوہو..... امی..... سارا قصور ذیشان بھیا کا ہے۔ انہوں نے مجھے کابل بنادیا ہے میرے ناز اٹھا اٹھا کر۔ ورنہ مجھے بھی کسی کام دھندے سے لگا دیتے تو میں یوں مارا مارا نہ پھرتا۔“

”اوہ..... میری تو دلی خواہش ہے شہزاد بھیا۔ خدا کی قسم آپ اگر اس بارے میں سنجیدگی سے سوچیں تو..... تو میں نہ جانے کیا کر دکھاؤں.....“

”تم بھی یار فوراً بول پڑتے ہو۔ کچھ انتظار تو کر لیا



کہاں کہاں ہو آئے؟“ ذیشان نے بات بدلنے کے لئے کہا۔

”بس ایسے ہی..... ظاہر ہے کسی اچھی جگہ نہیں گیا ہوں گا۔“ شہزاد نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پھر واپس دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”اچھا..... آپ لوگ آرام کریں.....“ اور اس کے بعد وہ جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا۔

عشرت عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے دل کے انتہائی گوشوں میں اضطراب کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ لیکن صرف چند لمحات کے لئے۔ اس کے بعد وہ پرسکون ہو گئی۔!

☆.....☆.....☆

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ نیبل لیپ کی محدود روشنی میں عشرت بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا۔ شاید اپنے احساسات، اپنے خیالات، اور پھر اس نے قلم بند کر لیا۔ اور انگلیاں جھٹانے لگی۔ سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر اس کی نگاہیں دوڑ رہی تھیں۔ پھر اس نے کاغذ تہہ کیا۔ اور اسے نیبل لیپ کے نیچے دبا دیا۔ اس کے بعد اس نے لیپ بند کر دیا اور واپس اپنی مسہری پر آ گئی۔ مسہری پر لیٹ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

تب بند آنکھوں میں دو چہرے گھس آئے۔ دو چہرے جو یکساں تھے۔ لیکن ایک پر شرافت، اعلا ساری اور شائستگی تھی ہوئی تھی اور دوسرے پر، دوسرے پر شونہ تھی، شرارت تھی۔ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ پھر دونوں چہرے اوپر نیچے ہونے لگے۔ پھر ایک چہرہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ رہی تھی۔ شونہ ماند پڑنی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کافی دور ہو گیا..... اور شائستہ چہرہ آگے آتا گیا۔ نرم نرم آواز کانوں میں گونجی..... لیکن اچانک شریر چہرہ پھر مسکرایا..... آگے بڑھا اور شائستہ چہرہ دور ہو گیا..... اس طرح دونوں چہرے بار بار آگے پیچھے ہوتے رہے۔ وہ گھبرا گئی.....

اور گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ کنکش..... یہ کنکش..... یہ کنکش.....

ہے..... میں اس قابل نہیں ہوں..... میں اس قابل نہیں ہوں.....! وہ بستر سے اٹھی اور کمرے کی عقبی کھڑکی پر آ گئی..... اس نے کھڑکی کھولی..... اور ہوا کے جھونکے اندر آگے لگے..... دور..... کوشی کے دوسرے حصے میں روشنی نظر آرہی تھی۔ پھر ایک کھڑکی پر کچھ سائے نظر آئے..... کوئی رخص کر رہا تھا۔ مرد ہی تھا..... اتنے دور ہوتے ہوئے بھی اس نے اندازہ لگا لیا تھا۔ اتنی رات گئے کون ہے؟ کیوں جاگ رہا ہے..... پھر سائے دور ہو گئے..... اس کا مطلب ہے ایک سے زیادہ افراد ہیں..... اور پھر کسی کے بھونڈے انداز میں گانے کی آواز آئی۔ لہجہ بدست تھا۔

اور عشرت کے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ کیا یہ..... کیا یہ شہزاد کی آواز ہے..... انہوں نے کہا تھا کہ وہ کوشی کے دوسرے حصے میں رہتا ہے۔ شہزادادہ..... تو..... تو وہ اس حد تک ہے..... کیا شوکت جہاں کی اس سے ناراضگی کی وجہ یہ ہے..... مگر..... مگر وہ..... وہ..... اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کر دی اور دوبارہ مسہری پر آ گئی۔ لیکن آنکھیں بند کرتے ہی چہروں کا عمل پھر شروع ہو گیا..... دونوں چہرے ایک دوسرے کو دھیل کر آگے بڑھتے رہے۔

شہزاد واقعی بدکردار ہے۔ اس کی آنکھوں کی شونہ۔ صرف شونہ نہیں ہے۔ اس میں درندگی اور مکاری بھی جھپٹی ہوئی ہے اور اس کے بعد صرف ایک چہرہ سامنے رہ گیا۔ مہذب اور شائستہ چہرہ..... جس طرح ظلم چلتے چلتے رک جائے اور کوئی ایک تصویر سامنے رہ جائے.....!

☆.....☆.....☆

شہزادرات کے کھانے کی میز پر بھی نہیں تھا اور صبح کو ناشتے پر بھی وہ نظر نہیں آیا۔ لیکن کسی نے اس کے نہ ہونے پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ البتہ دونوں بار عشرت نے اس کے بارے میں ضرور سوچا۔ اسے احساس ہوا کہ گھر

”شہزاد سے ملنے آئی.....؟“ اس نے پوچھا اور عشرت نے بے اختیار گردن ہلا دی۔ ”خوب..... تو اپنا یار اس لائن پر بھی چلتا ہے۔ ہمارے سامنے بہت بارسا بننا ہے۔“ خطرناک شکل والا کئی قدم آگے بڑھ آیا لیکن اب عشرت کے لئے پیچھے ہٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ گرتے گرتے پچی اور غنڈے نے اس کی کلائی تھام لی۔

عشرت کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اسے چکر آنے لگے تھے۔ لیکن وہ اس کی گرفت سے کلائی نہ چھڑا سکی۔ ”اوں ہوں۔ چیخنے کی کیا ضرورت ہے۔ سنو، اپنا نام شریف ہے اور یہ اپنا پتہ..... اس وقت شہزاد سے مل لو۔ اگر فرصت ہو تو آج رات کو..... ورنہ کل دن میں اس پتے پر آ جانا..... اپن وہیں ملیں گے۔ منہ مانگی مراد ملے گی۔“ سمجھیں.....“

عشرت نے پھر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن غنڈے نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی۔ ”سنو تو میری جان۔ کچھ تو ہو جائے ایڈوانس کے طور پر۔“ وہ عشرت کی طرف جھکا اور عشرت کی آنکھیں خوف سے بند ہو گئیں۔

وہ چکرا کر گرنے لگی..... لیکن اسی وقت کسی نے شریف کو پیچھے سے کھینچ لیا..... پھر عشرت نے دیکھا کہ غنڈے نے کئی فلا بازیاں کھائی تھیں۔ اس کے بعد اس نے شہزاد کو دیکھا..... وہ آگے بڑھا اور پھر دوسرے گھونے نے غنڈے کو دو تین فلا بازیاں اور کھلا دیں۔

”ارے ارے استاد..... استاد.....“ غنڈہ جلدی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”استاد معاف کر دو..... سنو تو سہی.....“

”دلیل کتے..... تو نے یہ جرأت کیسے کی.....؟“ شہزاد نے اسے پھر پکڑ لیا اور ایک اور گھونہ غنڈے کے منہ پر پڑا۔ اس کی کسیر پھوٹ گئی اور پھر گراری دار چاقو کی کرکر اہٹ سن کر اس کی کھال بھی بندھ گئی۔

”استاد..... خدا کے واسطے ایک دفعہ معاف کر دو استاد..... غلطی ہو گئی۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ استاد مجھے پتہ تھا کہ تمہاری کوئی بہن نہیں ہے۔ میں اسے کوئی ایسی

کے لوگ شہزاد سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، وجہ کچھ بھی ہو۔ خواہ اس کی آوارگی ہی سہی۔ خود رات کو عشرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہے اور..... اور پھر عشرت کی وجہ سے بھی اس پر جھاڑ پڑی تھی۔ اس کا عشرت کو بہت دکھ تھا۔ شہزاد نے اس سے کچھ بھی تو نہیں کہا تھا اور نہ اس نے ہی شوکت جہاں کو کوئی خاص بات بتائی تھی۔ بس شوکت جہاں کا اپنا غصہ تھا جو انہوں نے شہزاد پر نکالا تھا۔

ناشتہ خاموشی سے کیا گیا..... اور پھر ذیشان کارخانے چلا گیا۔ شوکت جہاں اپنی لائبریری میں چلی گئیں اور عشرت اپنے کمرے کی طرف۔ روزمرہ کے یہی معمولات تھے۔ لیکن عشرت کے ذہن میں ایک خیال پرورش پا رہا تھا۔ کیوں نہ شہزاد سے مل کر اس بات کی وضاحت کر دے۔ اسے کم از کم یہ بتا دے کہ اس نے شوکت جہاں سے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔

نہ جانے وہ کس طرح پیش آئے۔ نہ جانے وہ کس قسم کا انسان ہے، اونہمہ ہمت تو کی جائے۔ کھا تو نہیں جائے گا۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کیا اور کمرے سے نکل آئی اور پھر وہ کونھی کے دوسرے حصے کی طرف چل پڑی۔ خاصا فاصلہ تھا، راستے میں اسے کوئی نہیں ملا اور وہ کونھی کے دوسرے حصے میں پہنچ گئی۔ عجیب سنسان سی جگہ تھی۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے وہ رک گئی۔ اندر جائے یا نہ جائے۔ ابھی اسی تذبذب میں تھی کہ بھاری تن و توش کا ایک خطرناک شکل آدمی باہر نکلا۔ اس کے گال پر زخم کا نشان تھا۔ صورت ہی سے بد معاش معلوم ہوتا تھا۔

اسے دیکھ کر اس نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکڑے اور رک گیا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو.....“

عشرت کا خون خشک ہو گیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھ آیا اور وہ سبہ ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ گئی.....!

وہی لڑکی سمجھا تھا.....“

”میں جا رہی ہوں، بس.....“

”محترمہ عشرت..... براہ کرم یہاں سے چلی جائیں۔ میرے لئے کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ہے۔“

”بہتر ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن میں صرف اتنا عرض کرنے آئی تھی کہ میں نے امی جان سے آپ کی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ میں نے انہیں صرف آپ کے آجانے کی اطلاع دی تھی اور چائے کا دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ اور خدا کی قسم وہ شکایت کے انداز میں نہیں تھا..... وہ امی جان کا اپنا غصہ تھا.....“ عشرت نے کہا اور واپس پلٹ پڑی۔

شہزاد ہلک گیا..... وہ اسے دور تک دیکھتا رہا تھا.....! اور پھر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ذیشان اپنے کمرے میں کچھ حساب کتاب کر رہا تھا۔ چائے کی پیالی اس کے نزدیک رکھی تھی اور اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ لیکن وہ کارخانے کے کام میں مصروف تھا کہ کسی نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ذیشان اچھل پڑا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا..... شہزاد مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا.....!

”ارے بھیا آؤ..... خیریت.....؟“ وہ مسکرا دیا۔  
”ہاں ہاں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں..... کچھ نہیں مانگوں گا، وعدہ کر چکا ہوں۔“

”کیسی بات کر رہے ہو بھیا..... جان موجود ہے۔“ ذیشان نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور شہزاد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”یار..... تمہارے پاس آنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ بس ان محترمہ کے بارے میں معلوم کرنا تھا، جنہوں نے امی سے میری شکایت کر دی تھی۔“ شہزاد نے کہا۔

”عشرت کی بات کر رہے ہو بھیا؟“  
”جی ہاں.....“ شہزاد نے طنزیہ انداز میں کہا۔  
”میری آج ہی عشرت سے بات ہوئی تھی۔“

”بے غیرت..... میں جھوٹ نہیں بولتا..... یہاں لڑکیاں نہیں آتیں..... کھڑا ہو جا..... اور سن..... آج سے اگر اس طرف کا رخ کیا تو گردن اتار دوں گا۔ سمجھا۔“ شہزاد کا لہجہ بے حد خنوار تھا۔

”معاف نہیں کرو گے استاد..... میں اسے ماں کہہ دوں، بہن کہہ دوں، بس ایک بار معاف کر دو۔“

”آئندہ میں تجھے یہاں نہیں دیکھوں۔“ شہزاد کی غراہٹ بہت ہی خوفناک تھی اور شریف کان دبا کر باہر نکل گیا۔ عشرت پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہزاد کو دیکھ رہی تھی۔ دھاری دار بنیاں اور سفید قمیص میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ انتہائی حسین آنکھوں میں غصے کی کیفیت نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔ چوڑا چکلا بدن، ابھرے ابھرے بازو..... بھرا بھرا سینہ..... عشرت کی آنکھوں میں کھب گیا..... وہ سنپیل کر کھڑی ہو گئی۔ شہزاد جیکسی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
”راستہ بھٹک گئی تھیں.....؟“ اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

”نن..... نہیں..... آپ کے پاس آئی تھی۔“  
”کیوں.....؟“ اس کے لہجے میں کوئی نرمی نہیں تھی۔

”آپ سے..... آپ سے بات کرنا تھی۔“  
”اوہ..... کسی نے آپ کو میرے بارے میں تفصیل نہیں بتائی.....؟“  
”کیسی تفصیل.....؟“

”میں اس چاند کی طرح چمکتی پیشانی والے خاندان کے لئے سپاہ داغ ہوں۔ سمجھیں آپ.....؟“  
”لیکن میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔“ عشرت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس بس..... فضول باتوں سے پرہیز کریں۔ یہ شریفوں کا علاقہ نہیں ہے۔ اگر آپ کو یہاں دیکھ لیا گیا تو بدنام ہو جائیں گی۔“

انہوں نے تمہاری شکایت نہیں کی۔ صرف امی کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ آپ سے ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔“

”اوہ..... چلو ٹھیک ہے۔ ورنہ بلا وجہ انہوں نے میری دشمنی مول لے لی تھی۔“

”نہیں بھیا..... وہ بڑی مظلوم لڑکی ہے۔“

”وہ کس طرح.....؟“ شہزاد نے پوچھا اور ذیشان نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ کہانی سننے کے بعد شہزاد نے ایک گہری سانس لی اور پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”چلو یار..... تم نیک لوگ نیکیاں کرتے رہتے ہو۔ ایک آدھ اپنے کام بھی آجائے گی۔“

”بیٹھے بھیا..... چائے منگواؤں آپ کے لئے؟“

”جانے دو یار..... کیوں عادت خراب کرتے ہو۔ اگر تمہارے ساتھ کھانے پینے کی عادت پڑ گئی تو دل موسوس کر رہ جاتا پڑے گا۔“ شہزاد نے کہا اور دروازے سے نکل گیا۔ لیکن ذیشان کے سینے پر گھونسا سا پڑا تھا۔ اسے اپنے بھائی سے بے حد محبت تھی۔ یہ الفاظ اس کے دل میں چھب گئے۔ اور اس کے بعد وہ کوئی کام نہیں کر سکا۔ شہزاد اس انداز میں بھی سوچ سکتا ہے۔ اس کا سوچنا ٹھیک بھی ہے۔ امی اس سے اس قدر ناراض رہتی ہیں کہ انہوں نے اس کی خبر گیری بھی چھوڑ دی ہے۔ میں اس سلسلے میں امی سے بات کروں گا.....! اس نے سوچا، اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

”میں حاضر ہو سکتا ہوں۔“ دروازے پر ذیشان کی آواز سنائی دی اور عشرت چونک پڑی۔

”آئیے..... آئیے..... اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”شکریہ..... بس یونہی آپ سے ملنے کو دل چاہا..... کیا کر رہی ہیں؟“

”کچھ نہیں.....“

”دل تو نہیں گھبراتا آپ کا؟“

”نہیں..... اس جنت میں دل کیسے گھبرا سکتا ہے۔“ عشرت مسکراتے ہوئے بولی۔

”اوہ..... مہربانی ہے آپ کی۔ جو اس گھر کو جنت سمجھ رہی ہیں۔ جنت میں بھی کہیں شیطان رہتے ہیں؟“

”شیطان.....؟“ عشرت تعجب سے بولی۔

”ہاں عشرت..... شہزاد شیطان صفت ہی ہے۔“

”میں اس سے سخت پریشان ہوں۔“

”ذیشان صاحب مجھے آپ کے معاملات میں بولنے کا حق تو نہیں ہے۔ لیکن آپ لوگوں نے مجھے اتنی اہمیت دے دی ہے کہ زبان نہیں رک رہی۔“

”نہیں نہیں..... شوق سے فرمائیے۔ آپ بھی اسی گھر کی ایک فرد ہیں۔“

”سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کو شہزاد صاحب سے کیا شکایت پیدا ہو گئی۔ ان کا نام لیتے ہوئے تو آپ کے لہجے سے رس نکلتا ہے۔ مجھے تو آپ دونوں کی محبت پر رشک آتا ہے۔ لیکن اس وقت آپ کا لہجہ..... آپ کے الفاظ۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے آپ شہزاد کی طرف گئی تھیں؟“

”ہاں.....!“

”کیوں.....؟“ ذیشان نے کہا۔ عشرت نے ایک اچھتی سی نگاہ ذیشان پر ڈالی اور پھر آہستہ سے بولی۔

”اگر مجھے پہلے حکم دے دیا جاتا تو میں ایسا نہ کرتی۔“

”حکم کی بات نہیں ہے عشرت۔ وہ جگہ ایسی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو میری بات بری لگی ہے۔“

”نہیں..... مجھے اپنی حیثیت یاد ہے۔ میرے دل پر ایک نشان پڑ گیا تھا۔ شہزاد صاحب کو میری وجہ سے برا بھلا کہا گیا تھا، جبکہ میں نے ان کی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ صرف اسی بات کی معافی مانگنے گئی تھی۔“

”لیکن..... اس کے دوست اچھے نہیں ہیں۔“

”آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”اس سلسلے میں صرف ایک بات کہوں گی۔ نہ

## سب سے زیادہ صبر و توکل

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”حضور اکرم ﷺ نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا اور اس پر آپ ﷺ نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ کے نزدیک پیٹ بھرنے سے زیادہ فائدہ محبوب تھا اور بلاشبہ آپ ﷺ ساری رات بھوکے رہتے تھے لیکن یہ فائدہ انہیں اگلے دن کے روزے سے نہ روکتا تھا۔ اور اگر آپ ﷺ چاہتے تو اپنے رب سے زمین کے تمام خزانے، پھل اور فراخی عیش مانگ لیتے اور جب آپ ﷺ کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتی تو مجھے آپ ﷺ کی بھوک پر رحم آتا اور میں رو پڑتی۔ میں کہتی کہ میری جان آپ ﷺ پر قربان ہو، اگر دنیا میں سے آپ ﷺ آنا لے لیتے جو آپ ﷺ کی غذا کے لئے کافی ہوتا۔ تب آپ ﷺ فرماتے کہ ”اے عائشہ (رضی اللہ عنہا) مجھے دنیا سے کیا مطلب۔ میرے بھائی اولوالعزم رسولوں نے اس سے بڑھ کر ممبر کیا تھا۔ وہ تو گزر چکے۔ اپنے رب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سو اس نے ان کو اچھی جگہ دی اور بہت ثواب دیا اور میں شرماتا ہوں کہ میں یہاں خوشحال رہوں۔ اور مجھے اس سے بڑھ کر کوئی چیز بیماری نہیں کہ (عالم آخرت میں) اپنے بھائیوں اور دوستوں سے جا ملوں۔“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد ایک ماہ تک زندہ رہ کر آپ ﷺ نے وصال فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے آپ ﷺ کی سنت کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ”معرفت میرا اصل مال ہے اور عمل میرا اصل دین ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، خدا کا ذکر میرا پیار ہے، توکل میرا خزانہ ہے، کم میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میری چادر ہے، رضا میری نعمت ہے، عاجزی میرا خنجر ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری غذا ہے، صدق میرا شیخ ہے۔ بندگی میری چاہت ہے، جہاد میرا خلق ہے اور نماز سے میری آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے۔“ ایک اور حدیث میں ہے کہ میرا غم امت کے لئے ہے، میرا شوق ہے رب عزوجل کی طرف ہے۔

(عابدہ امبار، لاہور)

جانے کس طرح شہزاد صاحب غلط راستوں پر نکل گئے ہیں۔ لیکن ان کی رگوں میں بھی وہی خون ہے جو آپ کی رگوں میں ہے۔ ممکن ہے آپ کو اتفاق نہ ہوا ہو۔ لیکن میں اس کا تجربہ کر چکی ہوں۔“

”میرے خیال میں آپ اسے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ ویسے ظاہر ہے آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ چائے نہیں پلوائیں گی؟“

”اوہ..... منگوائی ہوں۔ ایک منٹ انتظار کریں۔“ عشرت نے کہا اور پھر وہ خود ہی کچن میں چلی گئی۔ ملازمہ کے ساتھ وہ چائے کی ٹرے لے کر واپس آئی ذیشان نے مخصوص انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر چائے لے کر اس کے چھوٹے چھوٹے سب لینے لگا۔

”آپ ناراض ہو گئیں عشرت صاحبہ۔“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ براہ کرم میری حیثیت کا تعین کر دیں۔ اس سے بڑھنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔“

”آپ کی حیثیت.....“ ذیشان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تعین بھی ہو جائے گا اللہ نے چاہا تو.....“ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ گیا..... ”اجازت دیں.....“ وہ دروازے تک پہنچا۔ اور پھر پلٹ کر بولا۔

”ویسے آپ کی اطلاع کے لئے، خادم کو شہزاد کہتے ہیں..... ذیشان بھیا اپنے کمرے میں ہوں گے۔“ اور ان الفاظ کے ساتھ ہی شہزاد کے چہرے سے جیسے کوئی خول اتر گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں شوخی ابھر آئی تھی اور اتنا ہی سا فرق تو تھا ان دونوں میں۔ عشرت کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹے چھوٹے پتی۔ وہ آنکھیں پھاڑے دروازے کو تکتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ شرابی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ کھاتے ہوئے گھن آئے گی۔ شوکت جہاں بڑے درد سے بولیں۔

”آپ تسلیم کر لیں ای..... کہ بھیا کو اس حد تک پہنچا دینے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے..... ہم انہیں برا کہتے

رہے۔ ہم نے ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔“

”تو اب کیا کرو گے.....؟“

”ہم انہیں سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے لئے ہمیں خود پر جبر کرنا پڑے گا۔“

”لیکن ذیشان..... تم سوچ نہیں رہے۔ تمہاری آنکھوں کی پہنچ محدود ہے۔ میں بہت کچھ سوچ رہی ہوں۔ آخر اس نے اچانک ہم لوگوں سے گھٹلے ملنے کا فیصلہ کیوں کیا.....؟“

”میں نہیں سمجھا امی جان.....؟“ ذیشان حیرت سے بولا۔

”مجھے عشرت کی عزت عزیز ہے ذیشان..... شہزاد پر کڑی نگاہ رکھنا ہوگی۔“

”امی جان.....“ ذیشان کا پورا بدن لرز گیا۔ نہیں امی جان میرا بھائی ایسا نہیں ہے۔ نہیں امی جان..... ایسا نہ کہیں۔ وہ بولا اور اس کی کیفیت دیکھ کر شوکت جہاں پریشان ہو گئیں۔

”میں تمہیں کسی اقدام سے نہیں روکتی۔ بس اس نے میرا یقین ختم کر دیا ہے۔ بہر حال میری بھی دلی خواہش ہے کہ وہ راہ راست پر آجائے میں تمہیں کوشش کی اجازت دیتی ہوں۔“

”شکریہ امی جان.....“ ذیشان وہاں سے اٹھ گیا۔ لیکن شوکت جہاں کے الفاظ اس کے ذہن پر گھوڑے برسا رہے تھے۔

اور اس شام، شہزاد بھی کھانے کی میز پر موجود تھا۔ وہی شوخ و شریر انداز وہی مسکراتے ہونٹ..... ابھی وہ سرکش گھوڑے کی طرح تھا۔ اسے رام کرنے کے لئے نرمی سے کام لینا تھا۔

”یار ذیشان بھیا..... اگر کہیں گڑبڑ ہو جائے تو بتا دینا۔ شریف لوگوں میں بیٹھ کر کھانا بھول گیا ہوں۔“

اس نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہا اور امی کا ہاتھ رک گیا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ دوسرے لمحے انہوں نے پھر کھانا شروع کر دیا تھا۔

اور اس کے بعد کھانا خاموشی سے ختم ہو گیا۔ رات کو شہزاد کوشی کے اس دوسرے حصے میں ہی سویا تھا۔ لیکن صبح کے ناشتے پر وہ موجود تھا۔ صاف سترے لباس میں ملبوس اور کسی قدر مہذب۔ پھر امی جان کی محبت کیوں نہ ابھر آتی، ان کی کدورت کیوں نہ دور ہو جاتی۔ انہوں نے پہلے دبی دبی محبت سے کام لیا اور تین چار دن کی باقاعدگی کے بعد ان کے پیار کا بند ٹوٹ گیا۔ انہوں نے شہزاد کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے دوست ہم سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے کوشی کے اس دیران حصے میں رہتے ہو۔ کیا دن میں ان سے ملاقات کافی نہیں ہے؟“

”ان سے تو اب دن میں بھی ملاقات نہیں ہوتی امی جان۔ میں نے ان سب کو طلاق دے دی ہے۔“

”پھر جھوٹ.....؟“

”آپ کی قسم..... جھوٹ نہیں ہے۔“

”ارے تو پاگل..... پھر وہاں کیوں سوتا ہے..... دیوانہ ہے کیا۔ ڈر نہیں لگتا تجھے وہاں..... میں تیرا کرہ درست کرائے دیتی ہوں۔ اسی میں واپس آ جا۔“

”جواہر کی مرضی.....“ شہزاد نے کہا اور پھر وہ بھی کوشی کے اسی حصے میں آ گیا۔ اس کی شوخیوں اسی طرح جاری تھیں۔ البتہ اب ان میں کم از کم امی کے ساتھ بدتمیزی نہیں ہوتی تھی۔ باقی سب لوگ اس کے شکار تھے۔ شوکت جہاں اس کی دشمن تو نہیں تھیں۔ بس اس کی حرکتوں نے انہیں بد دل کر دیا تھا اور وہ اس سے ساری امیدیں منقطع کر چکی تھیں۔ لیکن اب ان کی کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ تاہم وہ اس بات کو فراموش نہیں کر سکی تھیں کہ شہزاد کے اندر یہ تبدیلی اچانک آئی ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

اور ایک خاص وجہ پر وہ بھرپور نگاہ رکھتی تھیں۔ بہر حال انہیں اس بے سہارا لڑکی کی عزت عزیز تھی!

اور پھر ایک رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کی ڈیوٹی والے چوکیدار کی سیٹیاں گونگ اٹھیں اور اس نے چیخا چلا نا شروع کر دیا۔ ذیشان اور شوکت جہاں باہر نکل

آئے۔ سارے ملازم جمع ہو گئے صورتحال معلوم کی گئی تو پتہ چلا کوئی چور تھا۔ جو عمارت کی ایک کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔ شاید اندر داخل ہونے کی تاک میں تھا۔ ”کوئی کھڑکی تھی.....؟“ ذیشان نے چوکیدار سے پوچھا۔ اور چوکیدار نے جو کھڑکی بتائی اس کے بارے میں سن کر سب چونک پڑے۔ یہ تو عشرت کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ ذیشان تیزی سے عشرت کے کمرے کی طرف دوڑا اور پھر اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ بمشکل تمام عشرت نے دروازہ کھولا۔ لیکن صورتحال یہ تھی کہ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی وہ.....!“

”خیریت سے ہو عشرت۔ تم ٹھیک تو ہو.....؟“

”ہاں.....“ اس نے بمشکل کہا۔

”کیا تم نے کسی کو دیکھا تھا؟“

”کیوں.....؟“

”اپنے کمرے کی کھڑکی پر.....؟“

”نہیں..... بس شور سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔“ عشرت نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی اٹھائی گیرہ تھا۔ بھاگ گیا۔“ ذیشان نے کہا۔

لیکن شوکت جہاں کے ذہن میں کچھ اور دوسوے جاگے تھے۔ انہوں نے شہزاد کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر اسے بجاتے ہی گئیں۔ شہزاد نے بہت دیر کے بعد دروازہ کھولا تھا اور پھر وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا۔

”بڑی گہری نیند سوتے ہو شہزاد.....؟“

”کیوں تیسری جنگ عظیم چھڑی گئی ہے کیا“ اس نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”چور گھس آیا تھا۔“

”تو آنے دیں۔ وہ غریب اور کہاں جائے گا۔ خدا حافظ۔“ شہزاد نے کہا اور پھر اطمینان سے دوبارہ اندر گھس گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی، لیکن شوکت جہاں

بستر پر لیٹ کر کافی دیر تک سوچتی رہی تھیں۔ ان کی پیشانی پر گہرا غم تھا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی رات کے واقعے کا تذکرہ رہا۔ لیکن کسی کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں مل سکا۔ البتہ شہزاد اپنے مخصوص انداز میں ان لوگوں کی فکر کا مذاق اڑاتا رہا تھا۔

اس واقعے کی چوتھی رات کو پھر چور کو دیکھا گیا۔ چوکیدار نے دوسری صبح اس کی اطلاع دی تھی۔ اور ذیشان نے چوکیدار کو حکم دیا ”میں تمہیں راتقل دے دوں گا۔ اب نظر آئے تو بلا تکلف گولی مار دینا۔ میں سنبھال لوں گا۔“ کسی نے ذیشان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیکن شوکت جہاں نے چوکیدار سے تنہائی میں کہا۔

”اسے گولی مارنے کی ضرورت نہیں ہے اور گرفتار بھی کر لو تو پہلے خاموشی سے مجھے اس کے بارے میں بتانا.....“

”جی جی بی.....“ چوکیدار نے حیرت سے کہا لیکن اس کے بعد کئی دن تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ البتہ نہ جانے کیا ہوا، عشرت بیمار پڑ گئی۔ اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ وہ لاغر ہوتی جا رہی تھی۔ شوکت جہاں اور ذیشان اس کے لئے پریشان تھے۔

”محترمہ..... اب آپ کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔“ ذیشان نے اس سے کہا۔

”آپ نے بلا وجہ تکلیف کی۔ میں ٹھیک ہوں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... ایسے ہی ٹھیک ہوتے ہیں۔ دیکھئے آپ ٹھیک ہو جائیں۔ ورنہ..... میں بھی بیمار پڑ جاؤں گا۔“ ذیشان نے آہستہ سے کہا اور عشرت اسے دیکھتی رہی گئی۔ ذیشان کمرے سے نکل گیا تھا۔ ڈاکٹر آیا اس نے معائنہ کیا انجکشن لگایا۔ نسخہ لکھا اور چلا گیا۔ دوا میں شہزاد خرید کر لایا تھا۔

”یاریہار پڑ کر کیسا لگتا ہے۔ ہمیں تو یاد بھی نہیں۔ بتاؤ گی۔“ اس نے حسب عادت مسکراتے ہوئے عشرت



ہو گئے تھے۔ شوکت جہاں خود بھی رونے لگیں اور پھر انہوں نے سب کو باہر بھیج دیا۔ ”میری لال..... مجھے بتا تو سہی..... بتا تو سہی کیا ہو گیا۔“ انہوں نے بڑی پریشانی سے کہا۔

”ای..... امی جان.....“ عشرت کی چیخ نکل گئی۔  
 ”ای جان مجھے زہر دے دیں۔ مجھے زہر منگوا دیں امی جان۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ آہ امی ہاں..... میں نے اپنی عزت بچانے کے لئے یہاں پہاڑ حاصل کی تھی۔ لیکن میرے لئے یہ جگہ سب سے زیادہ بھیانک نکلی۔ امی..... میں لٹ گئی۔ مجھے لوٹ لیا گیا مجھ بے سہارا کی آخری پوچی بھی چھین لی تھی۔ اب میں فلاں ہوں۔ میرے پاس میری عزت بھی نہیں رہی۔“  
 عشرت پھر بلکنے لگی اور شوکت جہاں کے سارے بدن کا خون جیسے بہہ گیا۔ وہ ساکت رہ گئی تھیں۔ ان کے ذہن میں تاریکیاں رینگ آئی تھیں۔ یہ کیا ہوا۔ یہ کیا ہو گیا..... وہ سوچ رہی تھیں۔ کافی دیر کے بعد ان کے حواس بحال ہوئے اور انہوں نے پوچھا۔  
 ”عشرت..... وہ کون تھا..... مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔“

”مجھے مار دیں امی..... مجھے گولی مار دیں..... خدا کے لئے مجھے گولی مار دیں۔“ عشرت روتے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے ساتھ انصاف کروں گی عشرت مجھے بتاؤ..... مجھے بتاؤ..... ورنہ تمہارے مرنے سے قبل میں مر جاؤں گی۔ جواب دو ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔“  
 ”ای.....“ عشرت چیخ پڑی۔

”جواب دو.....“ شوکت جہاں جنون کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔  
 ”ای..... میری زبان نہیں کھلے گی امی۔ میری زبان نہیں کھلے گی۔“

”میرے بیٹوں میں سے کوئی تھا.....؟“ شوکت جہاں نے پوچھا اور عشرت نے گردن جھکا دی۔  
 ”ذیشان تھا کہ شہزاد۔ جواب دو۔ کون تھا.....؟“

”کیا کریں گے جان کر.....؟“ وہ مسکرا کر بولی۔  
 ”بس اب تو زندگی کی ساری دلچسپیوں میں حصہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ بیمار ہوں گے تو شاید کوئی تیار داری بھی کرے..... اور اگر اپنی گرم پیشانی پر کسی پسندیدہ ہستی کے سرد ہاتھ پہنچ گئے تو ان کی ٹھنڈک دل تک پہنچے گی۔ کم از کم اس طرح اندر کی جلن کچھ کم ہو جائے گی۔ یا ایک بات بتاؤ عشرت۔ اگر میں بیمار پڑ جاؤں تو تم میرے لئے کیا کرو گی؟  
 عشرت کوئی جواب نہ دے سکی۔

”اپنے ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دینا۔ ایمان سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔ شہزاد نے کہا اور باہر نکل گیا۔ عشرت پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دل بھڑبھڑا رہا تھا۔ شہزاد کی بات سے اس کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں نمودار ہوئی تھی۔ وہ بے بسی کے عالم میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اور پھر دل سے ایک گولا ساحق کی طرف امنڈا..... اور اس کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے۔

قیامت کی صبح آ گئی۔ عشرت اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی بہت دیر ہو گئی تو ذیشان پریشان ہو گیا۔ وہ خود عشرت کے کمرے تک پہنچا اور اس نے زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ لیکن جواب نہ ملا۔ تب سب پریشان ہو گئے۔ شوکت جہاں بھی ہاتھی کاغذی پہنچ گئیں۔ پھر ایک ملازم عقبی کھڑکی سے اندر کودا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

عشرت اپنے بستر پر موجود تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔ آنکھیں رو رو کر سوچ گئی تھیں۔ دانت بھیجنے ہوئے تھے۔ شوکت جہاں نے اسے سینے سے لگایا تو وہ ایسی روئی کہ سب کے دل دہل گئے.....!

”ارے میری بچی..... میری لال کیا ہو گیا۔ کیا بات ہے..... مجھے بتا تو سہی.....“ لیکن عشرت نے انہیں پہنچ لیا اور بلک بلک کر روتی رہی۔ سب پریشان



خود سے گھن آرہی ہے۔ کہ میں نے تمہیں پیٹ میں رکھا۔ تم جیسے گندے کیڑوں کو، جنہوں نے میرے چاروں طرف اتنی غلاظت پھیلا دی ہے کہ اب سانس لینا میرے لئے دہم ہے۔“

”ای۔ ای۔ ای۔ ہمارا قصور۔۔۔۔۔ ہوا کیا۔ ہمیں بھی تو بتائیں۔“ ڈیشان بولا۔۔۔۔۔

”بتاؤ عشرت کو کس نے لوٹا ہے۔ کس نے اس بے کس اور مظلوم کی عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ بتاؤ۔۔۔۔۔ تم دونوں میں سے کون تھا وہ؟“ بولو، جواب دو۔۔۔۔۔ اگر مجھے حقیقت نہ معلوم ہو سکی تو تم دونوں کو گولی مار دوں گی۔ کیونکہ بہر حال وہ گندہ کیڑا تم میں سے ہی کوئی ہو گا، اور پھر میں خودکشی کر لوں گی، میں خود کو بھی سزا دوں گی، کیونکہ میں نے ہی تمہیں جنا ہے۔ بنیادی قصور میرا ہے۔“ شوکت جہاں غصے سے لرز رہی تھیں۔

ڈیشان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ شہزاد بھی، بھونچکا رہ گیا تھا۔ دونوں کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں رہے۔ پھر ڈیشان نے شہزاد کی طرف دیکھا، اور شہزاد نے اس کی طرف۔ دونوں کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔

”ای۔ ای۔ آپ کے خون کی قسم۔۔۔۔۔ آپ کے دودھ کی قسم۔۔۔۔۔ میں خواب میں بھی ایسی کسی بات کا تصور نہیں کر سکتا۔“ ڈیشان نے کہا۔

”مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہے۔۔۔۔۔ اور تم۔۔۔۔۔“ شوکت جہاں نے قہر آلود نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ ”مجھے نہیں معلوم تمہارے خون میں گندگی کیسے شامل ہو گئی شہزاد۔“ کہنے۔۔۔۔۔ کتے۔۔۔۔۔ مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا ڈیشان۔۔۔۔۔ اس نے جو سچائی بدلی ہے۔ اس کی گہرائی میں کوئی بات ضرور ہے۔ آہ شہزاد۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ تو نے اتنا بڑا گناہ کیا ہے جس کی مثال مشکل ہے۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ تو نے ہماری آخری پونجی بھی لوٹ لی۔“

”مجھے کچھ کہنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی۔“ شہزاد کی آواز بے حد خوفناک تھی۔

”کیا کہے گا اب بد نصیب۔۔۔۔۔ کیا کہے گا اب۔۔۔۔۔“

”میں نہیں جانتی امی۔۔۔۔۔“ عشرت سکتے ہوئے بولی۔ ”میں سو رہی تھی، حواس ہی درست نہیں تھے۔ دونوں کی آواز یکساں ہے۔۔۔۔۔ دونوں کے چہرے یکساں ہیں۔ روشنی بچھا دی گئی تھی۔ مجھے آواز نہ نکالنے کی دھمکی دی گئی تھی۔“

”عشرت خود کو سنبھالو بیٹی۔ جو کچھ ہو چکا ہے۔ میں اسے لوٹا تو نہیں سکتی۔ لیکن تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا۔ ہاں تمہارے ساتھ انصاف ہو گا۔ تم بے سہارا نہیں ہو۔ خدا تمہارا ہے۔ میں تمہاری ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھالو، تاکہ بات بہت سے کانوں تک نہ پہنچے۔“ شوکت جہاں اس کے کمرے سے نکل گئیں اور پھر وہ اپنے کمرے میں پہنچ گئیں۔

ڈیشان ان کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ”کیا ہوا امی۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا عشرت کو۔۔۔۔۔؟“ اس نے پریشانی سے پوچھا اور شوکت جہاں اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ انہیں ڈیشان کی شرافت پر بے پناہ اعتماد تھا۔ آج وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کر سکتی تھیں۔ ممکن ہے وہ اپنی روایتی شرافت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ وہ اسے گھورتی رہیں۔

”کیا بات ہے امی۔ مجھے بھی تو بتائیں؟“

”رات کو تم کہاں تھے؟“

”میں۔۔۔۔۔ کس وقت امی۔۔۔۔۔؟“

”ساری رات۔۔۔۔۔“

”سو رہا تھا۔۔۔۔۔ کیوں امی۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔ خدا کے واسطے مجھے بتائیں تو سہی۔۔۔۔۔؟“

”شہزاد کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں امی۔۔۔۔۔“

”اسے بلاؤ۔۔۔۔۔“

”میں بلا کر لاتا ہوں۔“ ڈیشان پریشانی کے عالم میں کمرے سے نکل گیا اور چند منٹ کے بعد شہزاد بھی اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ شوکت جہاں نے خونی نگاہوں سے اسے گھورا اور پھر خوفناک آواز میں بولیں۔

”سنو۔۔۔۔۔ میں تم دونوں کی ماں ہوں۔ لیکن مجھے

شوکت جہاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”آؤ.....“ ذیشان نے شہزاد سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ شہزاد نے تیکھی نگاہوں سے شوکت جہاں کی طرف دیکھا اور پھر وہ بھی کمرے سے نکل گیا..... ذیشان خاموشی سے کونٹھی کے دوسرے حصے میں جا رہا تھا پھر اس نے شہزاد کی رہائش گاہ میں داخل ہو کر پیچھے دیکھا۔ شہزاد اس کے قریب ہی تھا۔ ذیشان نے اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر لیا..... اور پھر دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے!

”شہزاد.....“ ذیشان نے غرائی ہوئی آواز میں کہا..... ایسا لہجہ شہزاد نے آج تک نہیں سنا تھا۔ لیکن اس کے انداز میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

”تم میرے برابر ہو شہزاد..... لیکن میں نے آج تک ہمیشہ تمہاری عزت کی..... تم غلط راستوں پر نکل گئے، لیکن میں نے ہمیشہ تمہاری اعانت کی، لیکن کیا تم توقع رکھتے ہو کہ میں تمہارے اس قصور کو بھی معاف کر دوں گا۔“

”اس سے پہلے.....“ شہزاد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اس سے پہلے میں تمہیں فرشتہ سمجھتا تھا ذیشان۔ اس سے پہلے میں سوچتا تھا کہ تم بھائی کے روپ میں فرشتہ ہو۔ میں دل سے تمہاری عزت کرتا تھا۔ لیکن میں داد دیتا ہوں تمہاری چالاک، تمہاری ذہانت کی۔ آج میں سمجھا کہ میں تمہارے لئے ایک شطرنج کے مہرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا..... تم نے محبت کا لبادہ صرف اس لئے اوڑھا ہوا تھا کہ دنیا تمہیں فرشتہ سمجھے..... اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو تم آسانی سے میری آڑ میں اپنا منہ چھپالو..... میں تو بدنام ہوں ہی.....“

”ذلیل انسان..... ذلیل کتے..... تو کتنی صفائی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ تو نے میری محبت کا یہ صلہ دیا ہے مجھے..... تو نے..... تو نے..... میں تجھے مار ڈالوں گا۔“ ذیشان اس کی طرف لپکا۔ اس نے پوری قوت سے شہزاد کے ایک گونہ رسید کیا۔ لیکن شہزاد نے اسے کلائی پر روک کر دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”میں گناہ گار ہوں ذیشان..... اپنے گندے ہونٹوں سے، اپنی گندی زبان سے خدا کا نام لیتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، لیکن خدا کی قسم، جس کی عظمت میرے دل میں تجھ سے زیادہ ہے۔ اگر میری تجھ سے کوئی ذاتی دشمنی ہوتی۔ اگر تیری کوئی ایسی خطا ہوتی جس کا تعلق صرف میری ذات سے ہوتا تو میں تیرے قدموں میں سر رکھ کر تیری خطا معاف کر دیتا۔ تو جو کہتا کرتا۔ لیکن تو نے شیطان کو بھی مات کر دیا ہے۔ تو نے اس مظلوم کی عزت لوٹی اور اپنی جھوٹی شرافت کا لیبل ماتھے پر سجا کر اس کا الزام میرے سر ڈال رہا ہے۔ میں بدکار ہوں۔ ذلیل و خوار ہوں لیکن میں نے آج تک کسی کی عزت نہیں لوٹی۔ میرے خون میں اتنی گندی شامل نہیں ہے۔ لیکن تو نے.....“

”ذلیل..... بدکار..... کینے..... کتے..... جھوٹ بول رہا ہے۔ مکاری کر رہا ہے۔“ ذیشان نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا۔ اور پھر وہ شہزاد پر پل پڑا۔ اس نے بے شمار گھونٹے، پھپھر اس پر برسائے۔ وہ شہزاد سے کمزور نہیں تھا۔ دونوں جسامت میں یکساں تھے۔ شہزاد کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون کی لکیریں اس کی ٹھوڑی پر رنگ آئیں..... دوسرے لمحے وہ کسی دردندے کی طرح غرایا اور اس نے لپک کر ذیشان کو دبوچ لیا..... ذیشان نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا، شہزاد نے اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور پھر اس کے سینے پر سوار ہو کر اس نے ذیشان کی گردن دبوچ لی۔

”اپنے گناہ کا اعتراف کر ذیشان ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا، بول تو نے عشرت کی عصمت لوٹی ہے؟ جواب دے.....“ اس کی ٹھوڑی سے خون کے قطرے ذیشان کی پیشانی پر ٹپک رہے تھے۔ ذیشان نے اسے گرانے کی کوشش کی لیکن شہزاد کی گرفت نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ ”جواب دے ذیشان اعتراف کر اپنے گناہ کا۔“

اور ذیشان اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا!

”پتہ لگانا پڑے گا..... ارے تیرا ہونٹ پھٹ گیا..... چلو اس کی ڈریسنگ کر دوں۔“  
”ہو جائے گی یار..... پہلے اس معے کو تو حل کر لو.....“

”آؤ..... عشرت کے پاس چلیں۔“ ذیشان نے کہا اور دونوں چل پڑے۔ ”سنو شہزاد..... اب ایسی حالت میں اگر تم سے کہا جائے کہ تم عشرت کو اپنا لو..... تو کیا تم اسے قبول کر لو گے؟.....“  
”اس مظلوم کا کیا قصور ہے بھیا.....“ شہزاد نے کہا۔

”میرے پیارے بھائی..... تو تو واقعی عظیم ہے۔ بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔ واقعی بڑی حماقت ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے تیرا خون نکلا ہے۔ خدا کی قسم میں اپنے آپ کو سزا دوں گا۔“  
”اسے ذہن سے نکال دو بھیا..... اگر تم نے خود کو سزا دی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ یہ گندے خون کے آخری قطرے تھے جو بہہ گئے اچھا ہوا۔“ شہزاد نے کہا اور پھر وہ دونوں عشرت کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ کمرے سے عشرت کے بڑبڑانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ٹھٹھک گئے۔

”مجھے معاف کر دینا میرے مظلوم بھیا۔ مجھے معاف کر دینا..... تیری بہن تیرے لئے کچھ نہیں کر سکی۔ اگر قسمت تجھے زندگی دے دے تو بہن کو یاد کر لینا اور اگر..... اگر..... وہ ظالم تجھے موت کے گھاٹ اتار دے، تو..... تو پھر..... انشاء اللہ..... ملاقات ہوگی.....“

خدا حافظ..... خدا حافظ بھیا۔“ اور اچانک شہزاد نے دروازہ کھول دیا۔ ذیشان کی نگاہ عشرت پر پڑی اور اس کا بدن جھنجھنا گیا۔ عشرت کے ہاتھ میں ایک لمبا خنجر تھا جسے وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے سر تک بلند کر چکی تھی۔ وہ شاید اسے سینے میں گھونپنا چاہتی تھی۔

شہزاد ہی کی ہمت تھی کہ اس نے برق کی سی سرعت سے عشرت پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے عشرت کی دونوں کلاسیاں پکڑ لی تھیں اور عشرت چت گر گئی تھی۔

اسے شہزاد کے چہرے پر سچائی نظر آئی تھی۔ اور وہ حیران رہ گیا..... خود اس نے عشرت کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کی تھی..... پھر..... پھر.....؟

”جواب دے ذیشان..... جواب دے۔“ شہزاد دانت بھینچ کر بولا۔

”شہزاد..... امی کی قسم..... اپنے خاندان کے عزت کی قسم..... میں نے کچھ نہیں کیا..... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا.....“ اور شہزاد نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ذیشان کی پیشانی پر ٹپکے ہوئے خون کو انگلیوں سے چھوا..... اور جذباتی لہجے میں بولا۔

”یہی خون تیری رگوں میں بھی ہے ذیشان، یہی میرے باپ کی رگوں میں بھی تھا۔ اس مرحوم باپ کی قسم..... اس خون کی قسم..... میں اس بے بس لڑکی کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتا تھا..... قسم ہے اس خون کی، میں نے کسی برے ارادے سے آج تک اس کے کمرے کی طرف قدم نہیں بڑھایا..... یار..... میں تو اسے چاہتا ہوں..... میں تو اس سے پیار کرتا ہوں..... میں نے اس کے لئے زندگی بدل دی ہے۔ سارے دوستوں کو چھوڑ دیا ہے۔ صرف اسی کے پیار نے تو میری آن توڑ دی۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ خود کو بالکل بدل دوں۔ میں نے تو اس کے لئے زندگی کے نئے راستے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں بھلا اس کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہوں۔“ شہزاد ذیشان پر سے اٹھ گیا۔

ذیشان پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ ”مگر..... پھر..... پھر اسے ہماری ذات پر کیوں شبہ ہوا.....“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا..... اس کا دل اندر سے کٹ رہا تھا۔ شہزاد..... شہزاد ابھی اس سے پیار کرتا ہے..... شہزاد، اس کا بھائی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اس نے اپنے دل پر ایک پتھر باندھ لیا۔

”پھر وہ کون ہو سکتا ہے شہزاد.....؟“  
”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ شہزاد نے کہا۔

شہزاد کا پورا بدن اس پر چھایا ہوا تھا۔

”مجھے مر جانے دو شہزاد..... مجھے مر جانے دو.....“

”میں تمہیں مرنے سے نہیں روکوں گا عشرت۔ لیکن موت سے پہلے تم ہمارا فیصلہ کر دو گی۔ بتاؤ گی کہ تمہیں ہمارے اوپر شبہ کس طرح ہوا۔ تمہیں یہ احساس کیسے ہوا کہ تمہاری عزت لوٹنے والا درندہ، ہم دونوں بھائیوں میں سے کوئی ہے۔“

”آہ..... شہزاد..... تمہیں خدا کی قسم۔ مجھے مر جانے دو شہزاد۔“

مجھے مر جانے دو.....“ عشرت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسی وقت شوکت جہاں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ شہزاد کو عشرت کے سینے پر سوار دیکھ کر ان کے بدن میں انگارے بھر گئے۔ وہ بھوکے شیر کی طرح لپکیں اور انہوں نے شہزاد کے بال پکڑ لئے۔

”بد بخت..... کینے..... ابھی میں زندہ ہوں۔ میں نے تجھے پیدا کیا ہے، میں تجھے موت کی نیند بھی سلا سکتی ہوں..... ذلیل..... آوارہ..... گندے خون..... اور تو بھی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا ہے ذیشان.....!“

”ای..... امی چھوڑ دیجئے..... امی چھوڑ دیجئے.....“

ای..... عشرت خودکشی کرنے جا رہی تھی۔ شہزاد بھیانے اسے اس سے باز رکھا ہے۔“ ذیشان نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا..... شہزاد نے عشرت کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا تھا..... شوکت جہاں نے بوکھلا کر اس کے بال چھوڑ دیئے اور شہزاد سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”مجھے غم ہے امی..... ہم آپ کی اولاد ہیں..... آپ ماں ہیں آپ کو اپنے خون پر بھروسہ کیوں نہ ہوا..... امی آپ قصور وار ہیں۔“ ذیشان نے کہا۔

”ہاں امی جان..... ہاں سلطانہ شوکت جہاں..... گندے خون یہ نہیں میں ہوں..... میرے ضمیر میں آگ روشن ہو گئی ہے۔ میں جل رہی ہوں۔ یہ آگ مجھے موت دے گی۔ مجھے مرنا ہی ہے۔ مجھے مرنا ہی ہے تو میں آخری وقت میں آپ کے خاندان میں بھرے

ہوئے انگارے کیوں نہ سمیٹ لوں..... یہ انگارے میں نے ہی بکھیرے ہیں۔ میں خود غرض ہوں شوکت جہاں بیگم..... میں نے اپنے بھائی کی زندگی بچانے کے لئے آپ کے خاندان کو ختم بنا دیا۔ آپ جیسے محبت کرنے والے، سیدھے سادھے لوگ میرے قریب میں آ گئے۔ دیکھئے۔ سامنے وہ پرچا رکھا ہوا ہے میں نے اس میں پوری تفصیل لکھ دی ہے لیکن اب آپ سب آ ہی گئے ہیں تو سن لیں.....!

زلزلے میں ہمارا سارا خاندان تباہ ہو گیا تھا۔ میں بچی اور میرا چار سالہ بھائی..... ان کے علاوہ ہمارے رشتہ داروں میں میرے ایک دور کے ماموں بھی زندہ بچے..... اوباش فطرت، آوارہ انسان کو نہ جانے خدا نے کیوں زندگی بخشی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا۔ میرے بھائی کو بڑے پیار سے گود میں رکھا۔ اس نے ہماری اعانت کا فیصلہ کیا۔ اور ہم دونوں بے سہارا اس فرشتے کے ساتھ رہنے لگے۔ وہ عالم پور میں بھی رہ چکا تھا اور آپ لوگوں کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ بہر حال چند روز کے بعد پتہ چل گیا کہ وہ فرشتہ نہیں شیطان تھا۔ اس نے مجھے برے راستے پر چلنے کی ترغیب دی لیکن میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ کافی دن تک سختی کرتا رہا۔ پھر اس کے شیطانی ذہن نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ اس نے میرے بھائی کو وہاں سے غائب کر دیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے منصوبے پر عمل کروں۔ ورنہ وہ میرے بھائی کو جان سے مار دے گا۔ اور میں مجبور ہوگی۔ منصوبے کے تحت آپ کو خط لکھا گیا اور آپ لوگوں نے یہاں بلا لیا۔ وہ بھی میرے ساتھ آیا اور رات کو چھپ چھپ کر یہاں کے حالات معلوم کرتا رہا جو میں ایک کاغذ پر لکھ کر اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ وہ چور جسے چوکیدار نے دیکھا تھا، وہی تھا!

یہاں کی صورت حال دیکھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ میں یہاں یہ ڈرامہ کروں۔ آپ رحم دل ہیں اور شہزاد بدنام..... اس طرح وہ راستے سے ہٹ جائیں گے اور آپ میرے لئے کوئی بہتر حل سوچیں گی۔ اگر آپ نہ

خراب ہوا ہے، خون نہیں۔ ہمیں تمہاری مجبوری کا احساس ہے۔ ہم سب تمہیں بے تصور قرار دیتے ہیں اور سنو..... اب اپنے بھائی کی زندگی بچانے میں تم تنہا نہیں ہو۔ ہم تینوں بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں سمجھیں..... ہم سب مل کر اس کی زندگی بچائیں گے، اٹھو..... اب ذہن صاف کر لو..... تمہیں نہیں معلوم کہ اس انوکھے حادثے نے مجھے کتنا بڑا مان دیا ہے۔ میرے دونوں بیٹے عظیم ہیں.....“ اور عشرت وڈ کر شوکت جہاں کے قدموں سے لپٹ گئی۔

”لیکن..... لیکن اب میں خود اپنی نگاہوں سے گر گئی ہوں امی..... میں خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گئی ہوں۔“

”نہیں بیٹی..... تمہاری مجبوری اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہے۔“ شوکت جہاں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔

☆.....☆.....☆

ایک چھوٹی سی تقریب میں عشرت جہاں کو شہزاد سے منسوب کر دیا گیا۔ چند معزز لوگ اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ بہر حال بات چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ ظاہر ہے بہت اہم خبر تھی۔ لوگوں نے دلی مبارکباد پیش کی تھی شوکت جہاں کو..... اور اب انہیں اس چور کا انتظار تھا۔ شہزاد اور ذیشان ساری ساری رات جاگتے رہتے تھے۔ تیسری رات جب سردی خوب تیز پڑ رہی تھی۔ ذیشان اور روٹ پہنے ایک درخت کی آڑ میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی اپنی کوششوں سے عشرت کو شہزاد سے منسوب کیا گیا تھا۔ ورنہ امی پہلے اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ شہزاد کی زبانی اس کے پیار کی کہانی سن چکا تھا۔ اپنے بھٹکے ہوئے بھائی کو راہ پر آنے سے وہ کیسے روک سکتا تھا۔ اسے تو صرف اس بات کی خوشی تھی کہ عشرت سے اس کے لگاؤ کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔ ورنہ بڑی الجھن پیش آ جاتی۔ بہر حال ایثار زندگی کی سب سے قیمتی شے ہے اور یہ چیز اس کے پاس موجود تھی۔

سوچتیں تو اس کے منصوبے کے مطابق مجھے آپ سے کہنا پڑتا کہ اب آپ ہی مجھے سنبھالیں اور اس طرح میری شادی اس کے خیال کے مطابق ذیشان سے ہو جاتی۔ تب وہ میرے بھائی کو لے کر میرے ماموں کی حیثیت سے یہاں آ جاتا اور آپ کی دولت پر ہاتھ صاف کرتا۔ صرف اپنے..... صرف اپنے بھائی کی زندگی کے لئے مجھے یہ گندہ کھیل کھیلنا پڑا۔ آہ میرا دل جانتا ہے کہ آپ کو دھوکہ دے کر مجھے کس قدر صدمہ ہوا ہے۔ اور جب میرے ضمیر کی چیخوں نے میرے سارے وجود کو ہلا دیا تو میں نے اپنے معصوم عامر کو آپ پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری موت کے بعد وہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ جو اللہ کی مرضی ہو.....!“

عشرت سسکنے لگی۔ اس نے شرم سے چہرہ چھپالیا تھا۔ لیکن شدید حیرت کے باوجود شوکت جہاں کی آنکھوں میں ایک سکون لہرانے لگا تھا اور پھر ان کو سینے میں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ انہوں نے فخر سے گردن اٹھا کر اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھا اور پھر بولیں۔

”شہزاد..... سارا الزام تمہارے اوپر تھا بیٹے۔ حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔ تم عشرت کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟“

”یار امی جان..... آپ اسے انسانوں سے الگ کوئی چیز سمجھتی ہیں کیا..... وہ انسان ہے۔ اس کے بعد ایک کمزور لڑکی ہے۔ اس کے بعد ایک محبت کرنے والی بہن ہے۔ ایک مجبور بہن اپنے بھائی کی زندگی بچانے کے لئے دوسروں کے ہاتھوں میں جس قدر کھیل سکتی ہے۔ وہ بھی کھیلی اور اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ باضمیر ہے۔ ورنہ اس کے پروگرام میں کوئی رخنہ نہیں ہے، الزام میرے سر تھا۔ لیکن حالات کے تحت میری نگاہ میں وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ خدا کی قسم میں نے اسے دل سے معاف کر دیا.....“

”ذیشان تمہارا کیا خیال ہے؟“

”شہزاد بھیا کا ایک ایک حرف درست ہے امی۔“

”عشرت بیٹے..... دیکھا تم نے..... ہمارا وقت

چوکیدار نے سوکھی لکڑیوں کا الاؤ روٹن کر دیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ آگ سنیکے کے بعد گیٹ پر واپس گیا تھا۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اچانک اس نے ایک سایہ دیکھا جو بے قدموں عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ ذیشان اچھل پڑا۔ اس نے اوور کوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ فلیٹ ہیٹ کے گوشے کو جھکا کر وہ بے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ تب سایہ عشرت کی خوابگاہ کی عقبی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔ ایک مخصوص دستک، اور عشرت نے کھڑکی کھول دی۔ وہ بھی شاید جاگ رہی تھی۔

”عشرت.....“ سائے کی آواز ابھری۔

”جی.....“ عشرت کی آواز بھینچی بھینچی تھی۔

”تم کامیاب ہو گئی ہو.....؟“

”ہاں.....“

”میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ تمہارا بھائی عامر بالکل خیریت سے ہے۔ شادی کا پروگرام کیا ہے.....؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”آپ کی شرکت ہمارے لئے باعث مسرت ہو گی جناب..... آخر آپ لڑکی کے ماموں ہیں۔“ عقب سے ذیشان کی آواز ابھری۔ اور سایہ اچھل پڑا۔

”خبردار..... پستول کا رخ تمہاری طرف ہے۔ ہلے تو گولی مار دوں.....“

”لیکن ذیشان کا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ سائے نے الٹی چھلانگ لگائی اور ذیشان پر آ پڑا۔ پستول ذیشان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ سائے نے ایک زور دار گھونسہ اس کے جڑ سے پر رسید کیا اور پھر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن اچانک ایک طرف سے فائر ہوا اور سائے کی چیخ ابھری۔ وہ نیچے گر پڑا تھا۔ تب شہزاد اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”اپنے داماد کو بھول گئے تھے یار۔ کیسے میا سر ہو۔ ویسے میا سر کا لفظ مجھے ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی

بندریا نے تنک پانچامہ پہنا ہوا ہو۔ کیوں ذیشان بھیا.....؟“

”ارے یہ مر نہ جائے..... ابھی اس سے عامر کا پتہ معلوم کرنا ہے۔“ ذیشان بولا۔

”فکر نہ کریں۔ میں نے صرف اس کی ٹانگیں توڑی ہیں۔“ شہزاد نے کہا اور جھک کر سائے کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر اندر لے آئے۔ فرید خان ہوش میں ہی تھا۔ انہوں نے اس کے زخم کی ڈریسنگ کی وہ خونخوار نگاہوں سے ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

”ظاہر ہے تم بھی پیٹ کے مرید ہو فرید خان..... دولت چاہتے ہو..... اور پھر تم ہمارے میا سر بھی ہو۔ اس لئے ہم تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔ ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ ہم تمہارا علاج کرا میں گے اور ٹھیک ہو جانے کے بعد تمہیں ایک لاکھ روپیہ نقد دیں گے، اس سے زیادہ تم ویسے بھی نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ کیا خیال ہے؟“

”کیا ضمانت ہے کہ تم ایسے ہی کرو گے؟“ فرید خان بولا۔

”ضمانت کا فیصلہ تم خود ہی کر لو..... بہر حال یہ کام کرنا ہے۔“ ذیشان بولا۔

”مجھے منظور ہے۔“ فرید خان نے جواب دیا۔

”لیکن..... لیکن ذیشان بھیا..... میں اس کمینے کو..... میں اس کمینے کو.....“ عشرت نے کہا۔

”ہاں..... ہاں بری بات عشرت بہن..... بڑوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔“ ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا اور عشرت خاموش ہو گئی۔

شہزاد کی شادی بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ ننھا عامر بھی موجود تھا۔ لیکن بڑی حویلی سے رخصت ہو کر چھوٹی حویلی میں چلی گئی تھی جسے اعلیٰ پیمانے پر آراستہ کر دیا گیا تھا۔ اور..... عقبی لان کے ایک گوشے میں کھڑا ذیشان..... نہ جانے خلاء میں کیا گھور رہا تھا.....!

☆.....☆.....☆

## آدم خور گھوڑا

انتخاب: محمد حمزہ

اور پھٹا ہوا تھا۔ لباس ریزہ ریزہ تھا اور چہرہ اتنا مسلا جا چکا تھا کہ اس کے دانت بھی بد وضع ہو گئے تھے۔ اس کے لمبے گھنے بال جو کچھوں کی صورت میں سڑک پر پڑے تھے، خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسا دلدوز منظر تھا جسے ہر کوئی رک کر دیکھنے پر مجبور تھا۔

ہم وہاں سے آگے بڑھے تو دیکھا کہ لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے اندر سے بند کر رکھے ہیں۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لوگ سہمے ہوئے ہوں۔ ہمیں اس عورت کی لاش کے پاس گزرے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ہم نے شاہی محل کے دستے کھڑے دیکھے۔ میں نے پوچھا: ”کیا معاملہ ہے؟“ جواب ملا: ”آدم خور گھوڑا کھل گیا ہے۔ صاحب! اپنی حفاظت کا خیال کریں۔ وہ بالکل جنگلی اور وحشی گھوڑا ہے۔“

میں نے ایک خونخوار گھوڑے کے بارے میں پہلے سے سنا ضرور تھا جو بادشاہ کی ملکیت تھا، لیکن اس کو دیکھا نہ تھا۔ پھر دور سڑک کے کنارے معاوہ وحشی گھوڑا نظر آیا۔ یہ بڑی جسامت کا ایک توخمند گھوڑا تھا۔ ہم جونہی اس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک بچے کو منہ میں دبائے کھڑا ہے اور اسے بے رحمی سے ادھر ادھر جھٹکے دے رہا ہے مگر درحقیقت وہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

اگلے لمحے اس نے منہ میں دبائے بچے کو ایک طرف پھینک دیا۔ بچہ مر گیا۔ اب گھوڑا پورے وحشیانہ انداز میں ہم پر حملہ کرنے کے لئے دوڑتا آ رہا تھا۔ ہمارے ادھر گھوڑے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ ہمیں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ ہم خوف کے مارے اپنی کبھی کی طرف لوٹے اور اتنی تیزی سے بھگی دوڑائی جیسے وہ فضا میں پرواز کر رہی ہو۔ پٹ پٹ کرتی ہماری گھوڑا گاڑی لمحوں میں سلاخی دروازے تک پہنچ گئی۔ جہاں سے کچھ ہی دیر پہلے ہم گزر کر آئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہونے کے باوجود وہ جانوروں سے ختم کھاتا ہے۔ ہاتھی اور گینڈا دو ایسے جانور ہیں جن کو آج تک کسی شیر نے ہلاک نہیں کیا۔ باقی سب شیر کا شکار بن جاتے ہیں۔ وہ جنگلی گھوڑے کو بھی ہلاک کر سکتا ہے تو پالتو گھوڑے کو ہلاک کرنا اس کے لئے کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ بادی انظر میں گھوڑے اور شیر کا مقابلہ ہی کیا..... لیکن میں آپ کو ایک ایسی تاریخی اور حقیقی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو گھوڑے کی شیر پر فتح کی داستان ہے۔

اس داستان کا تعلق لکھنؤ کے ایک نواب کے اصطبل سے ہے۔ اصطبل کے ساتھ ہی نواب صاحب کے پاس پورا چڑیا گھر بھی تھا جس میں خونخوار شیروں کے بنجرے تھے۔ نواب صاحب، جنہیں اس زمانے میں شاہ یا بادشاہ کہا جاتا تھا، اپنے فارغ اوقات میں ان جانوروں کی حرکات و سکنات سے لطف اندوز ہوتے تھے..... یہ کہانی ولیم نائنمین نے اپنی مطبوعہ کتاب پرائیویٹ لائف آف این الیٹرن کنگ (ایک مشرقی بادشاہ کی نجی زندگی) میں درج کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

میں بھی میں سوار ایک صبح لکھنؤ کی ایک بہترین سڑک سے گزر رہا تھا اور میرا ایک ساتھی بھی میرے ہمراہ تھا۔ ہم بادشاہ کے محل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جونہی ہم آگے بڑھے، گلیوں کی سنسانی دیکھ کر حیران ہوئے۔ دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر کوئی مرد یا عورت نظر بھی آتی تو تیزی سے سڑک عبور کر کے بھاگتی دکھائی دیتی۔

آخر کار یونہی چلتے چلتے ہم ایک جھوم کے پاس آ گئے جو ایک لاش اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ انسانی لاش لگ رہی تھی۔ ہم نے اسے دیکھنے کے لئے بھی روکی۔ یہ قریب کی گلی میں رہنے والی ایک عورت کی لاش تھی جو بری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ اس کا جسم ہر جانب سے کچلا

ہوئی اور میں نے جہاں پناہ کو تھاقت سے آگاہ کیا۔ جہاں پناہ نے بتایا کہ انہوں نے بھی اس گھوڑے کے بارے میں اکثر سنا ہے۔ وہ غصیلہ وحشی گھوڑا ہے اور شیر سے زیادہ خوفناک ہے۔ بادشاہ میری باتوں کو سن کر کچھ زیادہ متعجب نہ ہوا، تاہم جب میں نے زور دے کر اس آدم خور گھوڑے کو ختم کرنے کی بات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس طرف دھیان فرمائیں کہ ان کی رعایا میں اس گھوڑے کی وجہ سے کس قدر خوف و ہراس پھیلنا ہوا ہے تو وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ اس وحشی کا مقابلہ حال ہی میں پکڑ کر لائے جانے والے ایک شیر سے کرایا جائے۔ یہ شیر کچھ روز پہلے قریب کے ایک جنگل سے پکڑ کر لایا گیا تھا اور اس کا نام ”بروہا“ تھا۔ مقابلے کے لئے جمعے کا روز مقرر ہوا۔

وہ ایک چمکتی شفاف صبح تھی۔ ہم ایک صحن کی گیلری میں جمع ہوئے جو 60 گز مربع رقبے میں واقع تھی۔ یہ ایک ایسا احاطہ تھا جس کے ہر طرف عمارتیں تھیں اور اس کے نیچے ایک برآمدہ تھا۔ بانسوں کی گھنی فسیل برآمدے کے سامنے بنی ہوئی تھی جس نے مکمل طور پر احاطے کو دائرے کی شکل میں گھیر رکھا تھا۔ اس طرح یہ ایک طرح کا بہت بڑا پنجرہ معلوم ہوتا تھا۔ آدم خور گھوڑے کو ایک گھوڑی کے ذریعے لپکا کر اس جگہ لایا گیا۔

بادشاہ، عوام، نوکر چاکر، عورتیں اور لڑکیاں سب گیلری میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بادشاہ ایک صوفے پر ایک ادائے خاص سے براجمان تھا۔ جہاں پناہ کو خدمتی عورتیں چٹائی سے بنے پتھروں سے ہوا فراہم کر رہی تھیں۔ بعض کے ہاتھوں میں مور کے پروں کے بنے مورچے موجود تھے۔ دیکھنے میں یہ خوبصورت اور شاندار منظر تھا متحرک گورے بازو جو کندھوں تک عریاں تھے، زیورات سے مزین تھے اور نگین کلائیوں میں پٹھے جھلانے کے ساتھ ساتھ بھی اوپر اور کبھی نیچے حرکت کر رہے تھے۔ نگین ٹھکنے کی آواز بہت دلکش تھی۔ باقی لوگ ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم جہاں پناہ کے دائیں اور بائیں کھڑے تھے اور صوفے پر بٹھکے ہوئے تھے۔ صحن کا منظر واضح اور

آدم خور گھوڑا پورے زور سے ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ ہم اس کے پاؤں میں لگے لوہے کے نعلوں کی آواز بخوبی سن رہے تھے۔ ہم ایک احاطے میں پہنچ کر اس کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ میرا دوست بھی مجھی سے نیچے اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ یہ تمام ایکشن ایک منٹ میں کیا گیا۔ خوش قسمتی سے دروازے میں بھاری چٹنی لگی ہوئی تھی جسے اندر سے بند کر دیا گیا اور یوں ہمیں مستقل حفاظت فراہم ہو گئی۔

آدم خور گھوڑا اپنے بھاری قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا سر بھی خون آلود تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے خون کی رالیں بہہ رہی تھیں۔ سلاخی احاطے کے پاس پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنی سلاخوں کے باہر سے ہمیں دیکھنے لگا۔ اس کے کان بالکل کھڑے اور تنے ہوئے تھے۔ نتھنے پھولے ہوئے اور وہ خونخوار آنکھوں سے ہنسنے لگا۔ ہمیں دیکھ رہا تھا۔ آدم خور گھوڑا بہت غضبناک لگ رہا تھا۔ ہمارا بھی میں جتا گھوڑا آدم خور گھوڑے کی خوفناک ہنہناہٹ سے کانپنے لگا۔ وہ یوں کانپ رہا تھا جیسے شدید سردی کی وجہ سے ٹھہر رہا ہو۔

آدم خور گھوڑا کبھی اپنی سلاخوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر جاتا اور کبھی واپس آتا، چونکہ یہ سلاخیں خاصی موٹی، سخت اور مضبوط تھیں، اس لئے وہ احاطے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو چکا ہے تو اس کے ارد گرد گھومنے لگا۔ وہ اچھل اچھل کر پھیلی ٹانگیں نعلوں سمیت زور زور سے سلاخوں پر مارتا رہا۔ پھر گردن اکڑائے، کانوں کو تانے، سڑک کے زیریں حصے کی جانب بھاگ گیا جہاں ایک خراب سی بنی ہوئی تھی۔ کئی ایک گھڑ سوار پھندا اٹھائے یہاں اس کا انتظار کر رہے تھے، چنانچہ پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا گیا۔ ہم اندازہ لگاتے رہے کہ اس غریب عورت اور بچے کو لوگوں نے اب تک وہاں سے اٹھا کر دفن کر دیا ہوگا۔

اسی شام کے کھانے پر میری ملاقات بادشاہ سے



صاف تھا۔

بروہا تین سے پانچ منٹ تک گرم گرم خون کے گھونٹ پی کر لطف اندوز ہوتا رہا لیکن آدم خور گھوڑے کی جانب اپنا سر کیے اور آنکھیں اس پر جمائے رکھیں۔ اس دوران آدم خور گھوڑے نے بھی اپنی جانب سے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ آگے بڑھائی ہوئی گردن، کھڑے کانوں، ٹمٹکی باندھی نظروں اور بھٹکتی ہوئی دم کے ساتھ وہ ارادتا اپنے دشمن کو دیکھتا رہا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی فوری ایکشن کے لئے تیاری کر رہا ہو۔

آخر کار بروہا مطمئن ہو گیا۔ اب اسے اپنی زبان سے خون چاٹنے میں کوئی مزہ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے نیچے مردہ جانور کی گردن سے باہر کھینچ لیے اور اس کے جسم کو دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ پھر وہ صحن کی جانب بڑھا، بالکل اس طرح جیسے بلی چوہے پر حملہ کرتے ہوئے چلتی ہے۔ اس کی چال آہستہ اور بے آواز تھی۔ اس کے بڑے بڑے نیچے آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے کندھے یکدم اوپر اٹھائے اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کھال بھی آگے اور کبھی پیچھے حرکت کر رہی ہو اور کھال کا تعلق جیسے ہڈیوں اور ہڈوں سے برائے نام ہی ہو۔

بادشاہ اور دوسرے تماشاخی ہمہ تن محو تھے۔ آدم خور گھوڑا صحن کے وسط میں کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ دائیں جانب مڑ رہا تھا۔ شیر نے سر گھمایا اور اس کے ساتھ ساتھ بلی کی طرح دیک کر مزید کچھ آگے بڑھا۔ اس کے اس طرح چلنے سے کوئی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی، مگر آدم خور گھوڑے کے پاؤں کے آہنی نعلوں کی آواز ضرور آ رہی تھی، جن کو وہ کبھی اوپر اٹھاتا اور کبھی نیچے پٹختا دیتا۔

آخر کار شیر بلی کی سی تیزی سے اپنے دشمن آدم خور گھوڑے پر حملہ آور ہوا۔ ادھر گھوڑا بھی پوری طرح تیار تھا۔ اس نے پھرتی سے اپنے سر اور کندھوں کو بہت تیز حرکت دے کر اپنے دشمن پر ایک زوردار دھڑکی رسید کر دی جس سے شیر کا جبرائٹ ٹوٹ گیا اور وہاں سے گوشت لٹکنے لگا۔ اس وقت شیر کے پچھلے پاؤں کی گرفت گھوڑے کی اگلی ٹانگوں پر تھی مگر اسے توازن برقرار رکھنے میں دشواری ہو

بادشاہ نے احکام جاری کیے اور شیر کا پنجرہ برآمدے میں لایا گیا۔ ایک دروازہ جو بانسوں کی فصیل کا بنا ہوا تھا، اوپر کھینچ کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اب بروہا شیر اس صحن میں تھا۔ وہ اپنی لمبی دم اپنے جسم پر مار رہا تھا۔ دوسری جانب قریب ہی آدم خور گھوڑا غصے سے اسے ٹمٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بہت شیر دیکھے ہیں لیکن پورے ہندوستان میں بروہا شیر سے خوبصورت شیر تلاش کرنا شاید آسان نہ ہو۔ اس کی چمکدار کھال اور رنگین دھاریاں پورے احاطے کو جگمگا رہی تھیں۔ نگاہ تھی کہ اس کے جسم پر پھسل پھسل جاتی تھی، مگر گھوڑے کا رنگ مدھم تھا اور اس کی کھال بھی اتنی صاف نہ تھی۔ وہ شیر کے سامنے بھلا کیسے خوبصورت لگ سکتا تھا۔

اس آدم خور گھوڑے کو دبوچنے کے لئے شیر کو پچھلے ایک دن سے بھوکا رکھا گیا تھا تاکہ بھوک کی وجہ سے اس کا حملہ شدید ہو اور وار خالی نہ جائے۔ اس نے گھوڑے پر جارحانہ انداز میں نظر ڈالی اور گھات کے انداز میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس دوران آدم خور گھوڑے نے بھی مکمل طور پر اپنی نظریں اپنے دشمن پر جمائے رکھیں، البتہ اپنا سر نیچے کیے رکھا اور بے صبری سے ایک قدم آگے بڑھائے کھڑا رہا۔ وہ بروہا کے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔

جہاں تک غریب گھوڑی کا تعلق تھا، جو اس گھوڑے کو لپکانے کے لئے لائی گئی تھی، دہشت سے مبہوت تھی۔ وہ بروہا اور آدم خور گھوڑے کی متوازی لائن میں کھڑی کانپ رہی تھی اور سبھی ہوئی اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ اچانک ایک ہلکی سی چھلانگ لگا کر شیر گھوڑی تک پہنچ گیا اور نیچے کے ایک ہی وار سے اسے زمین پر چت گرا دیا اور تیز نوکیلی دانت اس کی گردن میں اتار دیئے اور خون پینے لگا۔ بادشاہ یہ منظر دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھوڑی کا خون پی کر شیر کی اشتہا اور بڑھ جائے گی۔ وہ خوشی سے اپنے ہاتھوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ یورپین اور درباری عورتیں بھی محظوظ ہو رہے تھے اور بادشاہ کی مسکراہٹ میں شریک تھے۔

رہی تھی، معاً گھوڑا ہوا میں سیدھا ہوا اور خوفناک آواز سے ہنہنایا۔ شیر زمین پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ ہم بمشکل یقین کر سکتے تھے کہ اسے پشت کے بل پھینک دیا گیا ہے۔ جب وہ دوبارہ اٹھا تو پہلے کی طرح ادھر ہی گھومنے اور دبک کر حرکت کرنے لگا جیسے کہ کچھ ہوائی نہ ہو۔

پھر ایک غضبناک ہنہناہٹ کے ساتھ آدم خور گھوڑا اپنی پہلی پوزیشن میں آیا اور دولتی مارنے کی تیاری کرنے لگا۔ تماشا بینوں کا خیال تھا کہ یہ دولتی شیر کی کھال ادھیڑ دے گی، مگر بادشاہ کی سوچ مختلف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شیر اب گھوڑے کو مار دے گا۔ شیر بلی کی طرح ارد گرد قدم رکھ رہا تھا۔ اس کا چوڑا گول سر ہوشیار اور چوکس دشمن کی طرف مڑا۔ اس کا ہر قدم بغیر کسی آواز کے اٹھ رہا تھا۔ اب دوبارہ پھولے منتھوں اور شعلے اگتی آنکھوں سے آدم خور گھوڑے نے پوزیشن لی۔ سر اور گردن پیچھے جھکائے اور پھر گردن آگے بڑھائی، کان اکڑائے اور آنکھیں نمکنکی کی صورت میں دبک کر آنے والے شیر کی طرف کر لیں۔ اس نے کندھے، سر اور اگلے پاؤں کو ہلکا سا آگے بڑھا یا تاکہ دولتی مارنے میں آسانی ہو۔

آٹھ پاؤں منٹ تک بدو یا شیر گھوڑے کے گرد گھیرا ڈالتا رہا اور گھوڑا بھی گھوم گھوم کر اپنی پوزیشن بڑھاتا رہتا رہا۔ شیر آہستہ آہستہ دھاڑتا رہا اور غراتا رہا اور گھوڑا بھی آہستہ آہستہ ہنہناتا رہا۔ شیر نے اپنا جبراً بمشکل ہی کھولا۔ گھوڑی کے خون کے چند قطرے جو ابھی تک اس کے ہونٹوں پر جمے ہوئے تھے، اس نے چائے اور مردہ گھوڑی کی طرف دیکھا جیسے وہ خون کے چند اور گھونٹ پینے کا ارادہ رکھتا ہو، لیکن یہ ایک لمحے کے لئے تھا.....

پھر وہی اکتادینے والی چال اور پھیرے شروع ہو گئے۔ آخر کار شیر مردہ گھوڑی کی لاش کے اوپر کھڑا ہوا اور چھلانگ لگائی۔ یہ اتنی اچانک تھی کہ ہم سب گیلری میں بیٹھے اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ آدم خور گھوڑے کے لئے یہ خطرے کا اعلان تھا۔ ایسے لگا جیسے کسی برقی قوت نے شیر کو اوپر اٹھایا ہو۔

تاہم گھوڑے کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ اس کا سر

پہلے سے بھی نیچے جھکا ہوا تھا، مگر شیر کے جڑے ٹوٹ کر ناکارہ ہو چکے تھے، اس کا دوسرا اور بھی پہلے کی طرح خطا گیا۔ شیر کا بڑا سا سر گھوڑے کی دم کے پاس ایک لمحے کے لئے رکا۔ پھر اس کے جڑوں کا پچھلا حصہ گھوڑے کی چھاتی پر جا پڑا۔ اگلے ہی لمحے شیر گھوڑے کے اوپر سوار تھا۔ ایک ٹائیپے کے لئے ہم نے گھوڑے کو بے سکون دیکھا۔ شیر گھوڑے کی پیٹھ پر اپنا پیٹ رکھے آگے بڑھ رہا تھا کہیں گھوڑا اسے پیٹ کے بل گراندے۔ پھر وہی ہوا۔ اس نے جسم کی ایک پھر تیلی جنبش سے شیر کو نیچے گرا دیا۔ اس کے آہنی نعلدار پاؤں ایک تباہ کن قوت کے ساتھ شیر کے منہ پر پڑے اور جنگل کا بادشاہ ایک مرتبہ پھر زمین پر پاؤں پھیلائے یا رومد دگار پڑا تھا۔

شیر کچھ دیر اسی طرح پڑا رہا۔ جب وہ کچھ سنبھلا تو اس نے بانسوں کے احاطے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دوڑنا شروع کر دیا۔ اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ شیر مزید حملہ نہیں کرے گا۔ وہ صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔ اس کا جبراً ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی دم ٹانگوں کے درمیان تھی۔ اس کی حالت اس کتے کی طرح تھی جس کے بال نیچے کی جانب گرے ہوئے ہوں۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا اور بے بسی سے آدم خور گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے کراہنے پر لوگوں کو ترس آ رہا تھا۔ بادشاہ بھی اس کی پکار سن رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا ہم شیر کو بجا سکیں گے؟ پھر بادشاہ کے اشارے پر پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا اور شیر دوڑ کر اپنے پنجرے کے کونے میں اس طرح جا بیٹھا جیسے اس نے اپنے آپ کو اندر دفن کر لیا ہو۔ آدم خور گھوڑے نے فاتحانہ انداز میں اپنے اگلے پاؤں اٹھائے اور زور سے ہنہنایا۔ پھر گھوڑی کو سونگھ کر وہاں سے پیچھے ہٹ گیا۔ سر کو بلند کیا اور دم کمان کی طرح بنا کر احاطے میں دلی چال چلنے لگا جیسے تماشا بینوں پر اپنی فتح کی دھاک بٹھا رہا ہو.....

بھوکے شیر پر گھوڑے کی یہ فتح افسانہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ہم سب یقینی شاہد تھے۔

☆.....☆.....☆

## بشری مسرور ..... ایک ہمہ جہت شخصیت

تحریر: غضنفر علی شاہد

تھا۔ میری نظر میں ان کے خطوط کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ بشری مسرور نے کبھی شوخ بیانی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کبھی اپنے آپ کو بڑا رائٹر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی تحریروں کو سراہا اور ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

بشری مسرور کی شخصیت کا نمایاں پہلو اس وقت میرے سامنے آیا۔ جب انہوں نے ماہنامہ ریشم کا مکمل چارج سنبھالا اور اس کا دفتر کراچی سے لاہور منتقل کیا۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا بلکہ ایک دلیرانہ اور مدبرانہ فیصلہ تھا۔ ایسا فیصلہ کوئی بڑا دل گروے والی اور دور اندیش شخصیت ہی کر سکتی ہے۔ بظاہر یہ فیصلہ عاقبت نا اندیشانہ سا لگتا تھا کیوں کہ صرف کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامے کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ اب تک لاہور سے شائع ہونے والا کوئی ماہنامہ ترقی کی ایسی منزلیں نہیں طے کر سکا تھا کہ اس کو کراچی سے شائع ہونے والے ماہناموں کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔

بشری مسرور نے ریشمی قلم کاروں کی ٹیم کے قائد کارواں کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں اور ماہنامہ ریشم کی ترویج و ترقی کے لئے سرگرم عمل ہو گئیں۔ کسی ماہنامے کا اجراء کرنا اور اسے کامیابی کے ساتھ چلانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ لاہور سے کامیابی کے ساتھ ماہنامے کو چلانا بشری مسرور کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ جلدی ہمت ہار جائیں گی۔ ان کی شانہ روز محنت اور ریشم کی روز افزوں ترقی نے سب لوگوں کے اندازے غلط ثابت کر دیئے۔ آج لوگ انگشت بدنداں ہو کر ریشم کو

ماہنامہ ریشم کی شینگ ڈائریکٹر محترمہ بشری مسرور کو تحریروں کے حوالے سے میں گزشتہ بارہ سالوں سے جانتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے ماہنامہ ریشم نے کراچی سے ایک نوزائیدہ ماہنامے کی حیثیت سے منظر عام پر آنا شروع کیا تھا۔ یہ ماہنامہ ریشم کے ابتدائی قلم کاروں میں سے ہیں۔

میں ان دنوں بیرون ملک کی طویل ملازمت ختم کر کے نیا نیا پاکستان آیا ہوا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے ابھی تک کسی میگزین کے لئے لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ایک دن میرے دوست ساجد نجمی نے ماہنامہ ریشم کا شمارہ میرے ہاتھوں میں تمھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس کے لئے لکھنا ہوگا“ یہ ماہنامہ ریشم کا ابتدائی شمارہ تھا۔ یوں ہمارا ریشمی سفر ساتھ ساتھ ہے۔

ماہنامہ ریشم کراچی کے دور میں بشری مسرور کی شائع ہونے والی تحریروں پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح طور پر ذہن میں آتی ہے کہ بشری مسرور قلم کاری کے میدان میں طفل مکتب نہیں بلکہ اس میدان کی مایہ ناز شہسوار ہیں اور طویل ادبی سفر طے کرنے کے بعد ریشم کے بچپن ہیں۔ خاص طور پر ان کے افسانے روایتی ڈگر سے ہٹ کر جدید رجحانات کے حامل ہیں..... ان کے تحریر کردہ افسانے قارئین کے ذہنوں پر ایک گہرا اور دور اثر مرتب کرتے ہیں۔

ریشمی محفل جو ان دنوں سیما کی محفل ہوا کرتی تھی۔ اس میں بشری مسرور یا قاعدگی سے تو نہیں البتہ دو چار ماہ بعد حاضری دیا کرتی تھیں۔ ان کی حاضری اتنی بھرپور ہوا کرتی تھی کہ غیر حاضری کا شکوہ خود بخود دور ہو جاتا

## وہ کیا تھا سب کچھ

عجیب منظر ہے بے رخی کا

کہاں وہ وعدے، کہاں وہ الفت

جو ہنتے ہنتے تیرا محبت سے

ٹیلھے سر میں وہ مجھ سے کہنا

تمہارے چہرے کی آرزو میں

ہجوم خلقت کو دیکھتا ہوں

میری تو دنیا، میرا اثاثہ

تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ

تمہاری آواز کی بہاریں

محبتوں کے قصیدے گانا

وہ تیری ہستی کا عادی ہونے کا دعویٰ کرنا

وہ کر کے غصہ، دکھا کے نخرے

وہ لڑ کے مجھ سے جو روٹھ جانا

وہ کیا تھا سب کچھ

جو مجھ کو رونے پہ ڈانٹ دینا

وہ چاہتوں کے دلا سے دے کر

یہ کہنا مجھ کو کہ جان میری

میں ہوں تمہارا

وہ کیا تھا سب کچھ

﴿ہماشاہ، ہارون آباد﴾

ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

میری نظر میں بشریٰ مسرور میں ایک ایسی خوبی بھی

ہے جو اس مقام پر پہنچنے کے بعد بہت کم لوگوں میں باقی

رہ جاتی ہے۔ اکثر لوگ بلندی اور شہرت کے مقام پر پہنچ

کر مغرور اور خود غرض بن جاتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں

کو کم تر سمجھتے ہوئے ان کے قریب ہونا اپنی شان کے

خلاف سمجھتے ہیں اپنے ارد گرد مغروری کا مصنوعی حصار بنا

لیتے ہیں کہ نئے لکھنے والے ان کے پاس آنے سے

خوف کھاتے ہیں لیکن یہ ایک ایسی شمع فروزاں ہیں جس

سے نئے لکھنے والے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

بشریٰ مسرور نے ماہنامہ ریشم میں نئے لکھاریوں کو

متعارف کرانے کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ ان

کی تحریروں کی نوک پلک درست کرتی ہیں۔ ان کو منظر عام

پر لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے ان کی یہ کاوشیں دیکھ

کر نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہن

اپنے بھائی کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھا رہی ہو۔ جیسے کوئی بڑی

باہجی اپنی چھوٹی بہن کو سلیقہ شعاری سکھا رہی ہو۔

ریشمی قلم کاروں میں بشریٰ مسرور کے بارے میں

عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ فون انیڈ نہیں

کرتیں اور نہ ہی ایس ایم ایس کا جواب دیتی ہیں۔ اس

سلسلے میں میری رائے کچھ مختلف ہے۔ میرے خیال میں

یہ ایس ایم ایس کا جواب دیتی ہیں۔ ہر وہ فون کال جو

دفتر کی وساطت سے ان تک پہنچے یہ ضرور جواب دیتی

ہیں۔ بوقت ضرورت یا کسی سلسلے میں اگر مشاورت

درکار ہو تو یہ از خود بھی رابطہ قائم کرتی ہیں۔

بشریٰ مسرور جیسی قائدانہ صلاحیتوں کی مالک اگر

نینجنگ ڈائریکٹر ہو۔ ریشمی لکھاریوں جیسی ٹیم ساتھ ہو اور

محنت و تن دہی سے کام کرنے والا سٹاف موجود ہو تو ریشم

جیسا ڈائجسٹ دن دگنی اور رات چٹکنی ترقی کیسے نہیں

کرے گا۔

☆.....☆.....☆.....☆

## فورت مشرو

خالد محمود بھٹی

گئے، تالاب جو پڑ سوکھ گئے، کنویں سوکھ گئے، سوکھ گئے اک ماں کے ارماں، سوکھ گئے اس کے آنسو..... ماں کے بس میں نہیں کہ اتاروئے، اتاروئے..... کہ اس کے آنسوؤں سے ٹوبے بھر جائیں، کنویں بھر جائیں تاکہ مویشی پیاس بجھا سکیں..... کیونکہ ماں جانتی ہے کہ ایک روہیلے کو اپنی پیاس سے زیادہ اپنے ڈھور ڈنگر کی پیاس عزیز ہوتی ہے..... وہ اپنے مویشیوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے..... اور مویشی ہی اس کی آن بان شان سمجھ جاتے ہیں..... اور انہیں کی بدولت وہ اپنے سر پہ شملہ اونچا سمجھتا ہے۔ سیاہ گھنٹھور گھٹا آسمان پر چھا جائے اور رحمت کی بارش اپنی تمام تر مہربانیوں کے ساتھ برسے تو..... روہیلی بیٹیوں کی خوشیوں کے شادیانے بجنے لگتے ہیں۔ شہنائیاں گونج اٹھتی ہیں..... ڈولیاں ج دھج کر اپنے دامن میں خوشیاں سمیٹ لیتی ہیں۔

صحرا بڑا صابر ہے..... روہی کے انسانوں کی طرح ٹھوڑے سے پانی سے اپنی بھی پیاس بجھاتا ہے اور کئی عرصے تک لوگوں کے سوکھے لب جو پھنپھن پوں کی طرح دھوپ سے جھلس کر مرجھا گئے ہوں ان کو بھی سیراب کرتا ہے۔

دیکھو..... ذرا ان کے بوڑھے جھریوں زدہ چہروں کی طرف دیکھو کتنا حوصلہ عیاں ہو رہا ان کے چہروں سے کتنی مضبوط گٹھے ہوئے ہاتھ ہیں باوجود بڑھاپے کے..... ان کے قدموں میں لرزش نہیں۔ کجا کہ ان کو کئی کئی میل مسافتیں طے کرنی پڑیں۔ ان کے حوصلے بلند ہیں۔ ان کے قدم ڈمگاتے نہیں..... ریت میں دھنستے ضرور ہیں مگر جب ریت سے باہر نکلتے ہیں تو ایک نئے عزم اور نئے دلولے کے ساتھ..... اک نئی امید اور اک نئی کرن کے ساتھ یہاں کا سورج سرخ تھل کی مانند جب پہلی ریت کے نیلوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے تو

## روہی اور بہاولپور

سفر کا آغاز کرنے سے پہلے بہاولپور کا تاریخی پس منظر کے حوالے سے جائزہ لینا از حد ضروری ہے۔ بہاولپور کا خطہ تاریخی و مذہبی حوالے سے عظیم تر روایات کا امین رہا ہے۔ یہ زمین ایک وقت میں سات دریاؤں ہاکثرہ کھلی سرسوتی بیاس ستلج چناب اور دریائے عظیم سندھ کی گزرگاہ ہونے کے ناطے برصغیر میں سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب رہی ہے۔ اس کے کھیت، کھلیان اپنی مثال آپ تھے۔ اس کی سرسبزی و شادابی کئی کئی میلوں تک آنکھوں میں اپنی کشش و جاذبیت کے ڈیرے جمائے ہوئے تھی۔ سات دریاؤں کے سنگم میں یہ سرزمین اپنی لہلہاتی فصلوں اور سکی مصنوعات میں اپنی ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ خشک دریائے ہاکثرہ کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ تین سو میل کی لمبی پٹی میں موجود چار سوسات آثار قدیمہ دریافت ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس علاقے کو قدیم ہاکثرانی تہذیب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جس کی مدت تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح سے تین ہزار قبل تک کے دور سے منسلک ہے۔ سوئی و ہار کے علاقے میں بدھ مت کا اسٹوپا جو کھنکا دور 120ء تا 149ء میں ایک عظیم یونیورسٹی کا درجہ رکھتا تھا ایک مینار کی شکل میں آج بھی اس دور کی یاد تازہ کر رہا ہے..... رجیم یار خان میں موریا دور 321ء ق م..... تا 184 ق م کے بدھوں کی ایک اور عمارت پٹن مینارا کے نام سے آج بھی اپنی حیثیت میں موجود ہے۔

صحرائے بہاولپور ریتیں زمین اور سرسبزی و شادابی کی وجہ سے مشہور و معروف ہے..... جس میں سات دریا اپنی آب و تاب سے بہتے تھے۔ جب دریائے ہاکثرہ خشک ہو گیا تو اس سرزمین کے باسیوں کی ساری آس امید بارش پر جم گئی۔ بارش نہ برسی تو ٹوبے سوکھ

روہی کی گواہوں میں..... جھوٹوں میں..... اک نضی سے لوجل اٹھتی ہے۔ اک دیپ کی مانند، چراغ کی صورت یہ چراغ اپنی نغماتی روشنی میں ایک نئی زندگی کا درس دیتا ہے..... جس میں ہمت اور حوصلہ کا جاگر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریا خشک ہو گیا مگر ان کے حوصلے نہیں ٹوٹے۔ دریائے ہاکڑا کے ساتھ ساتھ دیگر دریاؤں کی تقدیر کے فیصلے بھی ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے رخ بدلے..... اس طرح اس علاقے کا بیشتر حصہ چولستان میں تبدیل ہو گیا۔

چولستان کو سرائیکی میں روہی..... اور وہاں کے باشندوں کو روہیلے کہا جاتا ہے۔ ”روہ“ کے معنی پہاڑ کے ہیں اور اس کے آخر میں ”یائے“ نسبتی ہے۔ یعنی پہاڑوں والی..... یا پہاڑ جیسی شکل و صورت والی۔ چنانچہ روہی کے نیلے بلند و بالا اور پہاڑوں کی طرح مخروطی شکل کے ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے اسے روہی یعنی پہاڑوں جیسی شباہت والی کہا گیا ہے۔ چولستان کو روہی پکارنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لفظ ”روہ“ مذکر ہے اور روہی اپنے نرم و نازک ریت کی وجہ سے مونث ہے اس کی آخری ”ی“ تانیث والی ہے..... لہذا روہ اور روہی آپس میں گہری مناسبت اور مطابقت رکھتے ہیں..... مزید برآں اگر ہم اس کی وضاحت کریں تو پتہ چلتا ہے کہ معنی کے اعتبار سے روہی اپنے اندر نہ صرف بے پناہ وسعت رکھتی ہے بلکہ ایک روہیلے کے جذبات کی بھرپور عکاسی بھی کرتی ہے..... روہی صرف ریت کے ذروں کا نام نہیں..... روہی نام ہے پیاس کا..... جس کی پیاس صرف ساون کی بارش ہی مٹا سکتی ہے۔ برس پڑے تو اس کی حدت و گرمی بھاب بن کراڑ جانی ہے۔ ورنہ ریت کے ذروں سے نکلتی ہوئی گرمی..... لاوا بن کر ابل پڑتی ہے۔ اس کی دھرتی جتنی نرم ہے، اندر سے اتنی ہی سخت..... کبھی کبھی یہ ریت کے ذرات وفاؤں کے موتی بن کر لڑی کی صورت پوری روہی کے گرد بکھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی معصوم بچوں کے سوکھے لب..... بہنوں کے سر سے سرکتا ہوا

آنجل..... باپ کی امید کی آخری کرن..... ماں کی خالی آغوش میں آرزوں کے دیپ جلاتے نظر آتے ہیں بارش کی صورت میں..... اے روہی..... تو کبھی ویران نہ ہوگی کہ تیری دھرتی پر ماؤں نے ایسے انسان بھی بنے ہیں جن کے علم و عرفان سے اس روہی کی تاریکی جگنو کی طرح روشن ہو کر بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا رہی ہے۔

فقط یاد رہا اک نام مجھے  
دین کا دیا پیغام مجھے  
جب بھی بن پڑے کوئی مشکل  
حکم ملا ذکر کا قحج و شام مجھے

اسی طرح ”چولستان“ کو چولستان کے نام سے اس لئے پکارا جاتا ہے کیونکہ یہ لفظ چول اور استھان سے مرکب ہے..... سرائیکی میں چول کے لفظی معنی ہلنے چلنے یا حرکت کرنے کے ہوتے ہیں۔ چونکہ روہی کے نیلوں کی ریت آندھیوں اور ہوا کے طوفانوں کے باعث..... جو ہمہ وقت اس ریگستان میں برپا رہتے ہیں متحرک رہتی ہے اور ہوا کی وجہ سے نیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی ہو جاتے ہیں..... اسی لئے اسے چولستان کہا جاتا ہے لفظ چول کے آخر میں استھان طرف مکالم ہے۔

اسی چولستان کے 13000 مربع میل بارانی علاقے میں بہاولپور کا بطور ریاست قیام 1727ء میں مغل حکومت کے دور میں آیا اور امیر صادق خاں اس کے پہلے حکمران قرار پائے جن کا تعلق بغداد کے خلفائے عباسیہ سے تھا اور جن کی شاخ کا کافی عرصہ سندھ میں حکمران رہی۔ اس سے پیشتر کہ ریاست بہاولپور کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے اس خاندان عباسیہ کے سیاسی مذہبی و تمدنی اور سماجی پس منظر پر کچھ بیان کرنا از حد ضروری ہے۔ بغداد سے ہجرت کرنے کے بعد عباسیہ خاندان مختلف ادوار میں نہ صرف سندھ بلکہ موجودہ پنجاب کے کافی اضلاع کا حکمران رہا۔ بغداد چھوڑنے کے بعد..... اس خاندان کا قیام کمران (بلوچستان) میں جہاں ان کی حیثیت مذہبی پیشواؤں کی تھی ان میں میاں اضافہ سرفہرست ہیں جن کو روہی زبان میں ”ادھانہ“ کہا

سلطنت ہائے بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک اور لکسمبرگ  
شرمائیں..... ابھی تک غیر معروف اور گمنامی کے عالم  
میں ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے..... یہ چمکتے و  
دستے لقی و دق صحرا مسخو کن سراب..... سرسبز و شاداب  
نخلستان..... اور لہلاتے ہوئے کھیتوں کی سر زمین ہے۔  
جس کی عظمت دیرینہ کے نشانات دریائے گھگر کے خشک  
پاٹ کے کنارے..... قلعہ ڈر اور مروٹ اور فورٹ  
عباس کے کھنڈرات میں محفوظ ہیں اور تہذیب سندھ  
کے زمانہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی روہی کی سر زمین  
سے کچھ روہیلے روہی کی نرم ریت سے نکل سخت پتھروں  
کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔

☆☆.....☆☆

## آغاز سفر

حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں..... اس کے دل کی  
اتھاہ گہرائیوں میں اس کے دماغ کے شعور و لاشعور  
میں..... غرض کہ اس کی لولو میں ہوتا ہے۔ اس لئے  
ہماری زمین بھی قدرت کے حسن سے بھری ہوئی ہے۔  
قدرت کے بے شمار نظارے جو ہماری آنکھوں کو خیرہ کر  
دیں۔ بکھرے ہوئے ہیں..... مگر افسوس کہ اس ترقی  
یافتہ دور میں ہمارے پاس وقت کی بھی کمی ہے۔ ہم  
بہت مصروف ہیں اور اس ترقی کی دوڑ میں آگے سے  
آگے نکلنا چاہتے ہیں..... اس سے بھی زیادہ افسوسناک  
بات یہ ہے کہ ہم اپنا مقصد حیات و مہمات تک کو بھول کر  
نئے نئے راستے اختیار کر رہے ہیں..... ان راستوں پہ  
چل کر ہم اپنے کھو جاتے ہیں کہ حق و صداقت، عدل و  
انصاف، سچائی و راست بازی ہمارے ہاتھوں سے ریت  
کے ذروں کی طرح پھسلتی ہوئی..... ہواؤں کی تیز و تند  
موجوں میں معدوم ہو جاتی ہے۔

خالق حقیقی نے..... انسان کو اشرف المخلوقات بنا  
کر اس دنیائے فانی میں بھیج دیا..... جہاں ہر آن  
قدرت کی تخلیق انسان کو مسخو کر رہی ہے..... سمندر،  
دریا، پہاڑ، جنگل، صحرا، نخلستان، گلستان یہ سب قدرت

جاتا ہے دوسرے بزرگ میاں آدم شاہ تھے جو اپنے  
وقت کے مشہور بزرگ میاں محمد مہدی کے مرید تھے۔

پندرھویں صدی کے وسط میں جن دو مذہبی  
راہنماؤں نے دریائے سندھ کے کنارے آباد ملکوں کی  
سیاست پر قبضہ کیا ان میں ایک آدم شاہ کلہوڑہ عباسی  
اور دوسرے سکھوں کے مرشد نانا صاحب تھے..... سندھ  
میں عباسیوں کا عروج کچھ اس طرح شروع ہوا کہ پہلے  
پہل انہوں نے مذہبی قیادت سنبھالی بعد میں ان کی  
اولاد زمیندار جاگیردار بن گئی..... اور آخر میں زیریں  
اور بالائی سندھ میں سیاست کی افرا تفری کا فائدہ اٹھا کر  
یہ وہاں کے حکمران بن گئے جب شہزادہ مراد ملتان  
آیا..... اسے عباسی خاندان کے پس منظر کا پتہ چلا..... تو  
اس نے اوباڑہ سے لاہوری بندر تک کا علاقہ انہیں دے  
کر اپنا نائب بنا لیا۔ امیر غنی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا  
امیر مہدی خاں اپنے والد کا جانشین بنا مہدی خاں کے  
انتقال کے بعد ان کا لڑکا امیر ابراہیم خاں عرف کلہوڑ  
خاں تخت نشین ہوا جس کے بعد ان کے چچا امیر داؤد  
خاں سے ان کی کشش کا آغاز ہوا اور عباسی دو گروہوں  
میں بٹ گئے..... امیر کلہوڑہ کی اولاد سندھ پر قابض  
ہوئی اور امیر داؤد کی اولاد نقل مکانی کر کے موجودہ  
بہاولپور کی حدود میں آ گئی۔ عباسیوں کی اس شاخ کے  
سربراہ امیر صادق محمد خان تھے۔ جو مخدوم بخاری و گیلانی  
کی دعوت پر پہلے پہل اوج میں قیام پذیر ہوئے وہاں  
سے انہوں نے گورنر ملتان سے رابطہ کر کے شکار پور کا  
علاقہ بطور جاگیر حاصل کیا اور الہ آباد شہر کی بنیاد رکھی۔  
امیر صادق خان 18 سال اس علاقہ پر حکمرانی کے بعد  
1745ء میں وفات پا گئے ان کے بعد ان کے بڑے  
صاحبزادے امیر محمد بہاول خاں تخت نشین ہوئے۔  
انہوں نے شہر بہاولپور کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا  
دارالحکومت بنایا۔

اب یہ خطہ نہ صرف سر زمین پاکستان کا ایک اہم  
حصہ ہے بلکہ پاکستان کا قلب عظیم یا ریڑھ کی ہڈی تصور  
کیا جاتا ہے..... جس کی وسعتیں یورپ کی نامور

کے فن پارے ہیں جو شاید ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی درخواست کر رہے ہیں کہ اے انسان ہمیں تمہارے لئے بنایا گیا ہے..... ذرا پلٹ کر ٹھہر کر..... دم بھر دیکھ لے ہم بے مقصد نہیں ہیں اور جب ان پر تھوڑا سا تفکر کریں تو انسان محو حیرت رہ جاتا ہے اور بے اختیار منہ سے ”سبحان اللہ“ نکل جاتا ہے۔ اسی طرح میرے اندر بھی قدرت کی تخلیق کو محو حیرت ہو کر دیکھنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا..... میں جب بھی تمام تفکرات سے ہٹ کر..... ایک تخیل پر یکسو ہوتا تو..... اس کا لطف ہی کچھ اور پاتا۔ وہ نظارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو کر میرے دماغ کے تمام پردوں کو ہٹا دیتا..... اور میں اس میں کھو جاتا۔ میں ایک روہیلا پر باسی تھی میری آنکھوں نے اس جھوک کے کئی ان مٹ مناظر دیکھے تھے۔ روہی کی پتی ریت پر غربت کے مارے ننگے پاؤں گرم ہوا کے دوش پر نقش ثبت کرتے جاتے اور ریت کے ذرات انہیں صحراؤں کی تیزی کی نظر کر دیتے تھے۔

کئی جھوکیں ویران اور اجاڑ ہوئیں..... ابر کرم نہ برسا تو روہی ایسی پیاسی ہو گئی کہ لہو بھی اس کی پیاس نہ بجھاسکے۔ ماؤں کے بیٹے اپنی کوہانوں پر اونٹوں کی طرح وزن لادتے صبح سے شام کر دیتے۔ پسینے میں خون کی آمیزش بھی شامل ہو جاتی..... جو ہڑوں میں انسان اور جانور اکٹھے پانی پیتے جیسے رنگ و نسل کا امتیاز ہی نہ ہو..... مگر اس کے باوجود جب سیاہ گھنگھور پادل گھٹا ٹوپ بن کر آتے تو یہ جھوک ایسے سج جاتی جیسے دہن..... اس پیاسی زمین میں زندگی کی ایک نئی لہر آ جاتی سارے جو بڑبھرجاتے۔ صحرا کئی مہینوں کا پانی اپنے اندر جذب کر کے صبر کر جاتا۔ جنگلی بوٹیاں، درخت، چرند، پرند گویا کہ زندگی میں سارے، گاما، پادا، نی، سا کے سارے سبھر جاتے..... ان آنکھوں نے صحرا کی سختی اور نرمی دونوں دیکھی تھیں..... اب یہ آوارہ گرد آنکھیں اس سے آگے کے جہاں دیکھنے کے لئے پرتول رہی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح مجھے کوچہ کوچہ پر بت پر بت آوارہ

گردی کرنے کا شوق تھا۔ میری بے چین روح کو کہیں قرار نہ تھا۔ اسی شوق سے سرشار دوستوں کے ساتھ بار بار ہانورٹ منرو گیا..... دل میں خیال آیا کہ اس قدرت کے شاہکار کو قلم بند کروں۔

مگر یہ سوچ کر خاموش ہو جانا کہ کام بڑا ہے اور میری عقل ناقص اور محدود..... سو کچھ عرصے بعد دوستوں کے اصرار پر سفر نامہ لکھنے کی جسارت کی تاک قدرت کے مناظر کی ادنیٰ سی جھلک پیش کر سکوں..... اس کے لئے دوستوں سے اظہار خیال کیا کچھ تو گھبرا گئے..... فورٹ منرو..... اوہو..... نہیں نہیں بہت مشکل ہے آپ بھی نہ جاؤ بڑا خطرناک سفر ہے..... وہ بھی موٹر سائیکلوں پر ذرا سی غفلت اور کام تمام..... اور کچھ نے سراہا بھی جب میں ملتان گیا تو میں نے شفیق آصف صاحب سے بات کی..... یہ ملتان کے نامور شاعر ہیں..... آپ نے نئی کتابیں لکھی ہیں..... ادب رنگ پبلیکیشنز کے نگران اعلیٰ ہیں۔ شفیق صاحب نے اس پروگرام پر کافی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ سفر تو کافی مشکل ہے وہ بھی موٹر سائیکلوں پر..... مگر انوکھا سفر ہوگا۔ بڑا دلچسپ رہے گا میں چونکہ کافی مرتبہ موٹر سائیکل پر جا چکا تھا..... اس لئے مجھے کچھ مشکل نہ لگتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے فرصت ملی تو ضرور جاؤں گا اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ جاسکا تو ہر جگہ آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گا۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ ویڈیو کیمرے کا تھا۔ مختیار انجم صاحب سے بات کی (یہ بی بی وی اسٹیج بھی کرتے ہیں) انجم صاحب نے کہا کہ میرا ڈرامہ کل رات 2:30 بجے ختم ہوگا ڈرامے کا آخری دن ہے۔ میں صبح فارغ ہو کر ڈائریکٹ ڈی جی خان 10 بجے پہنچ جاؤں گا اور آپ کا وہیں پر انتظار کروں گا۔ ان کے ساتھ باقی ضروری باتیں ہوئیں اور جمعرات طے پایا کہ دوپہر 2:30 بجے خواجہ صاحب کی روہی سے کوچ کر جائیں گے..... ریتلے پہاڑوں سے نکل کر پتھریلے پہاڑوں پر..... مگر کچھ لوگ عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ جیسے وہ مجھے کوئی ایب نارمل سمجھ رہے ہوں..... جیسے میں فورٹ منرو



# قائد اعظم

دیا ہے قائد اعظم نے جو پیغام آزادی ہماری قوم میں اک زندگی کی روح دوڑا دی

”یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم“  
ہیں فطرت میں یہی اسلام کے احوال بنیادی

علم عزم و ہمت کا لے کے نکلے قائد اعظم  
نظر آئی جو ان کو قوم کی ہر سمت بربادی

تصور کی نظر میں جو سہانا خواب دیکھا تھا  
حقیقت میں ہمیں اس خواب کی تعبیر دکھلا دی

ذرا غزش نہ آئی اس کے پائے استقامت میں  
فرنگی حکمران کی اس نے ہر تدبیر ٹھکرا دی

کبھی جھکتا نہیں مومن کا سراغیہا کے آگے  
عمارت کی اسی بنیاد پر تعمیر فرما دی

رہے گا نام اسلم حشر تک اس مرد غازی کا  
کیا سیراب اپنے خوں سے جس نے نخل آزادی

(انتخاب: بگل ناز اظہر، بہاولپور)

خالد تبسم صاحب کی فکر تھی۔ ان کو فون کیا تو بھائی نے بتایا کہ وہ کئنگ کرانے گئے ہیں۔ لو صاحب..... اتنی دیر ہو گئی اور ان کی ابھی تک حجامت نہیں ہوئی..... جی چاہا کہ ایک حجامت ان کی میں بنا ڈالوں..... یہ کہہ کر میں ہاتھ روم چلا گیا..... نہانے لگا تبسم صاحب کا فون آیا میں نے عرض کی کہ حضور میں ہاتھ روم میں نہا رہا ہوں

کی بجائے کوہ قاف جا رہا ہوں..... ہاں..... کوہ قاف..... قاف تو نہیں مگر کوہ ضرور جا رہا تھا..... قاف پہاڑ نے تو ہماری دنیا کو گھیرا ہوا ہے..... اور باقی پہاڑ اس کی رگیں ہیں..... اور ہم ان رگوں میں سے کچھ چھوٹی رگوں پر جا رہے تھے۔ بلا آخر تیاری کا وقت آن پہنچا گہما گہما شروع ہو گئی..... موٹر سائیکلوں کو ٹیکنیکل ہسپتال پہنچا دیا گیا..... ماہر سرجن ان کے مکمل چیک اپ کے لئے مصروف عمل ہو گئے..... فوری طور پر ایک آدھ کا چھوٹا موٹا آپریشن کر دیا گیا..... بعد میں ان کو نہلا دھلا کر بڑے محتاط انداز میں سجا کر ایک جگہ ٹھہرا دیا گیا۔

یہاں مجھے دوستوں کے فون آرہے تھے ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اب ان کی طبیعت ذرا صاف ہو گئی ہے کیونکہ ان کے موٹو بتا رہے تھے..... کب جا رہے ہیں کس وقت جا رہے ہیں آپ ایک دن رک جائیں ہم ضرور جائیں گے بڑا لطف آئے گا..... موٹر سائیکل سیٹ کروانا ہے..... ابھی ادھر حالات کافی خراب ہیں افغانستان کی وجہ سے..... وغیرہ وغیرہ..... میں ان سب سے بے نیاز ہو کر تیاری میں لگا رہا۔ جب انسان کوئی کام ٹھان لے تو اسے کر کے چھوڑے تاکہ اس کی شخصیت پر برا اثر نہ پڑے اور اس کی قوت ارادی ختم نہ ہو جائے..... اتنے میں باہر گیٹ پر نیل ہوئی..... یہ مخصوص نیل تھی میں سمجھ گیا کہ دوپہر کی تملقاتی دھوپ میں مقررہ ٹائم پر مہر بشیر انشورنس والے ہی ہو سکتے ہیں ساجد مدنی جو کہ میرا چھوٹا بھائی ہے اس نے بشیر صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا..... تھوڑی دیر بعد میں بڑبڑاتا ہوا داخل ہوا..... تو بشیر صاحب اس وقت چھت کو گھورنے کے بعد پچھے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر دعا سلام کی اور گھڑی دکھا کر کہا..... بھئی صاحب میں پورے ٹائم پر آچکا ہوں..... آپ بھی..... کمال کرتے ہیں ابھی تک تیار نہیں ہوئے میں نے کہا..... بس ابھی تیار ہوتا ہوں اتنے سارے کام تھے جو صرف مجھے ہی کرنے تھے دیر تو لگتی تھی۔ مجھے

تھوڑی دیر تک میں خود رنگ کرتا ہوں۔ نہا کر باہر آیا تو رنگ بیک کی تو محترم صاحب نہا رہے تھے۔ پتہ نہیں اٹھان کر رہے تھے عجیب افزائش کا عالم تھا۔

شیر صاحب پہلے سے لاہور چلے گئے تھے..... ان کو ماما شیر بھی کہتے ہیں بلکہ یہ سرکاری وغیرہ سرکاری ماما ہیں دوست احباب کہتے ہیں کہ یہ آپ کے ماما ہیں تو ہمارے بھی ماما ہیں..... گویا سارے شہر نے انہیں ماما بنا رکھا تھا۔ بعض اوقات ممائی کو بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی کہ کہیں..... سینے کی بجائے ماموں جان نہ کہہ دیں..... جناب نے آٹھ بجے رات ملتان پہنچنا تھا اس طرح کرتے کرتے تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد تبسم صاحب اپنے نام کی طرح تبسم فرماتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آن وارد ہوئے اور آتے ہی تمام کارروائیاں ایک ہی سانس میں بیان کر دیں..... وہاں سے ہم ٹیکنیکل ہسپتال پہنچے ہمیں دیکھتے ہی ٹیکنیکل ماہر سرجن نے بل تھام دیا۔ بل ادا کرنے کے بعد تمام سامان حسب پروگرام تبسم صاحب کے موٹر سائیکل پر لاد دیا گیا..... بطور مال گاڑی کے تمام چیزیں چیک کرنے کے بعد والدہ محترمہ سے اجازت لی اور دعائیں لیتے ہوئے کوچ کیا۔

☆☆.....☆☆

## دمشقی شہر

آخر کار روانگی کا وقت آن پہنچا ایک بار پھر سارا سامان چیک کیا گیا۔ پانچ مختلف اقسام کی موٹر سائیکل بالکل تیار کھڑی تھیں۔ جن میں ایک پر عابد محمود بھی میرا جھوٹا بھائی اور اس کے ساتھ عامر سلطان دوسرے پر بشیر انشورس والے تیسرے پر کاشف اعوان اور الماس چوتھے پر خالد تبسم بمعہ ساز و سامان اور پانچویں پر میں اور..... میرے تصورات جن میں کچھ خدشات بھی شامل تھے۔ کیونکہ ہم پہاڑوں پر جا رہے تھے وہاں کہیں کہیں راستہ انتہائی پر پیچ اور خطرناک تھا تھوڑی سی لاپرواہی..... کسی بہت بڑی پریشانی کا پیش خیمہ بن سکتی

تھی۔ میں نے ان سب کو سمجھایا کہ ہمیں سفر کیسے کرنا ہے وقت زیادہ لگ جائے لاپرواہی نہیں کرنی سب حالات کی نزاکت کو سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے وعدہ کیا کہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جو پریشانی کا باعث بنے ان سب نے عہد کیا کہ آپ ہمارے لیڈر ہیں..... آپ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے چاہے آپ ہمیں اندھے کنویں میں ڈال دیں..... میں نے بھی یہ بات دل میں رکھ لی چھٹا موٹر سائیکل شوکت خاں عباسی جو کہ میرے بھتیجی ہیں ان کا تھا وہ مصروفیت کی وجہ سے نہ جاسکے..... ویسے بھی بزرگوں کا کہنا ہے کہ ایک ہی گھر سے سارے افراد اکٹھے سفر نہ کریں بات بالکل ٹھیک تھی دوران سفر ہر بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے بڑوں کی باتوں میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔

خیر جی..... بسم اللہ پڑھ کر موٹر سائیکل اشارت کئے اور پہلی منزل کی طرف چل دیئے۔ کہتے ہیں کہ سفر میں خوراک اور پوشاک کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اس لئے ہم نے اپنی خوراک اور پوشاک کا خیال رکھا ہوا تھا راستے میں پٹرول پمپ پر موٹر سائیکلوں کی خوراک یعنی کہ پٹرول سے ان کے پیٹ فل کر دیئے مگر..... ان کی پوشاک کا ہمارے پاس انتظام نہیں تھا شہر کے ریلوے پھانک کو کراس کرتے ہوئے دریائے ستلج کے پل پر پہنچے..... پل کے دائیں طرف ریلوے امپیریس برج ہے امیر صادق محمد خاس کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ ستلج ویلی پراجیکٹ تھا۔ اس کے ذریعے چولستان کی پندرہ لاکھ ایکڑ اراضی کو آباد کرنے کے لئے تین مقامات پر ڈیم تیار کئے گئے اور نہرں نکالی گئیں یہ بیخندہ ورس، ہیڈ سلیمانی اور ہیڈ اسلام تھے۔ یہ دریا چونکہ انڈیا سے آتا ہے اس لئے اس کا پانی ان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ جب انڈیا میں پانی وافر ہو یا وہاں پر سیلاب کا خطرہ ہو تو وہ یہ سوچے بغیر پانی چھوڑ دیتا ہے کہ یہاں پر کتنی تباہی ہوگی؟ کتنے گھر اجڑ جائیں گے؟ کتنی بستیاں اس سیلاب کی نظر ہو جائیں گی؟ کتنے ارمان بہہ جائیں گے؟ بلکہ وہ اس تباہی سے محفوظ ہوتا ہے اور اس کی

روح کو تسکین ملتی ہے۔ اس کے جگر پر پڑے انگارے کچھ دیر کے لئے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ پل کر اس کرتے ہی بائیں طرف کچی بستی ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت کمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں مگر ان میں سے کچھ بچے، جوان، بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں سڑک کے کنارے اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر اپنے اپنے..... انداز میں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں۔ پل کے شروع میں ٹول ٹیکس..... اور پل کے آخر میں یہ خیرات بطور خراج کے دینا ضروری ہوتا ہے۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد چھب موڑ آ گیا یہاں سے نور محمد جھنڈر کو کر لینا تھا۔ وہ ہمارے انتظار میں معذرت کا پروانہ لئے کھڑے تھے۔ ان کی داستان غم سنی، ساتھ نہ جانے کی وجوہات بڑی معقول تھیں اس لئے ان پر کوئی جرم نہ نہیں لگایا۔ اسی اثناء میں نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ بعد نماز فراغت کے نور صاحب سے اجازت لی اور منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

ادور ہیڈ برج پر پہنچے دائیں طرف ایک پرانا خستہ حال مندر..... اپنے دور کی یاد دلاتا ہے۔ اس مندر کی اونچائی تقریباً تیس فٹ ہے اور اوپر سے گنبد نما ہے۔ اس مندر کو الدارنی دیوی کہتے ہیں۔ یہ آج سے تقریباً تین سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا اس مندر کو مات رانی کے متولی پنڈت موتی لعل کے بزرگوں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس مندر میں رام چندر جی، سیتا جی، لکشمی جی اور کرشن جی مہاراج کے بت موجود تھے۔ جس طرح قوم عاد کے بت صداء، صمود، ہباء اور جیسے خانہ کعبہ میں 365 بت موجود تھے۔ جن کو سرور کائنات حضور اکرمؐ نے اپنے دست مبارک سے توڑ کر ہمیشہ کے لئے بت پرستی کا خاتمہ فرما دیا تھا اور ہر طرف دین کی شمعیں روشن کر دیں۔ خانہ کعبہ میں ان کے دیوتا لات، عزئی وغیرہ تھے اور یہاں اس مندر میں رام چندر جی، سیتا جی، لکشمی جی اور کرشن جی مہاراج کے بت اپنے بت خانوں میں بے خبر، بے حس و حرکت، ہر چیز سے عاری پڑے ہوئے تھے۔ ان بے چاروں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ کون کون ان

کے حضور نذرانے چڑھانے آتے ہیں اور کون کون ان کے زیادہ منظور نظر ہیں۔ ان بتوں کو تو حضور اکرمؐ نے اپنے دست مبارک سے توڑ دیا مگر یہاں پر ان کو کسی نے نہیں توڑا۔ وقت کے ہاتھوں خود ہی ٹوٹ گئے۔ کیونکہ ہندو نقل مکانی کرتے وقت اپنے مذہبی تمکات اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ مندر کے اوپر والا حصہ سونے کا تھا۔ اس مندر کے متولی چند سال قبل یہاں آ کر سونے کا گنبد اکھاڑ لے گئے اور یہاں کے باسیوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مورخہ 20-12-93 کو اس مندر کے متولی پنڈت کی اولاد نے یہاں سے تقریباً 11 کلو سونا نکالا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ مندر سے آگے آدم داہن بستی ہے۔ روایت ہے کہ راجہ چنر کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے آدم خاں نے شہرت پائی۔ آدم خاں نے اپنے نام کی مناسبت سے دریائے ستلج کے کنارے قلعہ نما شہر آدم واہن آباد کیا۔

یہاں سے ٹریفک دوطرفہ شروع ہو جاتی ہے۔ تقریباً دس کلومیٹر کے بعد لودھراں کے آس پاس بے شمار آثار قدیمہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ جن کا وجود اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ یہ علاقہ دریائے بیاس اور دریائے ستلج کے درمیان واقع ہے۔ لودھراں بائی پاس سے گزرتے ہوئے پرمت پنچے۔ اس روڈ کو پہلے شیر شاہ سوری روڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسے جرنیلی سڑک بھی کہتے ہیں۔ اس سڑک کو شیر شاہ نے دہلی سے دریائے سندھ تک تعمیر کرایا تھا۔ اس روڈ سے گزرتے ہوئے بستی جلعہ ارا میں پنچے۔ مشرق کی جانب تین کلومیٹر کے فاصلے پر جلعہ ارا میں واقع ہے جو ملا جلعہ ارا میں نامی شخص کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ پہلے چک راوہ کے نام سے بھی مشہور تھا۔ یہاں پر ارا میں قوم سے پہلے بوہڑ قوم آباد تھی۔ اس قوم کے دور کی قدیم مسجد بائی رہ گئی ہے جو بوہڑوں والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ چند کلومیٹر کے فاصلے پر چک ہمہ جس کو 1859ء میں ہمہ مل ولد موتی رام نے آباد کیا تھا۔

ہمہ مل اس چک کا نمبر دار تھا اس وجہ سے یہ چک ہمہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس گاؤں کے مشرق کی جانب ایک پرانا کھنڈر موجود تھا جو دو ناڑی ماڑی کا کھنڈر کہلاتا تھا۔ یہاں سے مٹی کے برتن، مٹی کی مورتیاں اور قدیم سکے مقامی لوگوں کو ملے ہیں۔

میرے ساتھ ماہرین آثار قدیمہ شریک سفر تھے۔ میری خوش بختی یا کم بختی کہ مجھے ان کے پرفیض مشورے فیضیاب نہ کر سکے ان کی معلومات میرے علم میں اضافہ کی بجائے مجھے مشکوک بنا رہی تھیں۔ اس لئے میں ان سے کچھ دیر کے لئے بے نیاز ہی رہا اسی بے نیازی میں ہم مخدوم عالی پہنچ گئے۔ یہاں پر ہم اپنے دوست چوہدری نذیر صاحب کے گاؤں پہنچے۔ ان سے ملے بغیر ہم آگے نکل گئے۔ یہ علاقہ دریائے بیاس کے کنارے آباد ہے۔ یہ علاقہ پہلے ویران جنگل تھا۔ قریشی خاندان کے بزرگ مخدوم عالی سلطان موضع بہاول گڑھ سے اٹھ کر اس جگہ آباد ہوئے۔ ان کے نام کی مناسبت سے اس جگہ کا نام..... مخدوم عالی رکھا گیا۔

تھوڑا آگے ایک چھوٹا سی پل آتا ہے غالباً یہی جگہ پہلے دریائے بیاس کی گزرگاہ تھی۔ کچھ فاصلے پر بستی ملوک آگیا۔ یہاں پر چوہدری صفدر ہمارا دوست قیام پذیر ہے۔ وقت کی کمی کے باعث یہاں سے بھی کھسکنا پڑا۔

شام کے دھندلے سائے ہمارے سروں پر منڈلانے لگے۔ ہر طرف اللہ اکبر کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ سب اپنے اپنے کاروبار دنیا میں مشغول تھے۔ ان کے پاس فرصت نہ تھی کہ بغل میں اللہ کا گھر ہے۔ جا کر دو سجے ہی ٹیک دیں۔ اول تو ہم نماز پڑھتے نہیں۔ پڑھ لیں تو شیطان دکھاوے کی نماز پڑھوائے گا اس سے بھی بچ جائیں تو غلٹ کی نماز۔ نہ جانے ہماری نماز کیسی نماز ہوئی ہوگی۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ (آمین)

مجھے اور میرے گروپ کو جلدی جانا تھا مگر ہر طرف سے اللہ اکبر کی صداؤں نے دل میں غدا مت ڈال دی اور تھوڑی بہت شرم نے کام دکھایا۔ ہم نے موٹر سائیکلوں

کو ایک طرف ٹھہرا کر ٹوٹی پھوٹی نماز ادا کی۔ ہماری طرف سے مغرب کی نماز ادا ہو گئی۔ گویا کہ دوسرے لفظوں میں ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ بعد نماز فراغت کے پھر کوچ کیا۔ موٹر سائیکلوں کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔ اسی روشنی میں ہم رواں دواں جا رہے تھے۔ تبسم صاحب گنگناتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔

خدا کی پناہ میں گھبرا گیا۔ اتنی دیر میں مجھے اپنے تمام کردہ..... ناکردہ گناہ یاد آ گئے۔ میرے کان سناتے مارنے لگے۔ نامعلوم گنگنا کے گزرے یا صور پھونک گئے۔ خیر کرم ہوا جو بھی بلا تھی ٹل گئی۔ بشیر صاحب موٹر سائیکل پر ایسے چوکنے بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی بڑا مشن ہو۔ عابد بھٹی کو جلد از جلد پہنچنے کی فکر تھی رانا صاحب جو کہ بعد میں ترقی کر کے رائٹرز بن گئے تھے اپنے ساتھی کے کانوں میں نامعلوم کیا رس گھول رہے تھے کہ وہ چپ چاپ موٹر سائیکل چلانے میں مگن تھے۔ سڑک چگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی، اپنی بے بسی کی داستان سنار ہی تھی۔ عرض بیاں کچھ اس طرح تھی کہ ہر سال بجٹ پر سوچتی ہوں..... مجھ پر نظر ثانی ہوگی مگر ہر سال ہر جانی بھول جاتے ہیں۔ ہاں اتنا کرم ضرور گناہ گار آنکھوں نے دیکھا تھا کہ کہیں کہیں..... خانہ پری کے لئے مرہم پٹی ضرور کی ہوئی تھی۔ جیسے ٹاٹ میں پوند لگے ہوں۔

ہم اچھلتے کودتے جا رہے تھے کھیل کود کی وجہ سے نہیں بلکہ سڑک کی حالت زار کی وجہ سے..... موٹر سائیکل بھی اچھل کود کر احتجاج کر رہے تھے۔ انہیں حالات میں لاڑ آ گیا۔

ہم پہلی منزل کے قریب پہنچ چکے تھے لاڑ تحصیل ملتان کا مشہور قصبہ ہے۔ یہ بہاولپور کی شاہراہ پر..... ملتان سے 17 میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں سے شجاع آباد کو ایک پختہ سڑک جاتی ہے۔ قریبی ریلوے لائن بھی شجاع آباد کو جاتی ہے۔ 1973ء میں یہاں مرطوب دہکی و ترقیاتی مرکز قائم کیا گیا جہاں پرافزائش نسل حیوانات کے سلسلے میں کام ہو رہا ہے۔ لاڑ سے ہوتے ہوئے ہم ملتان کی حدود میں داخل ہونے والے

پاکستان بھر کے بچوں کا خوبصورت رسالہ، مقابلے کی طرف  
تیزی سے گامزن، مقبولیت اور بلندی میں سب کے ساتھ ساتھ

لاہور

# بچوں کا پرستان

مدیر اعز ادبی  
عائشہ خان

خدمت کا پہلا سال  
کامیابی کی بہترین مثال

مدیر اعلیٰ  
امان اللہ خیر شوکت

نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے



الاتحاد خوبیوں کا حسین مجموعہ، پرکشش سرورق، خوبصورت طلسماتی اور  
معاشرتی کہانیوں سے مزین، بلند با مقصد تحریریں اور نظموں کا سنگم سیٹے



## بچوں کے ادب کا ترجمان رسالہ

40 روپے کے ڈاک ٹکٹ  
ارسال کر کے بچوں کا پرستان  
عام ڈاک سے منگوایا جاسکتا ہے

آپ پڑھیں، دوست پڑھیں بلکہ سارا گھر پڑھے  
ہر شہر کے بکسٹال پر دستیاب ہے

ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ بچوں کا پرستان کو ایک بار شروع کر کے  
چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تا وقتیکہ تمام کا تمام نہ پڑھ لیا جائے۔

پتہ : بچوں کا پرستان : ہائوس نمبر N-155 ڈیفنس ہائوسنگ سوسائٹی، لاہور کینٹ

موبائل نمبر 0336-4173392 042-35720740

روڈ ہے۔ سامنے حضرت بہاؤ الدین زکریا کا مزار نظر آ رہا ہے۔ جسے دیکھتے ہی مجھے حضرت زکریا ملتانی کا قطعہ یاد آ گیا جو انہوں نے حاکم ملتان شیخ حمید الدین حاکم کو لکھا تھا۔

حاکم آپ ہیں حکم آپ وا (کریں آپ) وچار  
جے دن گانوں سے کئی دلہر دلار  
جے دن لدھیانہ مندے نہ ہار  
جیں ٹانگ نہ تو لھا سے کیوں لگھنن پار

کیسے باکمال لوگ تھے جو ایک دوسرے سے رمزیہ گفتگو فرماتے تھے۔ یہ وہی ملتان ہے جس پر محمد بن قاسم نے اسلام کا جھنڈا لہرایا۔ یہ ملتان کا قدیم قلعہ جو اب محمد بن قاسم باغ کے نام سے مشہور ہے۔ سطح زمین سے تقریباً چالیس فٹ اونچا ہے جس کے گرد و پیش شہری آبادی ہے۔ ملتان کی قدامت اسی قلعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی قلعہ پر قدیم مندر ہے جو پرہلا دھتک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خود پرہلا کی کہانی قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی قلعہ پر غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانی کا پر شکوہ مزار اپنی انفرادیت میں موجود ہے۔ یہ قلعہ جب اپنی درست حالت میں تھا تو اس کا محیط تقریباً چھ ہزار فٹ یعنی سوا میل کے قریب تھا اور اس کے تقریباً 46 برج چھوٹے چھوٹے اور چار برج بڑے تھے۔

ان چاروں دروازوں پر دو بڑے بڑے برج اور بھی تھے۔ حسین آگاہی والا ریزھی دروازہ شمال مشرق کی طرف خضری دروازہ جو دریا کے رخ کی طرف تھا اس لئے حضرت خضرؑ کی نسبت سے یہ خضری دروازہ مشہور تھا۔ مشرق جنوب کی طرف سکھی دروازہ تھا۔

ملتان کا نام آئے تو محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کا ذکر نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ محمد بن قاسم پہلی صدی کے آخری حصے میں سندھ میں داخل ہوا اس وقت سندھ پر راجہ واہر کی حکومت تھی۔ یہ ایک جابر اور ظالم راجہ تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اسے فتح کرنے کے بعد وہ ملتان تک آیا ملتان کو فتح کیا۔ ملتان بلکہ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے مسلمان

تھے۔ بشیر صاحب کی اسٹیٹ لائف ایکسپریس اپنی دھواں دھار رفتار میں چل رہی تھی وہ اس ایکسپریس کو ایسے چلا رہے تھے جیسے کسی پالیسی ہولڈر سے ٹائم لیا ہوا ہو اگر بروقت نہ پہنچے تو وہ بھاگ جائے گا۔ ان کے پالیسی ہولڈر کو پھنسانے کا طریقہ ایسے ہوتا ہے جیسے بلی شکار کے انتظار میں چوہے کی بل پر سارا دن بیٹھی رہتی ہو کہ بچو کبھی تو ہاتھ آؤ گے۔

بھٹی ایکسپریس یعنی کہ میں مختلف خیالات کے جھوم کا شکار بنا ہوا تھا۔ نجانے اگلی منزل پر کیا ہو، ملتان والے تیار ہیں کہ نہیں؟ شبیر صاحب لاہور سے آئے یا نہیں؟ مختار صاحب وہاں پہنچے یا نہیں؟ ملتان سے کس وقت روانہ ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ انہیں خیالوں میں دمشق شہر ملتان آ گیا۔

بائی پاس پر پہنچ کر میں سیدھا چوک بی سی جانے کے بجائے بائیں مڑ گیا جو کہ مظفر گڑھ روڈ تھا۔ میں چونکہ ان سے آگے بطور لیڈر کے تھا یہ سب حیران و ششدر میری تقلید میں مڑ گئے جب سارے آگئے تو میں مڑ کر پھر چوک بی سی کی طرف آ گیا۔ یہ سب پلٹ کر آئے اور میرے ارد گرد ہجوم کر کے وجہ تسمیہ دریافت کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ دیکھوں کہ یہ میری بات مانتے ہیں کہ نہیں کیونکہ بہاولپور میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ ہمیں چاہے اندھے کنویں میں ڈال دیں آزمانے پر ثابت ہوا کہ یہ اندھے کنویں میں گریں یا نہ گرں مگر لیڈر کی فرمانبرداری اور ڈسپلین میں ضرور کامیاب ہیں۔

ہم ہنستے ہنساتے ملتان شہر میں داخل ہوئے۔ چوک بی سی سے ہوتے ہوئے چوک شاہ عیاس پہنچے۔ چوک اور سڑک دونوں کی حالت نہ گفتہ بہ تھی اور بے ہنگم ٹریفک شور و غوغا کی وجہ سے کانوں پڑی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ بالآخر ہم ڈیرہ اڈا سے ہوتے ہوئے اور ہیڈ برج پر پہنچے جو کہ حال ہی میں بنا ہے اور یہاں سے شہر کا نظارہ بڑا پیارا لگتا ہے۔ دائیں طرف گھنٹہ گھر

گھینے کی بجائے کیونکہ انہوں نے فرغل تو پہنا ہوا نہیں تھا البتہ لنڈی پینٹ کو جھکتے ہوئے نمودار ہوئے۔ رسی گفتگو شروع ہوئی تو مجھے دمشقوں کا انداز گفتگو یاد آ گیا۔ یہ انداز صدیوں پہلے کا تھا مگر آج بھی ایسے موجود ہیں دمشقوں کا انداز گفتگو ملاحظہ ہو۔

فضیلت مآب..... طبع مبارک تو اچھی ہے مولائی!  
..... بشکر ہے..... سرکار کے مزاج گرامی کیسے ہیں.....  
قبل ام..... بہتر ہوں..... آں جناب..... دولت کدے سے تشریف لاتے ہیں۔

خداوند نعمت..... اب فقیر اپنی جھونپڑی کو لوٹتا تھا..... مولائی کے آستانہ اقبال پر سجدہ دینے کو حاضر ہوا تھا۔

ادب و محسن اعظم..... یہ حقیر..... ذرا اپنی پھوپھی کے ہاں گیا تھا..... تو اب چلے اس حقیر و بے حیثیت غلام کے ساتھ اور میری گھاس پھوس کی جھونپڑی کو قدم مبارک سے ہمسرا آفتاب کیجئے۔ یہ پر تکلف آداب..... دمشقوں کی زندگی کو الجھا ہوا..... مگر شر میں بناتے تھے۔ اسی طرح ملتانی بھی دمشقوں سے کسی طرح کم نہیں..... اور کیوں ہوں آخر ملتان کچھ عرصہ دمشق کے زیر سایہ جو رہا تھا۔

بعد از گفتگو حیلے بہانے کا دور شروع ہوا۔ بھٹی صاحب فورٹ منرو نہ جائیں حالات بڑے خراب ہیں۔ ڈی جی خان سے آگے نہیں جانے دیتے کرنیو لاگ ہوا ہے، جگہ جگہ جلوس نکلے ہوئے ہیں، بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ پٹھانوں نے ہڑتالیں کی ہوئیں ہیں، افغانی آئے ہوئے ہیں ہر جگہ پولیس تعینات ہے، چیک پوسٹ پر بہت سختی ہے ان سب باتوں کے ساتھ ایک عدد مسکہ اگر آپ کہتے ہیں تو ہم تیار ہیں آگے آپ کی مرضی ویسے حالات سے آگاہی کروانا ہمارا فرض تھا۔

کل کی اخبار میں آیا ہوا تھا تمام چیک پوسٹ سیل کر دیئے ہیں۔ ہم تو تابعدار ہیں آپ جیسے حکم کریں گے ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور جب میں کہوں کہ چلتے ہیں دیکھا جائے گا۔ ہے تو اپنا وطن کوئی دیار غیر تو نہیں

ولیوں، درویشوں، مبلغین کے ذریعے اسلام آچکا تھا مگر فروغ محمد بن قاسم کے ملتان کو فتح کرنے کے بعد ملا۔ تقریباً سوا سو سال تک ملتان دمشق اور بغداد کی حکومت کا حصہ رہا تیسری صدی ہجری میں مقتصد باللہ کے بعد بغداد مرکز انتہائی کمزوری کا شکار ہو گیا اور اسے زوال آنا شروع ہوا تو عرب کے گورنروں نے خود مختاری حاصل کر لی اس کے بعد 373ھ میں علم بن شیبان حاکم بن کر ملتان آیا اس کے آنے سے قرامطی یا اسماعیلی فرقہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ملتان میں اکثریت شیعہ کی تھی اور وہاں پر مصر کے فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

قرامطی فرقہ 1010ء تک اپنے اقتدار پر رہا بعد میں قرامطی حاکم ابوالفتح داؤد کا خاتمہ سلطان محمود غزنوی نے کیا۔ غزنوی کو اور جنگوں کے علاوہ بڑی جنگ قرامطیوں کا بالکل خاتمہ کرنے کے لئے کرنی پڑی۔ سلطان محمود غزنوی کے زوال کے بعد ایک بار پھر قرامطی فرقہ برسر اقتدار آ گیا ان کی جزیں مضبوط تھیں۔ اس لئے سلطان محمود غزنوی نے 1175ء میں ملتان پر حملہ کیا اور قرامطی فرقہ کو تباہ نہیں کر دیا اور انہیں واصل جہنم کیا۔ بعد میں ناصر الدین قباچہ حکمران رہا اس طرح ملتان کو قرامطی فرقہ سے نجات ملی۔ مسلمانوں کے لئے ایک انتہائی خطرناک مرحلہ تھا۔ مسلمانوں کے مرکز میں قرامطی فرقہ بہت تیزی سے عروج پا رہا تھا اور وہ مختلف شعبہ دوز اور نئے دین کے ذریعے دین کی بنیادوں کو کھولا کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ آج یہ وہی ملتان ہے جہاں قرامطی فرقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے اور ہر طرف اسلام کا بولا بالا ہے۔ اسی ملتان سے کچھ نوالے ہمارے ساتھ جا رہے تھے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہوا عین وقت پر شبیر صاحب بھی لاہور سے آگئے۔ حال احوال کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا وہ بھی خیر سے نمٹ گیا۔ اب فورٹ منرو کا پروگرام بنانا تھا عبد الملک ساجد صاحب کالی فریم پر سفید شیشے لگائے لقا کوتاہ بنے، غرور سے اپنے فرغل کو



پھر ایک دم پلٹ کر دوسری طرف آ جاتے واہ بھٹی صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں بڑا رسک۔ ہے خیر فکر نہ کریں اس مسئلے کا کوئی حل نکالتے ہیں۔

منظر گڑھی دوست کے ہوٹل پر کھانے کے بعد مذاکرات چل رہے تھے۔ بحث برائے بحث تھی جس کا نتیجہ نکلنا مشکل ہو گیا۔ آخر کار طے پایا کہ رات کے اندھیرے میں واپس چلتے ہیں۔ کچھ ساتھیوں نے اعتراض کیا شبیر صاحب نے کہا بھی بڑی مشکل سے گھر سے جان چھوٹی ہے میں تو گھر نہیں جاتا۔ بحث و مباحثہ چلتا رہا طے ہوا کہ رات سوتے ہیں صبح دیکھیں گے۔ چھت پر چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ تھکن کی وجہ سے سب چار پائیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ بلال صاحب جیسے ہی نیچے گئے تبسم صاحب اپنی فکر مند تبسم کے ساتھ گویا ہوتے ہیں کہ کیا آپ واقعی ہمیں وہاں تک نہیں لے جا سکتے۔ میں نے انہیں عرض کیا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں میں تو سفر کا عادی ہوں۔ مسئلہ آپ لوگوں کے لئے ہے سب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر صبح چلتے ہیں میں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے۔ رات باتوں میں سوتے جاگتے کٹ گئی۔

صبح پانچ بجے سب اٹھ گئے اور اپنی اپنی ضروریات سے فارغ ہونے لگے شبیر صاحب انتہائی مہارت سے برش کو دانتوں پر چلا رہے تھے سلوموشن میں کہ اگر تیز برش کیا تو دانت گر نہ جائیں۔ ان کے پاس وقت وافر مقدار میں تھا جبکہ ہمارے پاس وقت کی انتہائی قلت تھی۔ آخر کار ایک دوسرے کو روک ٹوک کر 6 بجے تیار ہو گئے۔ گھر سے مٹری کو اٹھایا موٹر سائیکلوں کو چیک کرایا پھر وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع ہونے لگا کہ آپ بغیر مٹری کے اور سامان کے جا رہے ہیں مگر میں نے بات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اللہ مالک ہے۔ فیصلہ ہو چکا تھا علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح بات پھیلی۔ خالد بھٹی ٹریپ لے کر جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں بجائے اس کے کوئی اور رکاوٹیں آتیں میں نے دوستوں کو الوداع کہا اور نقارہ کوچ بجا دیا۔

روہیلے ملتان کے جیالوں، ہم نوالوں کو چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ یہ پہلا ٹریپ تھا کہ منان والے ساتھ نہ تھے ورنہ موٹر سائیکلوں پر جگہ نہیں ہوتی تھی اور اس قافلے کو سنبھالنا مشکل پڑ جاتا تھا اب یہ ٹریپ صرف روہیلوں کا تھا۔ جو ابھی دمشق شہر کو چھوڑ کر فورٹ منرد کوچ کرنے والے تھے۔ کچھ فاصلے طے ہو چکے تھے اور کچھ فاصلے طے کرنے ابھی باقی تھے۔ فاصلے طے ہو جاتے ہیں۔ منزلیں کٹ جاتی ہیں۔ دوریاں نزدیک ہو جاتی ہیں مگر دلوں کے فاصلے انسان کو بہت دور لے جاتے ہیں۔ اتنی دور کہ بسا اوقات واپسی ناممکنات میں سے ہو جاتی ہے اور باوجود انتھک کوشش کے وہ یہ مسافتیں طے کرنے میں عاجز آ جاتے ہیں۔ ازل سے لے کر ابد تک انسان مسافر کی طرح زندگی بسر کرتا آیا ہے۔ اسے کسی نہ کسی شکل میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ امیر ہوں یا غریب، فقیر ہو یا بادشاہ اسے زندگی کی کٹھالی میں پکنا پڑتا ہے۔ کوئی کامیاب ہوتا ہے اور کوئی ناکامی کا پروانہ لئے پتیتوں میں گر جاتا ہے۔ سفر سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ سفر خواہ کسی قسم کا ہو انسان کو کسی نہ کسی مرحلے سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جو اسے اک نئے تجربے سے روشناس کراتا ہے۔ ہم بھی ایک چھوٹے سفر پر نکلے ہیں نا جانے کن کن مراحل سے گزرنا پڑے اور کیا کیا تجربے ہوں۔

☆.....☆.....☆

## موسن ہٹی

پانچ موٹر سائیکلوں کی آوازوں نے علاقے بھر میں اطلاع دینا شروع کی کہ روہیلے دمشق ملتان سے کوچ کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ کوئی ناصح پھر ہمیں نصیحت کرنے کے لئے آن وارد ہوتا..... ہم ملتان کینٹ کو چھوڑ کر شیر شاہ روڈ پر پہنچ گئے۔ اب ہمیں تسلی تھی کہ کوئی ہرکارہ ہمیں مزید مشورہ دینے کے لئے نہیں پہنچ سکتا۔ تمام ساتھی خوش تھے کیونکہ روانگی سے پہلے وہ کشمکش کا شکار تھے۔ نجانے کیا بنے۔ مختلف پروگرام بنائے جا





# PACIFIC SECURITY SERVICES (Pvt) Ltd

## Leading Services

- Trained, Uniformed Armed and Unarmed Security Guards
- Provision of Armed Body Guards
- Security for official meetings and social functions
- Highly skilled guards for very sensitive employment
- In-depth security survey
- Security Consultancy services and threat assessment for high Security Environments.
- Mobile armed escort services for the protection of VIPs, high risk executives' and private clients.
- Provision of Trained Sniffer Dogs.
- VIP protection and Escorts services
- Anti-Burglary and fire protection system
- Protection of rights from counterfeits and infringements.
- Security to diplomats and foreign missions / organizations
- Horse mounted patrolling of sensitive areas
- Provision of Bullet Proof Jackets
- Procurement, installation and maintenance of latest security equipments, Close Circuit Television (CCTV) and alarm system.

IN GOD WE TRUST ALL OTHERS WE MONITOR

## Capabilities

licensed by the Government of Pakistan to provide security services

Vigilance teams Check the efficiency and alertness of the guards

control room is equipped with the latest radio/ wireless equipment. It remains in communication with our Quick Reaction Mobile teams (QRMT) for prompt response to our clients any in emergency.

Client satisfaction is our top most priority.

1/3 2n Mezzanine Floor WestPoint Tower,  
Phase II Extension DHA,  
Main Korangi Road,  
Karachi-Pakistan

E-Mail: [pon@cyber.net.pk](mailto:pon@cyber.net.pk)  
Telephone : (92-21) 5383390 - 5383996  
Fax : (92-21) 5383490

رہے تھے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ..... تمام ساتھی میرے منہ پر دیکھتے کہ شاید ابھی پروگرام ختم ہوا اور ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ مگر میں ان کی ترجیحی نظروں کے سینکڑوں سوالوں کو بھانپ گیا۔ اس لئے میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ باقی ساتھیوں کو لے کر ضرور جاؤں گا اور شکر میں اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ جیسے انسانوں کی آوازیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اسی طرح موٹر سائیکلوں کی آوازیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ انہی مکچر آوازوں کے ساتھ ہم دریائے چناب کے اور ہیڈ برج پر پہنچے۔ پل کافی اونچا تھا۔ نیچے دریا، اس کے اوپر ریلوے پل اور اس کے اوپر سڑک جس پر ہم جا رہے تھے۔ مگر ٹھوڑے خوف کے ساتھ پل کا مظہر انتہائی دلکش اور آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ دریا کے کنارے درختوں کا جھنڈ ہے جس میں پارک بنایا گیا ہے۔ یہ پارک تفریح کا ایک خوبصورت اور اچھوتا ماڈل ہے جو عوام و خواص کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ پل کراس کرتے ہی سڑک کی دونوں جانب درختوں کی قطار ہے جن کے سرے اوپر جا کر ملتے ہیں اور یوں ایک غاری بن جاتی ہے۔ ہم خراماں خراماں منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ہمارے سامنے موسن ہٹی یعنی کہ شہر مظفر گڑھ آ گیا جو اپنے اندر ایک تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ ضلع مظفر گڑھ نے یہ نام اپنے ضلعی صدر مقام سے پایا۔ لغوی طور پر جس کا مطلب ہے مظفر کا قلعہ کیونکہ پرانا قصبہ ایک قلعہ کی دیواروں کے اندر واقع تھا جسے والی ملتان نواب مظفر خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اصل میں یہ خان گڑھ کہلاتا تھا اس کا صدر مقام بھی خان گڑھ میں تھا۔

اس کے شمال میں لیہ اور جھنگ کے اضلاع ہیں۔ مشرق میں جھنگ، ملتان، بہاولپور اور رحیم یار خان کے اضلاع اور کچھ حصہ دریائے چناب کے بائیں کنارے پر اور کچھ حصہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ ضلع لیہ سمیت اس کا کل رقبہ 5613 مربع میل بنتا ہے۔ چناب اور سندھ علاقے کے مشہور دریا ہیں۔ نہر مظفر گڑھ، نہر تھل، نہر نارنگ پور ضلع کی مشہور نہریں ہیں۔ محمد بن قاسم کے سندھ میں آنے سے قبل یہاں پر راجہ داہر کی حکومت تھی۔ محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کیا تو مظفر گڑھ کو بھی مسلمانوں کی حکومت میں شامل کر لیا بعد ازاں اس پر مغلوں کی حکومت رہی۔ مغلوں کے بعد احمد شاہ ابدالی نے یہ علاقہ فتح کیا اور نواب مظفر خان کو گورنر مقرر کیا۔ نواب مظفر خان نے ہی اس کی بنیاد رکھی اور اس نے چالیس سال تک حکومت کی۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ سکھوں کے بعد یہ انگریزوں کی تحویل میں آ گیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں شامل کیا گیا۔ ضلع مظفر گڑھ کا صدر مقام ابتداء میں ”موسن ہٹی“ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ بذریعہ ریل اور سڑک ملتان سے اکس میل کی مسافت پر ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے 383 فٹ ہے۔ جیسے ہی ہم مظفر گڑھ شہر سے باہر نکلے ریلی ہوانے ہمارا خیر مقدم اس طرح کیا کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ سڑک کے دونوں جانب ریگستان تھا۔ تیز ہوا کے گرم ریتلے جھونکے منہ پر برستے اور اتنی زور سے لگتے کہ جیسے کسی نے تھپڑ مار دیا ہو جس کی وجہ سے موٹر سائیکل چلانا دشوار ہو رہا تھا۔

ہوا گرم اور تیز تھی۔ مجھے اپنے نئے ساتھیوں کی فکر تھی۔ عابد بھٹی کو جلدی پہنچنے کی فکر تھی..... پہلی مرتبہ جا رہا تھا۔ فورٹ منرو بڑا کچھ سن رکھا تھا۔ اس لئے کچھ بیچس بھی تھا۔ عامر چھوٹے چھوٹے ریت کے ٹیلوں کو دیکھ کر کہتا کہ یہی پہاڑ ہیں۔ بس میں جھینپ کر رہ جاتا۔ ہم موٹر سائیکلوں پر بیٹھے ایک ہاتھ سے چلاتے اور دوسرے ہاتھ سے منہ چھپاتے۔ شرم کی وجہ سے نہیں بلکہ تیش کی وجہ سے جیسے ہی ہاتھ منہ سے ہٹاتے ریت کا جھونکا طبیعت صاف کر دیتا۔ ہوا کا دباؤ اتنا تیز تھا کہ موٹر سائیکل کا بینٹن رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لئے رفتار کو کم کر دیا۔ تاکہ دباؤ کچھ کم ہو جیسے ہی کسی کو بات کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ منہ کھولتا

ہے۔ ہم نے اسی پوائنٹ کو نشانہ بنا کر اس کی..... اچھی خاصی درگت بنا ڈالی۔

عابد بھی مسلسل ڈرائیور کرنے کے باوجود چاک و چوبند تھا۔ جستجو بھی لگن تھی..... ویسے بھی انسان جب کسی منزل پر پہنچنے کا معمم ارادہ کر لے..... تو یہ اس کی فطرت میں داخل ہے کہ وہاں پر پہنچے بغیر اس کو کسی پل چین نہیں آتا۔ اس کے بس میں نہیں ہوتا کہ اس کے بازو..... پر بن جائیں اور وہ ہوا کو چیرتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ جائے..... یہی کیفیت میری ٹیم کے نو جوانوں کی تھی..... ادھر شبیر صاحب چشمہ لگائے..... خراماں..... خراماں ساتھ ساتھ تھے..... جوں جوں فاصلے کم ہو رہے تھے..... جستجو بڑھتی جا رہی تھی..... موٹر سائیکلوں کی رفتار فاصلوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

## غازی گھاٹ

فاصلے کٹ رہے تھے۔ ایک منزل سے دوسری منزل..... دوسری سے تیسری منزل..... میرے ٹیم کے جیالے بہت گرم جوش مگر ڈسپلن کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے..... ان کے عزم اور حوصلے جوان تھے..... ان کے جوش و خروش نے ان کے مورال بلند رکھے ہوئے تھے..... ہمیں جلد از جلد ڈیرے پہنچنا تھا..... مختار صاحب نامعلوم پہنچے بھی ہوں گے یا نہیں..... مگر ہمیں وقت پر پہنچنا تھا..... ابھی تک موبائل پر کسی کا رابطہ نہ ہوا تھا..... ملتان سے ایک کال آئی اور وہ بھی کٹ گئی..... فاصلہ زیادہ اور وقت کم تھا..... اس لئے رفتار میں تھوڑا اضافہ کیا گیا تاکہ بروقت پہنچ سکیں۔

اب ہم غازی گھاٹ کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے..... دور سے ہی اس دریا کی وسعت بڑی پر خیز..... معنویت کا احساس دلاتی ہے..... یہ دریا..... ایک چھوٹا سمندر لگتا ہے..... کسی زمانے میں یہاں سیٹر چلا کرتے تھے..... یہ دریا ڈیرے سے مشرق کی طرف..... اپنی آب و تاب کے ساتھ کئی صدیوں سے

ریت کے ذرے خاک شفا بن کر حلق کے راستے معدے شریف میں داخل ہو جاتے.....

لا محالہ یہ راستہ خاموشی سے طے کرنا پڑا..... اور اشاروں کی زبان استعمال کرنی پڑی..... مگر تبسم صاحب کو کہاں چین تھا..... ان کی بے چین روح ہر تھوڑی دیر کے بعد ہمارے موٹر سائیکل..... کے قریب آن وارد ہوتی اور موسیقی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہ کوئی..... اظہار خیال ضرور کر دیتے۔ ان کی دانشمندانہ باتیں سن کر بے چین دل تڑپ اٹھتا اور معصوم روح بے اختیار کر لانے لگتی..... جی چاہتا کہ کسی ریت کے ٹیلے میں موٹر سائیکل دے ماروں۔ مگر افسوس..... تبسم صاحب کی فکر انگیز باتیں اور تبصرے وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑتے..... ادھر بشیر صاحب جتنے آپ خود..... اتنے ہی وزن کا بیگ کندھے پر لٹکائے میرے پیچھے براجمان تھے..... کسی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے..... ادھر کاشف صاحب میرے نزدیک ہوئے اور رانزاں صاحب کی شکایت..... کی کہ میرے کیا گناہ ہیں..... ہر تھوڑی دیر کے بعد مجھے کہتا ہے کہ..... موٹر سائیکل مجھے چلانے دو..... رانزاں سانپ (صاحب) میری طرف متوجہ ہوئے..... کہ بھی ہم خاندانی لوگ ہیں..... ایسے کئی موٹر سائیکل لے سکتے ہیں۔ یہ مجھے کیوں نہیں چلانے دیتے..... کاش میں اپنا موٹر سائیکل لے آتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

میں نے رانزاں کو ٹھنڈا کیا اور سمجھایا کہ ایک تو بٹھایا ہوا ہے..... اوپر سے نخرے..... ذرا شرم کرو..... خیر رانزے موصوف نے چپ کی سادہ لی اور ویسے بھی رانزے نے جہان بھر کا سامان اپنی کمر پر لا دیا تھا جس کی وجہ سے کمر کا جھکاؤ پیچھے کی طرف زیادہ ہو گیا۔ جب کوئی ہپ لگتا تو موصول الے لگنے لگتے اور خود ہی ساتھیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر فرماتے۔ I am .... I am funny..... It,s OK..... funny

بجائے I am fine کہنے کے I am funny منہ سے نکل گیا) ماں صدتے جائے تیرے بھی کیا بات

بہر رہا ہے..... اس کا شمار دنیا کے عظیم دریاؤں میں ہوتا ہے۔ یہ دریا اپنی اچھلتی کودتی موجوں کے ساتھ جس علاقے سے بھی گزر جائے وہ علاقہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس کی داستانوں میں سکھ بھی ہیں اور دکھ کی پرچھائیاں بھی جو گھاس پھوس کے تنکوں کی طرح اس کی تباہیوں پر تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس نے ڈیرہ اور اس کے ساتھ کے علاقوں کو کئی بار صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی ہے۔

1856ء میں دریائے سندھ نے بڑی تباہی مچائی..... جس کے لئے کالا بند کی تعمیر کی گئی۔ ایک کے مقام پر اس کا پانی تقریباً 54.6 فٹ تک چڑھ گیا تھا۔ جس سے اس شہر کو کافی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد کئی بار سیلاب آتا رہا۔

1909ء میں پھر ایسا سیلاب آیا جس سے پورا ڈیرہ..... صفحہ ہستی سے مٹ گیا آج یہ دریا بڑے جاہ و جلال سے اسی ڈیرے کے سینے پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے بہر رہا ہے..... بعد ازاں مغربی جانب نئے شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ جو آج موجودہ ڈیرہ ہے۔ شمس الدین امتش نے جب اوج کا محاصرہ کیا تو قباچہ اپنا خزانہ لے کر چلا گیا۔ جب دریائے سندھ کو عبور کرنے لگا تو کشتی الٹ گئی اور یہ ڈوب کر مر گیا..... اسی طرح اس دریا کو عبور کرنے کی جدوجہد مہاراجہ رنجب سنگھ نے کی اور اسے اپنے..... ہزاروں گھڑ سواروں کی فوج سے ہاتھ دھونا پڑے..... شاہ شجاع نے اس دریا کو بڑی مہارت اور کامیابی سے عبور کیا..... مگر اس کی اس کامیابی کو معمولی سمجھا گیا..... محمد بن قاسم کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ قوم کو کسی نہ کسی طریقے سے دریا پار کروائے..... آخر سوچ بچار کے بعد سینکڑوں کشتیاں اپنی فوج سے تیار کر دئیں..... بعد میں ان کو سیدھا کر کے باندھ دیا گیا۔ ان میں پتھر اور ریت بھر دی گئی۔ جس سے کشتیاں مضبوط جم گئیں اور ریت سے ہموار کر کے اپنی قوم کو بحیرہ ریت پار کرایا..... اس دریا میں مچھلیاں، لدھر، کچھوے اور لمبی تھوٹھنی والے مگر چمچ

بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ دریا جب کوہ سلیمان کے نزدیک سے بہتا تھا۔ تو اس وقت اس کا پاٹ 480 سے 1600 گز تک تھا۔ سیلاب کے وقت بغض جگہوں پر دو کلو میٹر تک بڑھ جاتا تھا۔ اس کی گہرائی تقریباً 4 سے 24 فٹ تک ہوتی تھی۔ اور اب ہم اسی گہرائی والے دریا کے پل پر پہنچ گئے۔ پانی کا ایک اتھاہ سمندر تھا جس کو دیکھ کر خوف کا احساس ہوتا تھا۔ اس پل کو ”غازی گھاٹ پل“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پل کی تعمیر 1984ء میں ہوئی۔ اس کے 23 درے ہیں۔ 3410 فٹ لمبا ہے۔ یہاں پر غازی گھاٹ کا پاٹ 10 میل چوڑا ہے۔ سڑک گھاٹ سے کافی اونچی بنائی گئی ہے۔ اس پل نے ڈیرہ غازی خان کو پنجاب سے جوڑا ہوا ہے۔ ورنہ ملتان جانے کے لئے تو نہ بیراج کی طرف سے جانا پڑتا تھا۔ اس طرح کئی گھنٹے زیادہ صرف ہوتے۔

اس پل کی تعمیر سے تقریباً 92 کلو میٹر کا فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ غازی گھاٹ میں ایک بڑا جنگل بھی ہے۔ جو پہلے عیس والہ جنگل کے نام سے مشہور و معروف تھا۔ یہ جنگل تقریباً 2106 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جب پل سے کوئی بیوی چیز گزرتی تو پل ہلتا..... جس سے دل دہل جاتا۔ ایسے لگتا کہ خدا خواستہ پل ٹوٹ جائے گا۔ حالانکہ اس میں لچک رکھی ہوتی ہے۔ پل کے اختتام پر ٹول پلازہ بنا ہوا ہے۔ اس سے آگے پھر غازی گھاٹ کا پرفریب دلکش اور پر ہیبت علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف قطار درخت لگے ہوئے ہیں۔ اور خود رو گھاس پھوس کی جھاڑیاں پانی میں سر نکالے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔ کہیں کہیں پانی سبزی مائل ہے۔ یہاں پر فٹ فارم بکثرت بنے ہوئے ہیں ہم کچھ تیز رفتار جا رہے ہیں تاکہ بروقت منزل پر پہنچ جائیں۔ یہاں پر ٹریفک کافی ہیوی ہو جاتی ہے..... ڈرائیونگ بڑے محتاط انداز میں کرنی پڑتی ہے۔ (باقی آئندہ)

☆.....☆.....☆

# رنگ جہاں

الکھرونی صفحات میں

دو عالمے رنگ و نور، شوبز مصالحوں، ریشمی سندھیے، باورچی خانہ، خودکلامی، آپ کے اور  
چوٹی میں، باتیں صحت کی، رنگ خیال، الف کے اچھے بے بچے اور انٹرویو

# دنیا رنگ و نور

فلم اور ٹی وی کہ چمکتے ستاروں سے باتیں، ملاقاتیں

## معروف گلوکارہ حدیقہ کیانی کے فنکارانہ سفر کی کہانی

برداشت کیں اور آخر وہ وقت بھی آیا جب حدیقہ کو حکومت نے اس فن کے اعتراض میں ستارہ امتیاز سے بھی نوازا۔

تین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی حدیقہ کو

حدیقہ کیانی کا شمار پاکستان کی مقبول ترین پاپ سنگرز میں ہوتا ہے حدیقہ کیانی نے پاکستان میں وی جے کی بنیاد رکھی اور اپنی میزبانی کے ذریعے ایک شناخت بنانے میں کامیاب رہی۔ اس کے فنکارانہ سفر



بچپن سے ہی موسیقی کا شوق تھا وہ راولپنڈی میں 11 اگست 1974ء کو پیدا ہوئی۔ وہ ابھی تین برس کی تھی جب اس کے والد وفات پا گئے۔ اس کی والدہ اعلیٰ

اورنجی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے، لیکن اس نے استقامت کے ساتھ اپنا فنکارانہ سفر جاری و ساری رکھا، اس نے اپنے خلاف عائد کی گئی حکومتی پابندیاں بھی



## ایکسیڈنٹ

شوہر نے بیوی کو کار کی چابی دیتے ہوئے پیار سے کہا  
”ڈارلنگ اگر رستے میں تم نے کوئی ایکسیڈنٹ  
کیا اور حادثے میں تم مر گئیں تو اخبار والے  
تمہاری اصل عمر ضرور لکھیں گے اس لئے گاڑی  
احتیاط سے چلانا۔“

(حافظ عمر، لاہور)

ہوئی۔ جس کے باعث وہ تقریباً ایک برس موسیقی سے  
لا تعلق رہی اور اس نے مزید الہمز پر کام نہ کیا۔ بلکہ  
ملکی اور غیر ملکی دوروں کے ذریعے اپنے میوزک کو  
زندہ رکھا۔ پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے حدیقہ  
نے کئی اہم غیر ملکی شخصیات کے سامنے پر فارم کیا۔  
2005ء کے ہولناک زلزلے کے باعث کئی بچے  
یتیم ہوئے، ایسے میں حدیقہ نے ایک بچے کو گود لے  
کر ایک نئی اور عمدہ روایت کو جنم دیا اور لوگوں کے  
لئے مشعل راہ بنی۔

2006ء میں موسیقی کی خدمت کے صلے میں  
حدیقہ کو تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔ جو کسی بھی پاکستانی  
کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایک نئے  
تجربے کے طور پر حدیقہ نے 2007ء میں موسیقار  
عامر ذکی کے ہمراہ اپنی نئی انگریزی البم ”رف  
کٹ“ ریلیز کی جو کسی بھی پاکستانی سنگر کی پہلی مکمل  
انگلش البم ہے لیکن لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا اس  
زبان سے نااہل ہونے کے باعث یہ البم اچھا  
کاروبار نہ کر سکی۔

حدیقہ کیانی جدید موسیقی کے حوالے سے پاکستان  
کی پہچان بن چکی ہے اور اس کی آواز کے شائقین اس  
کے ہر نئے گیت کے منتظر رہتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

تعلیم یافتہ اور گورنمنٹ سکول کی پرنسپل تھیں، انہوں نے  
اپنے بچوں کو نہایت حوصلے سے پالا۔ حدیقہ کے مطابق  
اس نے بچپن میں بچوں کے مختلف بین الاقوامی میوزک  
فیسٹیول میں حصہ لیا، مختلف زبانوں میں گانے گائے اور  
کئی تمغے بھی حاصل کئے۔ اس نے معروف موسیقار  
سمیل رانا کے موسیقی پروگرام ”رنگ برنگ دنیا“ سے  
ساز و آواز کی دنیا میں قدم رکھا۔ ٹی وی سے حدیقہ کا  
بھرپور تعارف بطور میزبان ہوا جب اس نے 1991ء  
میں پی ٹی وی کی پیشکش اور بچوں کے مقبول پروگرام  
”آئنگن آئنگن تارے“ کی میزبانی شروع کی۔ اس  
پروگرام میں بچے موسیقی کی مختلف طرزوں پر گیت  
سناتے تھے، جبکہ میزبان کے طور پر حدیقہ سر پر دوپٹہ  
اوڑھے بچوں کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے نظر آتی تھی۔  
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی میڈیا بھی  
عالمی معیار کے تقاضوں کے ہم آہنگ ہوا، این ٹی ایم  
کے شروع ہوتے ہی کئی نئے میوزک پروگرامز کئے  
جانے لگے..... جن میں پاکستانی موسیقی نئے رجحانات  
کے ساتھ سننے کو ملی۔ انہی میں سے ایک مقبول پروگرام  
”میوزک چینل چارٹس“ کو بے حد پذیرائی ملی، اس  
پروگرام کی وی جے حدیقہ کیانی تھی۔ نوجوان اس کو  
بہت پسند کرتے تھے۔ اسے سب سے بڑا بریک اس  
وقت ملا جب اس نے عدنان سمیع خان کی فلم ”سنگم“  
میں پلے بیک سنگر کے طور پر اپنی آواز کا جادو جگایا، جو  
لوگوں کے دلوں کو چھو گئی۔ حدیقہ اپنی گلوکاری کے لئے  
کئی ایوارڈز جیتنے میں کامیاب رہی اور ایک نوجوان منجھی  
ہوئی گلوکارہ کے طور پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب  
ہوئی۔

حدیقہ کیانی کی ریلیز ہونے والی ہر البم کو  
شائقین موسیقی نے بہت پسند کیا جس کے باعث اس  
کی مقبولیت کا گراف دن بدن بلند ہوتا چلا گیا۔ لیکن  
2003ء میں اس کی پانچ سالہ شادی اختتام پذیر



آپ اور آپ کے مہمانوں کی جان  
چٹ پیٹ اور مزیدار پکوان

ترتیب: مشعل فاروقی

رمضان سپیشل

ایک عدد (باریک کٹا ہوا) پیاز  
ایک چائے کا کپ (کٹی ہوئی) بند گوشتی  
ایک کھانے کا چمچ سبز دھنیا  
5 عدد (باریک کٹی ہوئی) سبز مرچیں  
حسب ذائقہ نمک  
آٹا گوندھنے کے لئے اجزاء:  
تین کپ گندم کا آٹا  
1/2 چائے کا چمچ نمک  
پراٹھا تلنے کیلئے گھی

ترکیب:

پنیر، پیاز، بند گوشتی، دھنیا، سبز مرچیں اور نمک کو اچھی طرح ملا کر گوندھیں۔ مادہ سخت رہے، پھر چار پیڑے بنا کر بنالیں۔ گھی لگا کر پرت دیں۔ اسی طرح کئی بار کے عمل کے بعد تیل کر تلیں یا پھر ماہی توے پر گھی کے پتے پکاردے کر پکائیں۔ مزیدار میٹھے پراٹھے تیار ہیں۔

بھرت والے پراٹھے بنائیں ایک پیڑا لیں اور بھرت کو پیڑے کے درمیان میں رکھ کر بنالیں۔ گرم گرم پراٹھے پیش کریں۔

☆.....☆.....☆

میٹھے پراٹھے

اجزاء:

1/2 کلو میدہ  
حسب ضرورت گھی  
ایک پاؤ دودھ  
ایک پاؤ شکر  
ایک عطر میٹھا عطر

ترکیب:

پہلے شکر کو دودھ میں کس کریں تاکہ گھل جائے۔ پھر میدہ ملا کر گوندھیں۔ مادہ سخت رہے، پھر چار پیڑے بنا کر بنالیں۔ گھی لگا کر پرت دیں۔ اسی طرح کئی بار کے عمل کے بعد تیل کر تلیں یا پھر ماہی توے پر گھی کے پتے پکاردے کر پکائیں۔ مزیدار میٹھے پراٹھے تیار ہیں۔

☆.....☆.....☆

پنیر کے پراٹھے

اجزاء:

بھرت کے لئے:

225 گرم (8 اونس)

پنیر



## مٹر کے پراٹھے

اجزاء:

2 کپ (اے ہوئے)

5 عدد (باریک کٹی ہوئی)

ایک چائے کا چمچ

ایک کھانے کا چمچ

حسب ذائقہ

آٹا گوندھنے کے لئے اجزاء:

تین کپ

دو کھانے کے چمچ

پراٹھے تلنے کیلئے

مٹر

بزم زمیں

سفید زیرہ

گھی

نمک

آٹا گوندھنے کے لئے اجزاء:

گندم کا آٹا

گھی

گھی

## ترکیب:

اے ہوئے مٹر پیس لیں۔ برتن میں گھی گرم کریں اور زیرے کو بھون لیں۔ اس میں بزم زمیں ڈال کر ایک منٹ کے لئے فرنی کریں اور پھر مٹر اور نمک بھی شامل کر دیں۔ ایک منٹ تک پکائیں اور مرکب کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ آٹا بنانے کے لئے: آٹے کو نمک ملا کر چھان لیں۔ آٹے میں گھی شامل کریں۔ اچھی طرح گوندھ کر دس یا بارہ پیڑے تیار کر لیں۔ ایک چھوٹا پیڑا لے کر تھوڑا سا تیل لیں اور درمیان میں ایک چمچ مٹر کا آمیزہ رکھیں۔ کناروں کو درمیان میں لا کر جوڑ دیں۔ میوہ چھڑک کے تختے پر تیل کر تھالی یا پین کے سائز جتنا کریں۔ توے یا فرانک پین پر پراٹھا ڈالیں، ایک یا دو منٹ تک پکا کر دوسری پرت اوپر کریں ایک منٹ کے بعد تھوڑا سا گھی کناروں کے گرد لگائیں اور پراٹھے کو دوبارہ پلٹ دیں اور دوسری طرف سے فرنی کر لیں۔ جب دونوں طرف بھورے دھبے نمایاں ہوں گے تو پراٹھا تیار ہے۔

☆.....☆.....☆

## انڈے کا پراٹھا

اجزاء:

1/2 کلو

میوہ

ایک عدد  
حسب ضرورت  
ایک پاؤ  
1/2 کپ

انڈہ  
گھی  
شکر

دودھ

## ترکیب:

پہلے شکر کو دودھ میں مکس کر لیں تاکہ شکر گھل جائے پھر میوہ اور انڈہ ملا کر گوندھیں۔ مادہ سخت رہے پھر چار پیڑے بنا کر تیل کر گھی لگا کر پرت ڈالیں اور تیل کر بڑھائیے۔ گھی لگا کر پرت دیں۔ اسی طرح کئی بار کے عمل کے بعد تیل کر تلیں یا پھر ماہی توے پر گھی کے پکاردے کر پکائیں۔ مزیدار میٹھے پراٹھے تیار ہیں۔

☆.....☆.....☆

## کھجور کے لڈو

اجزاء:

ایک پاؤ (گٹھلیاں نکل کر پیس لیں)  
ایک کپ (پلام پستہ کٹے ہوئے)  
تین کھانے کے چمچ  
ایک کھانے کا چمچ

کھجوریں  
میوہ جات  
شہد  
لیموں کا رس

## ترکیب:

پسی ہوئی کھجوروں میں باریک کٹے ہوئے میوہ جات، شہد، لیموں کا رس، اچھی طرح ملا دیں۔ اس مرکب سے چھوٹے چھوٹے Balls بنالیں۔ ایک کپ مزید خشک میوہ جات کو باریک کاٹ کر اخبار پر پھیلا کر Balls کو اس میں رول کریں یا پلاسٹک کے لفافے میں میوہ جات ڈال کر کھجور کے بالز اس میں تھوڑے تھوڑے کر کے ڈال کر خوب ہلائیں تاکہ ان پر میوہ جات اچھی طرح چپک جائیں۔ فریج میں رکھ لیں۔ کھانے کے بعد سویٹ ڈش کے طور پر یا چائے کے ساتھ پیش کریں۔ تقریباً 30 بالز بننے ہیں ایک انچ سائز کے۔

☆.....☆.....☆

## آم کا شربت

## کھٹے میٹھے دہی بڑے

اجزاء:

آم کی چھلی ہوئی پھانکیں ڈیڑھ کلو  
عرق گلاب 1½ کلو  
شکر 2 کلو

اجزاء:

دہی ایک کلو  
چینی 2 کھانے کے چمچ  
بیسن ایک پاؤ  
سکھی یا تیل حسب ضرورت  
نمک حسب ذائقہ  
میٹھا سوڈا ایک چمچی  
سرخ مرچیں حسب ذائقہ  
اچھور ایک چائے کا چمچ

### ترکیب:

آم کے چھلکے اتار کر ان کی گھولیاں پھینک دیں اور گودے کو عرق گلاب میں آدھا گھٹنے تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ اس کے بعد گودے کو باریک کپڑے میں رکھ کر پھوڑ لیں۔ پھر شکر میں پانی ملا کر آگ پر رکھ لیں اور چاشنی بنالیں۔ اس کے بعد آم کا رس بھی ملا دیں اور پون گھٹنے تک اس کو ابال لیں۔ آم کا نہایت عمدہ اور لذیذ شربت تیار ہے جو کہ دل و دماغ کو تازگی عطا کرتا ہے۔

☆.....☆.....☆

## شربت املی

اجزاء:

املی ½ پاؤ  
پانی ½ کلو  
چینی 3 پاؤ

### ترکیب:

ایک دہنچی میں آدھا کلو پانی اور املی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں اور پکنے دیں اور جب پانی پانچ چھٹا تک رہ جائے تو اتار کر کپڑے میں چھان لیں اور اس میں چینی ملا کر پھر چولہے پر چڑھا کر قوام تیار کر لیں۔ جب قوام تیار ہو جائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے پر بوتلوں میں بھر لیں۔ یہ شربت معدے کے لئے نہایت بہترین ہے۔ تے یا ابکائیں آ رہی ہوں تو اس شربت کے استعمال سے طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ افطاری میں فرحت بخشا ہے۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

سب سے پہلے بیسن میں نمک مرچ اور سوڈا ملا کر بھگو دیں اور پھر ایک گھٹنے کے بعد کڑا ہی میں سکھی یا تیل گرم کر کے اس کی چھوٹی چھوٹی گول گول پکڑیاں تل لیجئے اور پھر ایک کھلے منہ کا برتن لیں اور اسے پانی سے بھر لیں اور پکڑیاں تل کر اس میں ڈالتے جائیں۔ سنہری رنگ کی پکڑیاں تلنے اور اتنا خیال رکھیے کہ پکڑیاں ٹوٹنے نہ پائیں۔ بلکہ ثابت ہی رہیں۔ اس کے بعد دہی کو کانٹے یا پیڑ سے پھینٹ لیں اور پھر اس میں 2 کھانے کے چمچ چینی ملا دیں۔ پھر اس میں تھوڑا سا اچھور کا سفوف ڈال کر مکس کر لیں۔ اتنا پھینٹیں کہ دہی ایک جان ہو جائے۔ اس کے بعد پھر پکڑیوں کو پانی سے نکال کر دہی میں ملا دیں اور انہیں کچھ دیر کے لئے فریزر میں رکھ دیں۔ پھر نکال کر اس میں برف ڈال کر اسے ٹھنڈا کر لیں پھر اس پر چاٹ مصالحہ چھڑکیں اس میں تھوڑی سی ٹائری ملا لیں۔ مصالحہ چھڑکنے کے بعد پیش کریں اور خود بھی نوش فرمائیں۔ یہ ایک بہترین کھٹے میٹھے دہی بڑوں کی ڈش ہے۔ مزے سے تناول فرمائیں۔

نوٹ: اس کو آپ پیاز اور ہر دھنی سے گارنش کر سکتی ہیں۔

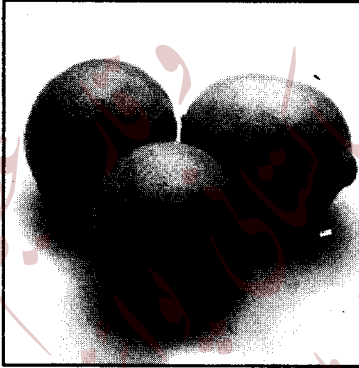
## لیموں

ماہم محفوظ

نہ ہو، منہ کا مزہ خراب ہو تو کائے ہوئے لیموں پر نمک اور کالی مرچ باریک چھڑک کر چبانے سے منہ کا مزہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور غذا کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

بڑھی ہوئی تلی کو کم کرنے کے لئے بھی لیموں کا استعمال مفید ہے۔ لیموں کو کاٹ کر اس پر تھوڑا نمک لاہوری، سہاگہ، نوشادر اور کالی مرچ باریک پیس کر چھڑکیں اور مریض کو دن میں دو تین بار چسائیں۔ چند روز تک اسے دیتے رہیں، تلی کھل کر اصلی حالت پر آ جائے گی اور ساتھ ہی معدہ اور جگر کو قوت بھی پہنچے گی۔

باہر استعمال کیا جائے تو بھی لیموں بڑے فائدہ کی چیز ہے۔ چنانچہ لیموں کاٹ کر چہرے پر ملنے سے داغ، دھبے، مہاسے اور چھائیاں دور ہو جاتی ہیں۔ لیموں کا رس اور روغن چھلکی برابری وزن ملا کر مالش کرنے سے سوکھی کھلی جاتی رہتی ہے۔



یرقان: (پیلیا) میں آنکھوں کی زردی لیموں کا رس ٹپکانے سے دور ہو جاتی ہے۔ اگر تکسیر جاری ہو اور اس کا بند کرنا مشکل ہو تو ناک میں تازہ لیموں کے رس کی پچکاری کرنے سے تکسیر فوراً بند ہو جاتی ہے۔ سر کی بفا (بھوسی) لیموں کے رس میں شکر ملا کر لگانے سے جاتی رہتی ہے۔

چھو، بھڑکائے ہوئے پر لیموں کا رس لگانے سے درد اور جلن دور ہو جاتی ہے۔

بالوں کو گرنے سے محفوظ رکھنے اور ان کو لمبا کرنے کے لئے آملہ لیموں کے رس میں پیس کر لگاتے ہیں۔ اس کے لئے یہ نہایت مفید دوا ہے۔

لیموں کا اجار بھی ڈالا جاتا ہے جو کھانے کو ہضم کرتا اور بھوک خوب لگاتا ہے۔ موسم برسات میں جب کہ میٹیریا بخار یا ہیضہ پھیلا ہوا ہو، غذا کے ساتھ اس کا استعمال ان مرضوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

لیموں (نی بو) مشہور پھل ہے۔ اس کے نچوڑنے سے کھٹارس نکلتا ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق اس رس میں جیاتین ج (وٹامن سی) کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جیاتین ب (وٹامن بی) بھی اس میں موجود ہوتا ہے۔ لہذا اس کا رس خون کو درست حالت میں رکھتا ہے، معدہ آنتوں کو اچھا رکھتا ہے، غذا کو ہضم کرتا اور بھوک خوب لگاتا ہے، مرض سکروڈی (جس میں خون کی ترکیب

میں خلل پڑ جاتا ہے، مسوڑے پلپے پڑ جاتے ہیں اور سونج جاتے ہیں اور ان سے خون بننے لگتا ہے اس کے استعمال سے دور ہو جاتا ہے۔

لیموں کا رس عام طور پر دال، ترکاریوں میں نچوڑ کر استعمال کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے غذا رغبت سے کھائی جاتی ہے، کھائی ہوئی غذا ہضم ہو جاتی ہے اور بھوک خوب لگتی ہے۔

ہیضہ وغیرہ وبائی مرضوں میں غذا کے ساتھ اس کا استعمال بہت فائدہ دیتا ہے۔

لیموں کا رس صفرا کی زیادتی کو کم کرتا اور پیاس کو بجھاتا ہے۔ اس فائدے کے لئے گرمیوں میں لیموں کا آب شورہ بنا کر پیتے ہیں، یعنی چھنی کو پانی میں حل کر کے شربت بناتے ہیں اور پھر اس میں لیموں کا رس نچوڑ کر پیتے ہیں۔ اس سے دل و دماغ کو سکین ہوتی ہے اور پیاس بجھ جاتی ہے۔

صفراوی بخاروں میں جب کہ مرض کو پیاس بہت ستائے، بدن میں گرمی اور جلن ہو تو لیموں کا آب شورہ بنا کر پلانے سے فوراً سکین حاصل ہوتی ہے۔

صفراوی بخاروں میں جب کہ مریض تھکے اور متلی سے پریشان ہو تو لیموں کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے پر ذرا سا نمک چھڑک کر چمانے سے یہ شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔ زمانہ حمل کی تھک بھی اس سے بند ہو جاتی ہے۔

صفراوی بخاروں میں جب کہ مریض کو غذا کی رغبت

## ترتیب: راشدہ انور

طویل ہو نہ کہیں اپنی چاہتوں کا سفر  
سنا ہے اہل طلب عمر بھر تڑپتے ہیں  
(شیخ اجاز، لاہور)

بے دم ہوں مگر ساتھ نہ چھوڑوں گا تمہارا  
تم لوگ مسافر ہو تو میں گرد سفر ہوں  
(نصرت آرزو، قصور)

کچھ وقت چاہیے تھا کہ سوچیں تیرے لئے  
تو نے وہ وقت ہم کو زمانے نہیں دیا  
(حسین گوندل، ساہیوال)

ڈھانے جو نفرتوں کے برہنہ وجود کو  
ایسی چھی کوئی پیار کی چادر تلاش کر  
(رومینہ، آزاد کشمیر)

بات کہنے کی ہمیشہ بھولے  
لاکھ انگشت پہ دھاگا باندھا  
(جمیل انیس، کراچی)

یہ حسن، یہ ادا، یہ نزاکت، یہ باکپن  
سب خوبیاں ہیں تجھ میں مگر بے وفا ہے تو  
(عامر شہزاد، لاہور)

لے کر چنگی میں نمک آنکھ میں بھر کر آنسو  
اس پہ مچلے ہیں کہ ہم زخم جگر دیکھیں گے  
(عبدالغفور، پشاور)

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز  
کچا تیرا مکان، کچھ تو خیال کر  
(فصیحہ آصف خان، ملتان)

تو نے پرکھا نہیں میرے جذبات کو  
دستِ قلب ہے کوئی صحرا نہیں  
جائیے تو سبھی لوگ ہیں آپ کے  
سوچے تو کوئی ایک اپنا نہیں  
(گہت غفار، کراچی)

کوئی وسیلہ میرے شہر کے چراغوں کو  
جلا رہا ہے ہواؤں کے ان پھیروں میں  
(ہماشاہ، ہارون آباد)

سو پھول کم ہے وہیں سجانے کیلئے  
اک پھول کافی ہے قبر سجانے کیلئے  
سو خوشیاں کم ہے اک غم بھولنے کیلئے  
اک غم کافی ہے ساری عمر رلانے کیلئے  
(شاہ روم خان، کراچی)

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا  
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے  
(پرنس افضل شاہین، بہاولنگر)

پھر اس کے بعد تو آنکھوں میں بس گیا وہ شخص  
اگرچہ ہم نے اسے بے دلی سے دیکھا تھا  
(کاشف، دہاڑی)

ہم نے پالا مدتوں پہلو میں تو کچھ بھی نہیں  
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا  
(ضمیر حسین، ڈسک)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

میں نہ کہتا تھا کہ چاہت میں اجڑ جائے گا  
تو بڑی دیر کے بعد اے دل ناداں سمجھا  
(شمینہ عثمان، گوجرانوالہ)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

ہجر کی شب مری تنہائی پہ دستک دے گی  
تیری خوشبو مرے کھوئے ہوئے خوابوں کی طرح  
(سلیمی سدرہ، اڈاکاڑہ)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

مصلحت نے لے لیا ہے پیار کا درجہ اگر  
میں کس کے ہجر میں کیوں آنکھ کو پریم کروں  
(پردین عزیز، ملتان)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

گماں ہے گوہر نایاب کا جھوٹے نگینوں پر  
نئی تہذیب میں کھو آئے ہم آنکھوں کی بینائی  
(اسحاق خان، پشاور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

محسن ہی سمجھتے ہیں غم دوست تجھے ہم  
دشمن تو کبھی دل میں بسائے نہیں جاتے  
(حنانا زمری)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

پچھلے برس یہ خوف تھا تجھ سے بچھڑ نہ جاؤں  
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو  
(قیصر محمود جٹ، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

انا کے موڑ پہ بچھڑے تو ہم سفر نہ ملے  
ہم ایک شہر میں رہ کے بھی عمر بھر نہ ملے  
(شہلا ناز، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

نفس کو آج پہ اور وہ بھی عمر بھر رکھنا  
بڑا محال ہے ہستی کو معتبر رکھنا  
(بابر عباس، راولپنڈی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

جلنے کو جلے ہم بھی تری بزم میں لیکن  
ہم سوختہ جانوں کا کہیں نام نہ آیا  
(صوفیہ اصغر، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر ہے  
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے  
(ذونیرہ، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

اس کی آنکھیں کہ چمکتے ہوئے جگنو جیسے  
اس کی آنکھوں کے سحر سے تو نکل کر دیکھو  
(فری نیاز، کراچی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

راہ وفا کے فاصلے کچھ معتبر نہ تھے  
اچھا ہوا کہ آپ میرے ہم سفر نہ تھے  
(فرید احمد، پاکپتن)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

اپنی خواہش سے کروں اپنی انا کا سودا  
باغی شاہ بھی ہوں طالب شہزادی بھی  
(شگفتہ، کراچی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

دیکھتا ہوں تو ہے ہر چیز سلامت گھر میں  
سوچتا ہوں تو رہا کچھ بھی نہیں تیرے بعد  
(صائقہ فیصل، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

خوب پردہ ہے کہ چلن سے لگے بیٹھے ہیں  
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں  
(مجاہد حسین، سرگودھا)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

# آپ کے اوراق

بازوق قارئین کے حاصـل مطالعہ کی خوبصورت جھلک

ترتیب: سعدیہ عقیل

## ہمدردی

ایک جیلر سزائے موت کے قیدی کو تسلی دے رہا تھا۔ بہت سی قانونی اور لاقانونی باتوں کے بعد جیلر نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا: ”بھئی! ہم سے تم لاکھ درجے بہتر ہو۔“

”کیسے جناب۔“

جیلر نے فلسفیانہ انداز میں آنکھیں نیم باز کر کے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

”میاں تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ صاف ستھرا پختہ کمرہ رہنے کو۔ دو وقت کی کچی پکائی روٹی کھانے کو، ذرا سی تکلیف پر ڈاکٹر حاضر اور پھر سارا دن اس رب کی یاد کے سوا کوئی کام نہیں اور ہم نہ دن کو چین نہ رات کو آرام، کبھی یہ فکر، کبھی وہ، جیل کا انتظام الگ۔ تم رات بھر پیر پیار کر سوتے ہو اور ہم آدھی رات تک گشت پر۔ صرف اس لئے کہ تمہارے آرام میں کسر نہ رہے۔“

قیدی سر جھکائے ستار ہا اور جنوبی جیلر نے اپنی تقریر کے اختتام پر ٹھنڈی سانس بھری، قیدی نے اپنی ٹھنڈی سانس اس میں ملا کر آہستہ سے کہا۔

جناب! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ مجھ سے جگہ بدل لیجئے۔ (سیدہ نسبت زہرا، کھروڑپکا)

\*\*\*\*\*

## سج

ایک نوجوان بڑے جوش سے پادری سے کہہ رہا تھا

## حضور اکرمؐ نے فرمایا

سیدنا ابو موسیٰؓ، نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ ”نیک ساتھی اور برے ساتھی کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی۔ مشک والا یا تو تجھے یونہی تجھے کے طور پر سونگھنے کو دے دے گا یا تو اس سے خرید لے گا یا تو اس سے اچھی خوشبو پائے گا اور بھٹی پھونکنے والا تو تیرے کپڑے جلا دے گا یا تجھے بری بو سونگھنی پڑے گی“ (یعنی اچھے اور برے ساتھی کے اثرات آدمی پر مرتب ہوتے ہیں)

(صحیح مسلم)

\*\*\*\*\*

## گناہ

پہلے گناہ پر لطف معلوم ہوتا ہے پھر وہ آسان ہو جاتا ہے پھر اس سے مسرت و شادمانی ہونے لگتی ہے پھر وہ بار بار کیا جاتا ہے پھر وہ فطرت بن جاتا ہے۔ پھر آدمی گستاخ ہو جاتا ہے اور کبھی نہ پچھتانے کا تہیہ کر لیتا ہے اور پھر وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

☆ جہل سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔

☆ گناہ پر نادم نہ ہونا ایک ایسا مرض ہے، جس کا کوئی علاج نہیں۔

(فریدہ، سیالکوٹ)

\*\*\*\*\*

- ☆ محبت اور عداوت کبھی پوشیدہ نہیں رہتی۔
- ☆ ماں کی محبت حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔
- ☆ خدا کی محبت اور انسان دوستی میں ذریعہ نجات ہے۔

(فیصلہ آصف خان ملتان)

\*\*\*\*\*

## غزل

گلے ملا نہ کبھی چاندِ بخت ایسا تھا  
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا  
ستارے سسکیاں بھرتے تھے اوس روتی تھی  
فسانہ جگر لخت لخت ایسا تھا  
زرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے  
چٹ کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا  
یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک  
کوئی نہ سہہ سکے لہجہ کرخت ایسا تھا  
کہاں کی سیر نہ کی تو سن تخیل پر  
ہمیں تو یہ بھی سلیمان کے تخت ایسا تھا  
ادھر سے گزرا تھا ملک خن کا شہزادہ  
کوئی نہ جان سکا ساز و درخت ایسا تھا  
(شاعر: خلیب جلالی، انتخاب: عائشہ نیاز، لاہور)

\*\*\*\*\*

## ماں

جب ماں کو اللہ تعالیٰ نے بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا۔  
چاند کی ٹھنڈک، شبنم کے آنسو، بلبل کے نغمے، چکوری کی  
ترپ، گلاب کا رنگ، پھول کی مہک، کوئل کی کوک،  
سمندر کی گہرائی، دریاؤں کی روانی، موجوں کی خوشی،  
کھکشاں کی رنگینی، صبح کا نور اور آفتاب کی تمازت کو جمع  
کریں تاکہ ماں کی تخلیق کی جائے جب اللہ تعالیٰ نے  
ماں کو بنایا تو فرشتوں نے پوچھا اے مالک دو جہاں تو  
نے اس میں اپنی طرف سے کیا شامل کیا۔  
تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”محبت“

(سید ابوبکر، بھکر)

\*\*\*\*\*

”پہلے روز میں نے بارہ مچھلیاں پکڑیں، اگلے روز پندرہ  
اور پھر اس سے اگلے روز۔“

پادری نے متانت سے جواب دیا: ”جب میں  
تمہاری عمر کا تھا تو ہر روز درجنوں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا  
مگر پھر افسوس کہ میں پادری بن گیا اور میں نے جھوٹ  
بولنا ترک کر دیا۔“

(نمرا۔ کراچی)

\*\*\*\*\*

## احتیاط

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وآلہ وسلم سے کہا  
”میں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔“  
لوگوں نے سنا تو بہت تجسس ہوئے اور صحابیؓ سے  
پوچھا کہ کیوں طلاق دے رہے ہو۔ کیا برائی ہے اس میں؟  
صحابیؓ نے کہا: ”ابھی تو میں اس کی برائیاں نہیں بتا  
سکتا۔ کیونکہ ابھی تو وہ میری بیوی ہے طلاق کے بعد بتاؤں  
گا کہ کیوں طلاق دی۔ کیا کیا برائیاں تھیں اس میں۔“  
جب صحابیؓ نے طلاق دے دی تو لوگ ان کے  
پاس آئے اور پوچھا:  
”اب بتا میں اس عورت کو آپ نے کیوں  
چھوڑا؟“

تو صحابیؓ نے کہا۔

”میں تو اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ تو  
اب میرے لیے نامحرم ہو گئی ہے۔ اور اب میرا اور اس کا  
کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرے منہ سے کوئی غلط بات نکل  
گئی تو خواہ مخواہ اس کی زندگی پر اثر پڑے گا۔“  
(علی احمد، کراچی)

\*\*\*\*\*

## محبت

☆ محبت کتنی طاقتور ہے جو کسی بھی لمحے ایک وحشی کو  
انسان اور ایک انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔

تمہیں کوفت اور ذہنی اذیت ہوتی ہوگی۔“ پہلے نے ہم  
رردی سے کہا۔

”مداخلت کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن میرے  
پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ ہر لفظ کی اسپیلنگ کے  
لئے ڈکشنری دیکھتا رہوں۔“

(سلمیٰ شیخ، راولپنڈی)

\*\*\*\*\*

## رکاوت

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت  
حمزہؓ سے کسی نے پوچھا ”آپ پہلے میدان جنگ میں  
زرہ بکتر پہن کر آیا کرتے تھے، آج کل اس کے بغیر  
آتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟“

حضرت حمزہؓ نے فرمایا ”اسلام قبول کرنے سے  
پہلے میں موت کو خاتمہ حیات سمجھتا تھا اس لئے جان کی  
حفاظت کرتا تھا۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے  
فیض سے موت کو جنت کا درسمجھتا ہوں، اس لئے زرہ  
بکتر ترک کر دی ہے تاکہ میرے اور جنت کے درمیان  
کوئی رکاوٹ نہ رہے۔“

(ثمینہ عثمان، لاہور)

\*\*\*\*\*

## کس کے لئے

کس کے لئے وہ گیت لکھوں  
سارے عالم کے شہروں میں جس کی گونج سنائی  
دے۔

جس کو سن کر چشم جہاں، کو خواب نیا دکھلائی دے۔  
کس کے لئے وہ گیت لکھوں۔

(مرسلہ: مدیحہ شاہد، کراچی)

\*\*\*\*\*

## ذرا سنئے!

☆ شادی ایک ایسا بھنڈ ہے جس میں دوشریف شہر ہیں  
کوٹہ کوٹہ ایک دوسرے سے لڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

## قابل دید

کالج کے کسی پروفیسر کو کسی وجہ سے مکان چھوڑ کر  
دوسری جگہ فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ فلیٹ چوتھی منزل پر  
تھا۔ مزدور کتابوں کے بندل چوتھی منزل تک پہنچاتے  
پہنچاتے تھک گیا۔

ساتویں پھیرے میں وہ سر پکڑ کر عاجزی سے  
بولے۔ ”پروفیسر صاحب! آپ یہاں منتقل ہونے سے  
پہلے اگر یہ سب کتابیں پڑھ لیتے تو آج مجھے اتنی  
مصیبت نہ اٹھانا پڑتی۔“

(محمد عاصم صدیقی، ملتان)

\*\*\*\*\*

## لباس

دولت کا لباس تجارت ہے  
آدمی کا لباس علم ہے  
مومن کا لباس نماز ہے  
غریب کا لباس عزت ہے  
گھر کا لباس سکون ہے

انسان عقل سے پہچانا جاتا ہے شکل سے نہیں۔  
تم غلام ہو اس شخص کے سامنے جس سے محبت کرتے ہو  
اس لئے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔  
انسان کی خوبیوں کا مرکز زبان ہے۔

(ربیعہ انعام، حیدرآباد)

\*\*\*\*\*

## مسئلہ

ایک دفتر کے سربراہ نے دوسرے دفتر کے سربراہ  
سے پوچھا، ”بھئی تم نے اپنی سیکرٹری کو دفتر سے کیوں  
نکال دیا؟“

”اسے اسپیلنگ ہی نہیں آتے تھے۔ جب بھی کوئی  
خط لکھوانے بیٹھتا تو وہ ہر لفظ کے اسپیلنگ پوچھتی رہتی تھی۔“  
”یہ تو واقعی بڑا مسئلہ تھا۔ بار بار کی مداخلت سے



## شادی اور گھونگھٹ

دنیا میں تقریباً ہر شخص کی شادی ہوتی ہے اور دولہا شادی کے وقت گھونگھٹ بھی اٹھاتا ہے۔ آدمی جو کام کرتا ہے بات بھی دہی کرتا ہے۔ ایک سول انجینئر کی شادی ہوئی تو بیوی کا گھونگھٹ اٹھاتے ہی اس نے چیخ کر کہا ”یہاں تو فالٹو میٹر ٹیل اتنا لگا ہوا ہے کہ اصل عمارت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔“

(مرسلہ: امیہ، کراچی)

\*\*\*\*\*

## انتظار

برسوں کے انتظار کا انجام لکھ دیا  
کاغذ پہ شام کاٹ کر پھر شام لکھ دیا  
بکھری پڑی تھیں ٹوٹ کر کلیاں زمین پر  
ترتیب دے کر میں نے تیرا نام لکھ دیا  
(سباس گل، رحیم یار خان)

\*\*\*\*\*

## لوڈ شیڈنگ

لوڈ شیڈنگ آپ کا ارشاد بالکل ٹھیک ہے۔  
پر یقیناً اہل زمین کیسے کریں؟  
لوڈ شیڈنگ کم تو ہو پائی نہیں  
ختم ہونے کا یقین کیسے کریں۔“

(ایمن، ملتان)

\*\*\*\*\*

## نصیحت

اگر تم بادشاہ ہو تب بھی اپنے والد اور اپنے استاد کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ (حضرت علیؓ)  
جب تک تمہارے نصیب یاد رہیں، تمہارے عیب ڈھکے ہوئے ہیں۔ (حضرت علیؓ)  
مصیبت میں صبر کا مایابی کی بجائی ہے۔ (حضرت امام حسینؓ)  
(رباب اینڈ عائشہ نیاز لاہور)

\*\*\*\*\*

☆ خدا نے عورت کو مرد کی پیشانی سے نہیں بنایا کہ وہ مرد پر حکومت کرے اور نہ اس کے پاؤں سے پیدا کیا کہ اس کی غلامی کرے بلکہ اس کی پسلیوں سے پیدا کیا کہ وہ اس کے دل کے قریب ہو۔  
☆ اگر دنیا میں عورت نہ ہوتی تو مرد ریاضت کے بغیر ہی ولی بن جاتا۔  
(گزلیا۔ کراچی)

\*\*\*\*\*

## انجان

پڑوس میں ایک نیا کرائے دار جوڑا آ کر آباد ہوا۔  
ایک روز بیگم نے کہا۔  
”دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ شوہر باہر جانے لگتا ہے تو دروازے پر کھڑے ہو کر بیوی سے ہاتھ ملاتا ہے۔ پھر سڑک پر جا کر کئی بار پیچھے گھوم گھوم کر دیکھتا ہے۔“ بیوی نے سرد آہ بھر کر کہا ”مجھے تو رشک آتا ہے تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔“  
شوہر نے حیرت سے کہا۔ ”میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں، میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں۔“  
(مومن محمود، ریتالہ خورد)

\*\*\*\*\*

## مؤدب رہنا اچھا ہے

حضرت داؤد طائیؑ فرماتے ہیں کہ میں بیس سال امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر رہا اور اس میں نے خیال رکھا کہ آپؒ بھی خلوت میں سربرہنہ ہو کر نہ بیٹھتے اور نہ بھی استراحت کے لیے پاؤں دراز کیے۔ میں نے عرض کیا۔  
”اے امام دین! اگر خلوت میں پاؤں دراز کریں تو کیا ہوگا۔“

آپؒ نے فرمایا ”خلوت میں حق تعالیٰ کے ساتھ مؤدب رہنا نہایت اچھا ہے۔“  
(عروسہ، گوجرانوالہ)

\*\*\*\*\*



## خوبصورت ہاتھ

جلد جھریاں بڑ جاتی ہیں۔ ہتھیلی کی جلد سخت اور موٹی ہوتی ہے۔ ہتھیلی پر چکنائی پیدا کرنے والے غدود نہیں ہوتے ( جس طرح بدن کے کئی اور مقامات پر ہوتے ہیں) چنانچہ اس میں قدرتی چکنائی نہیں ہوتی اس لئے یہ بہت زیادہ خشک اور کھردری ہو سکتی ہے۔ یہ جلد بہت آسانی سے پھٹ جاتی ہے۔ ڈیٹر جنٹ (صاف کرنے والے مادے) مسائل کو بڑھا دیتے ہیں۔ ان سے ہاتھ اس طرح ہو جاتے ہیں۔ کہ آپ انہیں چھپانا چاہتے ہیں۔ جسم کے دوسرے حصوں کے برعکس ہاتھ بہت جلد عمر کی عکاسی کر دیتے ہیں۔ اس لئے روزانہ دیکھ بھال کے ذریعے ان کا تحفظ ہی اس مسئلہ کا حل ہے۔

نہانے یا ہاتھ دھونے کے بعد اپنے ہاتھوں پر ہمیشہ کسی کریم یا تیل سے مساج کر لیا کریں۔ لیموں اور ہلدی کی بنی کریم زیادہ مناسب رہتی ہے۔ لیموں صفائی کرتا ہے جبکہ ہلدی جلد کو نرم کرتی ہے۔ یہ امتزاج ہاتھوں کو صابن، کلورین طے پانی اور ڈیٹر جنٹ سے ہونے والے ممکنہ نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

ہر رات کو سونے سے پہلے ہاتھوں پر کوئی کریم استعمال کریں اور چند منٹ تک مساج کریں۔ خوبانی کی بنی ہینڈ کریم ہاتھ کی جلد کو بہترین نشوونما مہیا کرتی ہے۔ مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خوبانی جلد کو کس کر جھریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

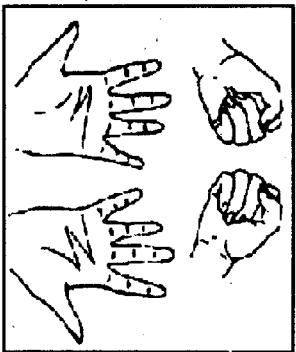
کھردری موٹی جلد پر رات کو سونے سے پہلے اچھی طرح کریم لگائیں اور بوٹھنے کی بجائے سوتی کپڑے کے بنے دستانے پہن کر سو جائیں۔ لینولین اور بادام سے بنی کریم بھی ہاتھوں کے لئے بہت

ہم ایک بات بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ ہر وقت نمائش میں رہتے ہیں یعنی دکھائی دیتے رہتے ہیں اور سب کی نظروں میں آتے ہیں۔ یہاں تک کہ باتیں کرتے ہوئے بھی ہم انہیں ہلاتے ہیں۔ کبھی بات میں زور اور شدت پیدا کرنے کے لئے حرکت دیتے ہیں اور کبھی زبان سے کچھ نہیں کہتے اور صرف ہاتھ ہلا دیتے ہیں۔

کھردرے، جھریوں بھرے ہاتھ اور کٹے بھٹے ناخن آپ کی پوری شخصیت کا وقار مجروح کر سکتے ہیں۔ ہاتھوں کی کیفیت کا انحصار اس توجہ پر ہے جو آپ انہیں دیتے ہیں اور یہ ظاہری صورت کے ہر پہلو سے سچ ثابت ہوتا ہے۔ اچھے بناؤ سنگھار میں خوبصورت، ہاتھ بھی شامل ہوتے ہیں۔

ہاتھ واقعتاً ایک حیرت انگیز عضو ہے۔ اس میں 28 ہڈیاں ہوتی ہیں۔ کلائی سمیت سب کچھ حیرت انگیز طور پر متوازن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اتنی حرکت اور اظہار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہاتھ

ایک زبان بول سکتے ہیں جوان کی اپنی ہوتی ہے۔ ہاتھوں کی پشت پر جلد نرم اور پتلی ہوتی ہے۔ اس پر بہت



مناسب رہتی ہے۔ یہ ہاتھوں کو معمولی سا لیچ بھی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جلد کی زخمشک بھی کرتی ہے۔ ہاتھوں کی کھروری جلد کے لئے یہ ٹریٹ منٹ ایمرجنسی کی حیثیت رکھتا ہے۔

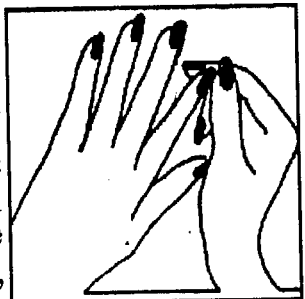
اگر آپ وقت کی فضول خرچی برداشت کر سکیں تو اپنے ڈیلی فیس ماسک کا کچھ حصہ اپنے ہاتھوں پر لگا لیجئے۔ اس سے ہاتھوں کی جلد صاف، ہموار اور صحت مند بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اپنے ہاتھوں کو یہ ٹریٹ منٹ کم از کم ایک بار ہفتہ میں ضرور دیجئے۔ خصوصی طور پر تیار کئے گئے ہاڈی میکس بھی بازار سے دستیاب ہیں جو ہاتھوں پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہاتھوں کی مخصوص درز میں بھی انہیں پلک دیا جاتا ہے اور ان سے خون کی گردش بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل ورزشوں پر عمل کیجئے اور انہیں چھ سے دس مرتبہ تک دہرائیے۔

1- اپنی مٹھیاں ایک سیکنڈ کے لئے سختی سے بھینچئے اور پھر انہیں کھول کر انگلیوں کو جہاں تک ممکن ہے، پھیلائیے۔

2- اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے اس طرح نکالئے کہ پھلیاں نیچے کی طرف ہوں۔ انگلیوں کو ایک دوسرے کے خلاف سختی سے دبائیے اور پھر انہیں ممکنہ حد تک ایک دوسرے سے دور ہٹائیے۔

3- ہاتھوں کو ایک دوسرے پر کراس کی صورت میں رکھئے اور ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔ پھر انہیں کلائیوں کے جوڑے سے دائرے میں گھمائیے پہلے دائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں۔

اگر آپ کے ہاتھ تھکے ہوئے ہیں تو انہیں فوراً بحال کرنے کے لئے ٹریٹ منٹ دیجئے۔ انہیں



کچھ دیر گرم پانی میں ڈبوئے رکھیں جس میں دو یا تین چمچے نمک شامل کیا گیا ہو گرم نمکین پانی میں ہاتھوں کا ڈبوئے رکھنا انہیں پرسکون اور بحال کر دیتا ہے۔ اس سے



ہاتھ کی جلد پر موجود گرد و غبار اور فاضل فاسد مادے وغیرہ اتر جاتے ہیں۔ ایک اور ٹریٹ منٹ جو خون کی گردش

کو تیز تر بناتا ہے وہ ہاتھوں کو باری باری گرم اور ٹھنڈے پانی میں رکھنا ہے۔ اس عمل سے اعصاب پر سکون ہو جاتے ہیں۔

ہاتھوں کا پیشہ ورانہ ہفتہ وار مساج اور ناخن تراشی داقتاً ہاتھوں کی خوبصورتی کو محفوظ اور برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ گھر میں ناخنوں کو سنوارنے کے لئے آپ کو کچھ مددگار چیزوں کی ضرورت پڑے گی ان ضروری چیزوں میں سے ایک ایمری بورڈز ہیں جو ناخنوں کو مطلوبہ شکل دینے اور پہلوؤں کی سخت جلد کو ہموار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک جھانو Pumice Stone جو سخت جلد کو نرم کرتا ہے اور داغ دھبے دور کرتا ہے۔

اورنگ سلکو کی ضرورت ہوگی تاکہ ناخنوں کی جھلی کو نرمی سے پیچھے کیا جائے۔ ایسی ٹون اور نیلی وارنش درکار ہوگی تاکہ اگر آپ رنگ میں اضافہ کرنا چاہیں تو ممکن ہو۔ ناخنوں کی جھلی کو نرم کرنے کے لئے کریم چاہئے ہوگی۔

نیل پالش ریمورز اور ایسی ٹون جلد کو خشک کر دیتے ہیں اس لئے جب بھی پرانی نیل پالش اتار دیں تو ناخنوں کے ارد گرد کی جلد پر کریم سے مساج کریں تاکہ یہ نرم اور ہموار رہے۔

☆.....☆.....☆.....☆

# رنگ خیال

## غزل

زوال یہ ہے کہ سب ہیں زوال آمادہ  
اور ایک میں تھا کہ عضو زوال بن نہ سکا  
﴿شاہ بخاری، بھکر﴾



## ساون

ساون کی برستی پھوار میں  
آکے دیکھو تو  
پیڑوں پہ کتنے گل کھل چکے ہیں  
کھل کے دھل چکے ہیں  
گلاب ہی گلاب رکھے ہیں  
تمہاری راگوار میں  
آنکھ کھولنا نظر ہے  
زباں پہ تمہارا اسم ہے  
اور یہ دل لے کر رہا ہے  
بارشوں میں بھیکتی جا رہی ہوں  
یہ سوچتی جا رہی ہوں

ایسا نہ ہو

یہ ساون تھم جائے  
گر تم لوٹ کے نہ آئے  
تو یہ دل مجسم غم بن جائے

﴿فصیحہ آصف خان، ملتان﴾



## غزل

ایک سورج میری بینائی چرا کر لے گیا  
میں بہ مشکل اک ہرا منظر بچا کر لے گیا

کس کشمکش بھر میں کیا تشنہ لبی ہے  
اے زہد ستم گر تجھے توبہ کی پڑی ہے  
ساون کے مہینے میں ابھی دریہ لگے گی!  
فی الحال میری آنکھ میں اشکوں کی لڑی ہے  
سائے سے بڑا قد تو کسی کا نہیں ہوتا  
قامت میرے یارو میرے سائے سے بڑی ہے  
میں چیخ رہا ہوں کوئی آ کر تو نکالے  
دیوار مری روح کے بلے پہ گری ہے  
اے چاند ذرا دیکھ کے آنا کہ مقابل  
زلفوں کو بکھیرے وہ سر شام کھڑی ہے  
ابدال کئی عشق کے گزرے ہیں جہاں میں  
شاہ روم زمانے میں محبت کا دلی ہے  
﴿شاہ روم خان، آزاد کشمیر﴾



## غزل

وصال بھر جو بھر وصال بن نہ سکا  
خیال خام بھی خام خیال بن نہ سکا  
جواب اس لئے بھی لا جواب ہو کے رہا  
سوال ہو کے بھی کوئی سوال بن نہ سکا  
اسے گنوا کے مرا بھر، بھر بن تو گیا  
مگر یہ رنج تو رنج ملال بن نہ سکا  
میں کیسے روح کی ہمایگی پہ اتراتا  
کہ جب وجود مرا ہم خیال بن نہ سکا

آنکھ بھر آئی تو دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا  
ایک آنسو درد کی دنیا بہا کر لے گیا  
ایک تنکا تھا، پڑا رہتا تھا فرش خاک پر  
اک گہولا عرش کی جانب اڑا کر لے گیا  
میں بھلا کیوں دشمن جاں کی گلی جانے لگا  
وہ تو اک خوشبو کا جھونکا ورغلا کر لے گیا  
اور پھر اگلے ہی لمحے میں درمقتل پہ تھا  
اک پرانا یار باتوں میں لگا کر لے گیا  
ایک بونے کا قد و قامت بڑھانے کے لئے  
میرا سر اک دوسرا بونا اٹھا کر لے گیا  
﴿مشتاق عاجز، سیالکوٹ﴾



## غزل

غبار دشت یکسانی سے نکلا  
یہ رستہ میری بے دھیانی سے نکلا  
نہ ہم دشت میں اپنے گھر سے نکلے  
نہ صحرا اپنی ویرانی سے نکلا  
نہ آنکھیں ہی ہوئیں غرقاب دریا  
نہ کوئی عکس ہی پانی سے نکلا  
ادھر نکلی وہ خوشبو شہر گل سے  
ادھر میں باغ ویرانی سے نکلا  
ہوا غرقاب شہر جاں تو یہ دل  
یہ دریا اپنی طغیانی سے نکلا  
جو نکلا شام دشت کربلا سے  
ستارہ خندہ پیشانی سے نکلا  
﴿کاشف حسین غار، لاہور﴾



## غزل

میں نے شاید خواب میں دیکھا ایک ستارہ روشن تھا  
میری رات میں تیرا چہرہ ایک ستارہ روشن تھا

مسجد کے مینار کے اوپر چاند ٹنکا تھا پیلا سا  
دور ذرا سا ہٹ کر بیٹھا ایک ستارہ روشن تھا  
پلکیں تیری، مور کے بوجھل پر ہوں جیسے رنگ بھرے  
ان کے اندر دیپ سا جلا ایک ستارہ روشن تھا  
ٹھٹھرا ٹھٹھرا، سہا سہا، رات کی کالی چوکھٹ پر  
میں نے جب کھڑکی سے دیکھا ایک ستارہ روشن تھا  
کیلنڈر میں مرتے دل پر آنکھ پڑی تھی نیلی سی  
بجھتی راگھ میں شعلے جیسا ایک ستارہ روشن تھا  
اس نے اپنی آنکھ سے باندھے، موسم زندہ رنگوں کے  
اور ہماری آنکھ میں تنہا ایک ستارہ روشن تھا  
﴿کامی شاہ، کراچی﴾



## غزل

بس لب دلدار پہ بوسہ رقم میں نے کیا  
پھر ہوا جو کچھ بھی اس میں کام میں نے کیا  
زندگی اک خویصورت رات بن کر رہ گئی  
کچھ کرم اس نے کیا اور کچھ کرم میں نے کیا  
اس کے ہاتھوں کو نہ روکا اپنے ہاتھوں کی طرح  
پیار کرتے وقت بس اتنا ستم میں نے کیا  
جس قدر طے مسافت اس نے کی مرضی سے کیا  
فاصلہ طے عشق کا تو دو قدم میں نے کیا  
جس سے لکھا تھا صداقت کا ادھورا واقعہ  
احتجاجاً ٹکڑے ٹکڑے وہ قلم میں نے کیا  
﴿حضرت شاہ، جرمی﴾



## غزل

دل اس سے مل گیا تو ستارے نہیں ملے  
طوفان سے بچ گئے تو کنارے نہیں ملے  
جن کو اڑا کے لے گئیں منہ زور آندھیاں

بچوں کو آج تک وہ غبارے نہیں ملے  
اک دن گئے تھے ہم بھی ستاروں کو ڈھونڈنے  
ایسے گرے کہ پر بھی ہمارے نہیں ملے  
وقت نزع کہا جو تلاوت کے واسطے  
لوگوں کو مسجدوں میں سپارے نہیں ملے  
رونا تو یہ ہے ساتھ بھی رہنے کے باوجود  
ان سے ہماری سوچ کے دھارے نہیں ملے  
شاید رقیب لے اڑے قاصد کے ہاتھ سے  
ہم کو کبھی خطوط تمہارے نہیں ملے  
جاوید جن کی دید کو آنکھیں ترس گئیں  
چلن کی اوٹ سے وہ اشارے نہیں ملے

﴿جاوید رسول مگری، وزیر آباد﴾

♥♥♥♥♥♥♥♥

## غزل

بک رہی ہیں ڈگریاں بازار میں  
مقتدر شامل ہیں کاروبار میں  
پہلے سے جو ہے آسای پرشدہ  
اشتہار اس کا ہے کیوں اخبار میں  
کوئی بھی شے اصل ملتی ہے محال  
اب ملاوٹ ہو رہی ہے پیار میں  
جامہ زبئی سے ہے پردے میں چھپی  
جو بھی خامی رہ گئی کردار میں  
اس کا ہر اک کام ہوتا ہے یہاں  
جس کی ہے پہچان کچھ سرکار میں  
﴿ایوب صابر، سودی عرب﴾

♥♥♥♥♥♥♥♥

## رائیگاں خوابوں کا نقش

نظر میں جتنے بھی رنگ بھریں.....  
وہ خواب کے رنگ سے ماورا ہیں

وہاں کی ساعتیں لیے ہیں.....  
نظر سے پہلو تہی کروں تو.....  
بدن کا میلہ  
تمہاری خوشبو کی زد میں آ کر  
بکھرنے لگتا ہے  
اسی لئے میرے پاؤں اب تک  
داروں کی مسافتوں سے بندھے ہوئے ہیں  
وہ خواہشوں کے جو قافلے تھے  
نہ جانے کیسی قیامتوں میں.....  
الہ گئے ہیں

﴿ارشاد نعیم، شیخوپورہ﴾

♥♥♥♥♥♥♥♥

## غزل

مل رہی ہیں چار سو کیوں وحشتیں، ہنسی ہوئی  
کس گلی میں رہ گئیں وہ قربتیں نکھری ہوئی  
اب مہک تیری مری ہر پور میں یوں رچ گئی  
منتظر ہیں آنکھ میں کچھ حیرتیں دہکی ہوئی  
ہجر کی وحشت نے دل کو کر دیا رنجور اب  
بھوتی جاتی ہوں میں اب صورتیں دیکھی ہوئی  
اب کہاں اور کس رفاقت میں مجھے لینی ہے سانس  
شہر میں ملتی ہیں ہر جا فرقتیں نکھری ہوئی  
واویوں میں دل کی اب خاموشی اک شام ہے  
دشت میں کھو ہی گئیں وہ شدتیں مہکی ہوئی  
یابی تھیں ہم نے کبھی رنگوں بھرے اس شہر میں  
غم ہوئیں چاہت بھری وہ صحبتیں نکھری ہوئی  
﴿ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، ڈی جی خان﴾

♥♥♥♥♥♥♥♥

## غزل

زبان پر ایک قطرہ رکھ دیا ہے  
میں نے مانگا تھا کیا، کیا رکھ دیا ہے

خدائی کا اشارہ رکھ دیا ہے  
 سمندر میں کنارہ رکھ دیا ہے  
 خدا نے دھوپ کے تن ڈھانپنے کو  
 گھنے پتروں میں سایہ رکھ دیا ہے  
 مجھے منزل دکھا کر رہروں نے  
 مرے پیروں میں رستہ رکھ دیا ہے  
 سکوں ملتا نہیں پل بھر بھی دل کو  
 یہ تم نے سلسلہ کیا رکھ دیا ہے  
 محبت نے اجالا بانٹنے کو  
 مرے دل میں اجالا رکھ دیا ہے  
 توازن کے لئے اکرم خدا نے  
 زمیں پر اک ہمالہ رکھ دیا ہے  
 ﴿محمد اکرام اکرم، کراچی﴾



## آگ ہر طرف

جہاں دھڑکنیں دل کی سنتی ہوں میں  
 دھڑکتے ہیں جب ایک دوجے کے دل  
 یہ قصہ تو ہے اک حسین رات کا  
 کہ ہر شب تو ہوتی نہیں اس طرح  
 اچانک نیا موڑ آتا ہے بس  
 جو ہیں حسرتیں دل کی دل میں مکیں  
 سوکس کو خبر  
 کہ ہو جائیں جذبے جہاں منجمد  
 بدن ہو دہکتی ہوئی آگ سا  
 تمہیں یاد ہو گا وہ کچا گھڑا  
 کوئی لے کے اتر اٹھا دریا کے پار  
 سبھی نے کہا پیار کی انتہا  
 بصد معذرت، میرا کہنا ہے یہ  
 کہ یہ بھی تو تھی صرف اک تشنگی

﴿روبی جعفری، کراچی﴾



## غزل

خواب سہانا بھول گیا ہے  
 گھر کو جانا بھول گیا ہے  
 آئینے میں تم رہتے ہو  
 بال بنانا، بھول گیا ہے  
 کیسے سفر پر بھیج دیا ہے  
 واپس آنا بھول گیا ہے  
 کانٹے دامن سے اٹھتے ہیں  
 پھول اگانا بھول گیا ہے  
 تیری یاد سے بھی اب راجا  
 دل بہلانا بھول گیا ہے  
 ﴿احمد رضا راجا، راولپنڈی﴾



## انجانے میں

جانے کب آغاز ہوا  
 جانے کون سا لمحہ تھا  
 جو میں رستا بھولی تھی  
 اور چلتے چلتے  
 انجانے میں  
 رخت سفر کو باندھ لیا  
 اور یہ نہ سوچا کیا کر بیٹھی  
 کیا!  
 آنگن کی اس چڑیا کو..... تم نے  
 اور گلشن کے پھولوں کو..... تم نے  
 اس گھور اندھیری دنیا میں  
 کیوں؟ تنہا چھوڑ کے جانا ہے  
 کیوں؟ ان کو روگ لگانا ہے

﴿ثمینہ گل، سرگودھا﴾



## غزل

وہ سورج تھا ستارہ ہو گیا ناں  
جدائی کا اشارہ ہو گیا ناں  
سکھایا تھا جسے دنیا میں جینا  
وہی دنیا کو پیارا ہو گیا ناں  
کہا بھی تھا محبت تم نہ کرنا  
خسارہ ہی خسارہ ہو گیا ناں  
بہت ہی دور اپنی دسترس سے  
رفاقت کا کنارہ ہو گیا ناں  
جو ارشد جان سے پیارا کبھی تھا  
وہی دشمن ہمارا ہو گیا ناں  
﴿ارشد ملک، راولپنڈی﴾



## غزل

تڑپ کو میرے سینے سے جدا ہونے نہیں دیتا  
مجھے دل بے وفا سے باوفا ہونے نہیں دیتا  
وہ اکثر غیر رکی طور پر ملتا تو ہے لیکن  
ملاقاتوں کو وہ باضابطہ ہونے نہیں دیتا  
مرا وجدان اکساتا تو ہے مجھ کو بغاوت پر  
پاپا پھر معرکہ کر بلا ہونے نہیں دیتا  
میں اظہار تمنا پر بھند تو ہوں مگر مجھ کو  
محبت کا کبھی وہ شائبہ ہونے نہیں دیتا  
مرے جذبوں کی شدت بھانپ لیتا ہے بھی شاہد  
کسی جذبے کی بھی وہ انتہا ہونے نہیں دیتا  
﴿شاہد بخاری، بھکر﴾



## اسے کہنا

اسے کہنا یہ دنیا ہے  
یہاں ہر موڑ پر ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں

جو اندر تک اترتے ہیں

ابد تک ساتھ رہنے کی

اکٹھے درسہنے کی ہمیشہ بات کرتے ہیں

اسے کہنا یہ دنیا ہے

یہاں ہر شخص مطلب کی حدوں تک ساتھ چلتا ہے

جو نبی موسم بدلتا ہے

محبت کے کبھی دعوے

کبھی قسمیں، کبھی وعدے

اچانک ٹوٹ جاتے ہیں

اسے کہنا یہ دنیا ہے

یہاں ہر موڑ پر تم اپنی آنکھوں کو کھلا رکھنا

کوئی کتنا بھی اچھا ہو

کوئی کتنا بھی سچا ہو

مگر اقرار مت کرنا

اسے کہنا یہ دنیا ہے یہاں پہ پیار مت کرنا

﴿میشم علی آغا، سیالکوٹ﴾



## غزل

انکار کی لذت سے نہ اقرار جنوں سے  
یہ ہجر کھلا مجھ پہ کسی اور فسوں سے  
یہ جان چلی جائے مگر آج نہ آئے  
آداب محبت پہ، کسی حرف جنوں سے  
عجلت میں نہیں ہوگی تلاوت ترے رخ کی  
آ بیٹھ مرے پاس ذرا دیر سکوں سے  
اے یار! کوئی بول محبت سے بھرا بول  
کیا سمجھوں بھلا میں تری ہاں سے تری ہوں سے؟  
دیوار کا سایہ تو مجھے مل نہیں پایا  
بیٹھا ہوں تری یاد میں اب لگ کے ستوں سے  
تجھ سے تو مری روح کا بندھن تھا مرے یار



انجان رہا تو بھی مرے حال دروں سے  
﴿مبشر سعید، کراچی﴾



## غزل

یہ سچ ہے موسم شادابی بہار نہ تھا  
چمن میں پہلے مگر اتنا انتشار نہ تھا  
خدا گواہ کسی کو کسی سے پیار نہ تھا  
تمہاری بزم کا ماحول خوشگوار نہ تھا  
ہوا تھا چاک جو دامان اعتماد و وفا  
کہیں بھی امن کا ماحول برقرار نہ تھا  
ہمارے لغزش پاکی سزا معاذ اللہ  
وہاں تو دامن قاتل بھی داغدار نہ تھا  
کلی کلی پہ کیوں پڑمردگی برتی ہے  
جو باغبان چمن قاتل بہار نہ تھا  
نگاہ لطف تو درکار تھی اسے لیکن  
خطائیں کر کے بھی وہ شخص شرم سار نہ تھا  
ہوا ہے آج وہ مسند نشین بتا کیسے؟  
تری نگاہ میں کل تک جو باوقار نہ تھا  
اک ایسا دور بھی ہم نے امتیاز دیکھا  
زمانے بھر میں کوئی حق کا جاں نثار نہ تھا  
﴿ایس امتیاز احمد، کراچی﴾



## غزل

کتنے خانوں میں تقسیم ہم ہو گئے  
اور جدائی کے دریا میں ہم کھو گئے  
ملا نہ جو ہم کو کاندھا تیرا  
اداسی کے شانوں پہ ہم سو گئے  
انکا تماشا بھی بن ہی گیا  
نشانہ بنا کے ہمیں جو گئے

سنجھتا نہیں ہے دل مضطرب  
جو ماں باپ ملک عدم کو گئے  
مجھ سے تو لوگوں نے اتنا کہا  
شگفتہ کے اشعار دل موہ گئے  
﴿شگفتہ شفیق، کراچی﴾



## سوچنا اچھا لگتا ہے

بارشوں میں بھیگنا اچھا لگتا ہے  
تیلیوں کو پکڑنا اچھا لگتا ہے  
خزاں کی اولین خنک شاموں میں  
خنک پتوں پہ چلنا اچھا لگتا ہے  
زمین کے مسافر سہی مگر کبھی کبھی  
ہواؤں میں اڑنا اچھا لگتا ہے  
کبھی یونہی بے سبب اداس ہونا  
کبھی بے وجہ کھلکھلانا اچھا لگتا ہے  
بھر کے ہاتھوں میں گلاب پیتاں  
ہوا میں اچھالنا اچھا لگتا ہے  
ریت کے گھروندے کر کے تعمیر  
پھر انہیں توڑنا اچھا لگتا ہے  
بدلیوں کی اوٹ سے تاریکی شب  
چاند کا جھانکنا اچھا لگتا ہے  
جاگ کر گرمیوں کی راتوں میں  
وہ تارے گننا اچھا لگتا ہے  
ہو کے روبرو تیز ہوا کے  
اپنا آنچل لہرانا اچھا لگتا ہے  
بند کر کے آنکھیں تنہائی میں  
اکثر تمہیں سوچنا اچھا لگتا ہے  
﴿راجہ شاہین، راولپنڈی﴾



### خاندان کو منظم رکھنے میں خاوند کا کردار

پھر وہ سماجی اور اخلاقی میدان میں کیوں پیچھے ہیں انہیں سماج میں بھی اپنا فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔

جب ایک نوجوان لڑکی اور لڑکے کی شادی طے کی جاتی ہے تو دونوں بڑی حد تک عاقل اور بالغ ہوتے ہیں اگر ان کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ ہوتا ہے تو وہ اس بارے میں آواز مل کر اٹھائیں اس سلسلے میں چونکہ ہمارا معاشرہ اور ہمارا سماجی اور اخلاقی ڈھانچہ کچھ اس طرح سے ہے کہ آج بھی شادی جیسے بڑے اور زندگی کے اہم فیصلے میں لڑکی کی رائے نہیں لی جاتی البتہ اس معاملہ میں لڑکے کہیں کہیں مکمل آزاد خود مختار اور کہیں کہیں ان کی مرضی کم از کم ضرور معلوم کی جاتی ہے لہذا اس صورتحال میں وہ شادی کی ذمہ داری کو نبھانے میں عورت کے مقابلے میں زیادہ ذمہ دار ہیں کیونکہ کسی نہ کسی صورت میں اس شادی میں ان کی رضا مندی شامل ہوتی ہے جبکہ پیشتر خاندانوں میں شادی کے لئے نہ صرف لڑکی سے دریافت نہیں کیا جاتا بلکہ وہ اپنے زندگی کے ساتھی اور مجازی خدا کو شادی والے روز ہی دیکھتی ہیں لہذا شادی ٹوٹنے سے بچانے کے لئے نوجوانوں کو اپنی بیوی کی معاونت کرنی چاہیے۔

جب لڑکی اور لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو شروع میں تو دونوں اپنا اپنا اچھا ظاہر کرتے ہیں رفتہ رفتہ دونوں کی خامیاں، ایک دوسرے کے سامنے آنے لگتی ہے یہی کچھ خاندان کے دوسرے ممبران کا رد عمل اور رویہ بھی ہوتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھابھ، بہو کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں اور بھابھ کو

کہتے ہیں کہ تالی بھی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی اور عورت و مرد زندگی کی گاڑی کے دو پیسے ہیں اور گاڑی کو آگے بڑھانے کے لئے دونوں پہیوں کو اپنا اپنا فرض ایمانداری سے ادا کرنا ہوگا تب ہی گاڑی آگے بڑھے گی ایک ہاتھ سے نہ تالی بچتی ہے اور نہ ایک پہیہ گاڑی کو چلانے اور آگے بڑھانے میں کارآمد ہوگا۔

آپ نے سنا ہوگا کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں اگر مل جائیں تو؟ ورنہ اکیلا چنا پہاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ لہذا اب جبکہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے جا رہے ہیں اور خود کو اشرف المخلوقات کے علاوہ مسلمان بھی کہتے ہیں تو پھر اس پر عمل درآمد کیوں نہیں کرتے؟ کیوں یورپ کی طرح ہمارے یہاں شادیاں ٹوٹنے یا گھر بکھرنے میں دونوں میاں بیوی کا قصور ہوتا ہے ہمارے آج کے نوجوانوں کے بارے میں دناؤں، بصیرت مند بزرگوں، محققین اور دانش وران کا کہنا ہے کہ وہ ذہانت قابلیت، اہلیت میں کسی سے کم نہیں تو





ساس نندوں اور دیوروں کی۔ یہیں سے جھگڑے، لڑائی کا آغاز اور گھر کی فضا میں بدگمانی غصے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں حالانکہ گھر میں سب عاقل، بالغ اور سمجھ دار ہوتے ہیں لیکن اس موقع پر کوئی بھی سمجھ بوجھ صبر و برداشت اور دانشمندی کا مظاہرہ نہیں کرتا بعض اوقات اس سارے میں معاملے میں بزرگ اپنا فرض خاص طور پر بھول کسی ایک فریق کے مخالف ہو جاتے ہیں اور وہ فریق یقیناً بہو ہوتی ہے۔

کے ختم ہونے علیحدگی اور طلاق کا سبب ساس، نندوں اور بہو کے درمیان کے جھگڑے اور غلط فہمیاں ہوتی ہے۔ جس سے تنگ آ کر اور کبھی کبھی غصے میں شوہر، بیٹا، مرد طلاق جیسے کردہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے اگرچہ ماؤں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بہو کی دن بھر کی کارگزاری شام کو آتے ہی بیٹے کے گوش گزار کر دیتی ہیں۔ یہی کچھ بیگم صاحبہ کا عمل ہوتا ہے کہ وہ شام کی چائے ختم ہونے سے قبل ہی ساس نندوں کی دن بھر کی اچھی بری جلی کٹی سب کچھ میاں کے کان میں انڈیل دیتی ہیں۔

تھکا ماندہ بھوکا پیاسا، مرد دفتر میں کام میں سر کھپانے، باس کی جلی کٹی سننے کے بعد گھر میں سکون، اطمینان اور خوشگوار ماحول کا خواہش مند ہوتا ہے اور جب یہ نہیں ملتا تو وہ پریشان ہو کر بھی ایک اور کبھی دوسرے فریق کی حمایت کرتا ہے مگر دونوں کو پھر بھی تسلی نہیں ہوتی اور نوبت ایک دن یہ آتی ہے کہ شوہر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور فطری اور قلبی لگاؤ کے سبب وہ ماں بہنوں کی جانب جھک جاتا ہے اور طلاق جیسے فعل کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے مگر جو نبی اسے اس کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے اکیلے پن، بدنامی، بچوں کی پرورش کا خیال آتا ہے تو پھر نہ صرف اسے بلکہ ساس نندوں اور

وہ بہو جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے۔ جیسے بیاہنے کے لئے انہوں نے سوچتے ہوئے ہیں جن کی صورت اسے چاند کا ٹکڑا نظر آتی ہے کچھ ہی عرصے میں جیسے بیٹی بنا کر لے جانے کی بات ہوتی ہے بہو بھی ماننے سے انکاری ہوتی ہے۔

ایسا ہی کچھ لڑکی کے ساتھ بھی ہوتا ہے ساس ماں کی جگہ ڈائن اور نندیں بہنوں کی جگہ بیرن نظر آنے لگتی ہیں۔ جس رشتے کو پیار، محبت، صبر و برداشت درگزر، ہمت اور بڑے دل سے جانا چاہیے چھوٹی چھوٹی غلط فہمیوں، غلطیوں کوتاہیوں کو بڑے بڑے الزامات کی شکل مل جاتی ہے اور لڑائی جھگڑے مار پیٹ تک کی نوبت آ جاتی ہے اور سنبھالا یہاں بھی نہیں ہوتا بلکہ نوبت خلع، طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔

بیشتر گھرانوں میں جھگڑے علیحدگی کا سبب صرف اور صرف گھریلو چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے ہیں جو غلط فہمیوں سے جنم لے کر بڑے بڑے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر غلط فہمیوں کو بروقت دور کر لیا جائے کوتاہیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کرنے اور درگزر کرنے کے ساتھ ساتھ پیار و محبت سے دور کیا جائے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچے بیشتر خاندانوں کے ٹوٹنے، شادیوں

ہینگم کو بھی حالات کے اس نہج پر پہنچنے کا افسوس اور پچھتاوا ہوتا ہے مگر ان سب میں افسوس ناک بات یہ ہے کہ ساس مندوں سے زیادہ میاں بیوی اور ان کے بچے اس صورتحال میں نقصان اٹھاتے ہیں۔

لہذا ہم یہاں نوجوانوں سے ہی اس بات کو نبھانے کی ذمہ داری ان پر ڈالتے ہیں کہ وہ عورتوں کے مقابلے میں چونکہ زیادہ عقل، فہم و فراست صبر و برداشت رکھتے ہیں۔ لہذا ایسے حالات میں صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ غصے اور جلد بازی میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس کے اٹھانے کے بعد پچھتاوا ہو۔ خاندان کا سربراہ، ذمہ دار، کفیل ہونے کے باعث خاندان کو جوڑے رکھنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ اس پر عائد ہوتی ہے اور پھر آج کا نوجوان غیر ذمہ دار بھی ہرگز نہیں۔ ہاں اس میں حوصلے، برداشت اور صبر کی کمی ضرور ہے لیکن اسے اپنی اس کمی کو دور کرنا ہوگا اور صبر و برداشت کی قوت میں اضافہ کرنا ہوگا کیونکہ اسے نہ صرف انصاف کرنا ہے بلکہ معاملات کو سلجھانا بھی ہے اور ایسی حکمت عملی اختیار کرنی ہے جس سے گھر میں سکھ، امن اور خوشحالی آئے اور اپنے اس کام میں معاونت کے لئے سب سے پہلے اسے اپنی بیوی کا اعتماد اور ساتھ حاصل کرنا ہوگا تاکہ دونوں کی سوچ ہم آہنگ ہو کر گھر کو جنت بنا سکے۔

ماں کے شکوے، بہنوں کے گلے دور کرنے کے لئے جائز اقدامات کریں کسی کی حمایت اور کسی کی مخالفت کرنے کے بجائے جائز درست بات اور فیصلہ کریں جس کی غلطی ہو اسے تنبیہ کریں اور ماں کو بھی سمجھائیں کہ وہ بہو کو اپنی بیٹی کی جگہ رکھ کر اور خود کو اس کی ماں کی جگہ رکھ کر دیکھ تو تمام شکوے ختم ہو سکتے ہیں اسی طرح بیوی اور بہنوں کو آپس میں میل جول بڑھانے ایک دوسرے کے قریب لانے، عزت، احترام اور پیار و محبت جگانے کے لئے ایک دوسرے کی اچھی باتوں، خوبیوں کو اجاگر کریں۔ گھومنے پھرنے، سیر و تفریح اور شاپنگ کے لئے جاتے ہوئے کبھی کبھار انہیں بھی ساتھ لے جائیں۔ ان کے لئے بھی تحائف لائیں

عمل کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی انہیں یقین دلائیں کہ اپنی اپنی جگہ ان کی زندگی میں سب پیار اور محبت کرنے کے لائق ہیں اور آپ ان میں سے کسی سے الگ نہیں رہ سکتے آپ کے لئے سب کی اہمیت ہے سب سے آپ کو پیار ہے وہی پیار جو شادی سے قبل تھا۔ کوشش کریں کہ شادی سے قبل اختیاری جانے والی عادتوں کو ترک نہ کریں خصوصاً ماں اور بہنوں سے سلوک روا رکھنے والی ورنہ انہیں فطری طور پر یہ احساس ہوگا کہ شادی کے بعد ایسا بھائی کی وجہ سے ہوا لہذا فطری طور اس سے ان کے دلوں میں میل بن جاتا ہے۔ یاد رکھیں ماں بہنوں اور بیوی کے درمیان محبت یگانگت پیدا کرنے کے لئے انہیں قریب لائیں۔ فریق نہ بنیں تو آپ کے گھر کا ماحول خود بخود بہتر رہے گا جس گھر میں مرد اپنی ذمہ داریوں کا بار احسن طریقے سے نبھاتے ہیں وہاں عموماً جھگڑے سنگین نوعیت اختیار نہیں کرتے۔ لہذا ہمارے نوجوان اور پڑھے لکھے مردوں کو اپنی شادی شدہ زندگی اور خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے سب سے پہلے خود میں صبر و برداشت اور حوصلہ پیدا کرنا ہوگا اور شادی سے پہلے شادی کے بعد آنے والی تبدیلیوں اور ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے خود کو تیار کرنا ہوگا چھوٹی چھوٹی باتوں، غلط فہمیوں کو وقت پر دور کرنا ہوگا۔ جس کی غلطی ہو اسے احساس دلانا ہوگا۔ بیوی بھی آپ کے حسن سلوک کی اتنی ہی حقدار ہے جتنی آپ کی ماں اور بہنیں کسی ایک کی حمایت یا مخالفت محض جذباتی ہو کر نہ کریں دونوں اطراف کے بیانات سننے کے بعد سب سے پہلے جھگڑے، غصے کا سبب تلاش کریں اور پھر جس کی غلطی ہو اسے سرزنش کریں اس طرح کہ ہنک اور دل شکنی کے بجائے شرمندگی کا احساس اجاگر ہو اور آئندہ اس قسم کی صورتحال سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ یاد رکھیں گھر اور شادی کو ٹوٹنے سے بچانا ہے تو آپ کو اپنی ذمہ داری ایمان داری سے اور کھلے دل و دماغ فہم و فراست سے نبھانی ہوگی۔

☆.....☆.....☆



# روحانی معالج

خالد محمود بھٹی

نوٹ: کسی بھی آیت کو پڑھنے سے پہلے اول آخر طاق میں ورد شریف پڑھنا نہ صرف اجر و ثواب کا موجب بنتا ہے بلکہ کام میں بھی یقینی کامیابی ہوتی ہے

7 دن تک پڑھیں۔ بعد نماز فجر یا عشاء

☆.....☆.....☆

ادائے قرض کیلئے

اول آخر تین مرتبہ ورد شریف (درد و ابراہیمی)

40 مرتبہ سورۃ اذا جاء بعد نماز فجر پڑھیں۔ انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

☆.....☆.....☆

لڑکیوں کیلئے اچھے رشتے آنے کا عمل

بعد نماز فجر اول آخر 3 مرتبہ ورد شریف اور تین مرتبہ سورۃ سمنہ پڑھ کر دعا کریں لڑکی خود نہ پڑھ سکے تو گھر میں کوئی اور پڑھ لے۔ انشاء اللہ بہتر رشتے آنا شروع ہو جائیں گے۔

☆.....☆.....☆

موافقت برائے زوجین

اول آخر تین مرتبہ ورد شریف 101 ایک مرتبہ الحمد شریف پڑھ کر کسی میٹھی چیز پر دم کریں اور کھلائیں۔ ہفتہ اور منگل کے دن نہ کریں۔ ساعت مشتری زہرہ کی ہو۔ نیا چاند ہو یعنی چاند کی چودہ تاریخ سے پہلے ہو تو بہتر ہے۔

☆.....☆.....☆

مسافر کیلئے بخریت منزل پر پہنچ جائے

جو کوئی سفر پر جا رہا ہو۔ تو اسے چاہیے کہ اول آخر 3 مرتبہ یا 7 مرتبہ ورد شریف 41 مرتبہ الحمد شریف پڑھ کر دعا کرے انشاء اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

☆.....☆.....☆

برائے استخارہ

دو گانہ پڑھیں۔ (دو نفل) پھر ایک بار سورۃ کوثر پڑھیں۔ پھر یار شید ارشدنی و یا علیم علمنی من الحال O اول آخر 3 مرتبہ ورد شریف اور 360 مرتبہ مندرجہ بالا آیت پڑھیں اور اپنے ہاتھوں پر دم کر کے سو جائیں۔ کسی سے بات نہ کریں۔ کوشش کریں دایاں ہاتھ گال کے نیچے رکھ کر قبلہ رخ سو جائیں۔

☆.....☆.....☆

برائے درد گردہ

جس شخص کو درد گردہ کی شکایت ہو۔ وہ فجر کی نماز دوست اور فرض کے درمیان 41 مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھے۔ طریقہ یہ ہے کہ پہلے 3 مرتبہ اول آخر ورد شریف پھر سورۃ فاتحہ بسم اللہ کے ساتھ بسم اللہ کی میم کو الحمد کے ساتھ ملا کر (الرحیم الحمد) رحیم کی میم کو ال کے ساتھ جوڑ کر پڑھیں۔ آب زم زم پر یا سادہ پانی پر دم کر کے مریض کو پلائیں انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔

☆.....☆.....☆

گمشدہ اشیاء کا ملنا

اول آخر 3 مرتبہ ورد شریف 40 مرتبہ سورۃ یسین



# اچھے، اب سے اچھے

ترکیب کشاف مسرور



## شبم کا تاج

عائشہ احمد، لاہور

کے لئے آیا ہوں۔ لیکن میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔“

”کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شہزادی نے کہا۔  
سنار بولا ”آپ باغ میں چل کر مجھے شبنم کے وہ قطرے دے دیجئے جن کا آپ تاج بنوانا چاہتی ہیں۔ جو قطرے آپ پسند کر کے مجھے دیں گی میں فوراً ان کا تاج بنا دوں گا۔“

شہزادی سنار کے ساتھ باغ میں گئی۔ پھولوں اور پتوں پر شبنم کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ لیکن شہزادی نے جس قطرے کو بھی چھوا وہ اس کی انگلیوں پر پانی کی طرح بہہ گیا۔  
تب شہزادی نے کھسیانی ہو کر بوڑھے سنار سے معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ اب کبھی ایسی ضد نہیں کرے گی۔

کسی بادشاہ کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ بہت ضدی تھی۔ ایک دن صبح کو وہ باغ میں ٹہلنے کے لئے گئی تو اس نے پھول پتیوں پر شبنم کے قطرے چمکتے ہوئے دیکھے۔ شبنم کے یہ قطرے ان ہیروں سے زیادہ چمک دار اور خوبصورت تھے جو شہزادی کے پاس تھے۔

شہزادی سیدھی محل میں واپس آئی اور بادشاہ سے کہنے لگی ”مجھے شبنم کا ایک تاج بنوا دیجئے۔ جب تک مجھے تاج نہیں ملے گا میں نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی۔“ یہ کہہ کر شہزادی نے اپنا کمرہ بند کر لیا اور چادر اوڑھ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

بادشاہ جانتا تھا کہ شبنم کے قطروں سے تاج نہیں بنایا جاسکتا۔ پھر بھی اس نے شہزادی کی ضد پوری کرنے کے لئے شہر کے تمام سناروں کو بلا لیا اور ان سے کہا کہ تین دن کے اندر اندر شبنم کے قطروں کا تاج بنا کر پیش کرو ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔

بے چارے سنار حیران پریشان تھے کہ شبنم کا تاج کس طرح بنائیں۔

ان سناروں میں ایک بوڑھا سنار بہت عقل مند تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ وہ دوسرے دن صبح کو محل کے دروازے پر گیا اور سپاہیوں سے کہا کہ وہ شہزادی کا تاج بنانے آیا ہے۔ سپاہی اسے شہزادی کے پاس لے گئے۔

بوڑھے سنار نے شہزادی کو جھک کر سلام کیا اور بولا۔ ”شہزادی، میں آپ کا تاج بنانے





## مزار قائد



ستارے لگے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ 48 ایسے ستارے ہیں جو روشنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔  
 قائد اعظمؒ ہمارے وہ عظیم قومی رہنما ہیں جنہوں نے اپنی ان تھک محنت، دیانت اور فراست کے ساتھ ہمارے لئے یہ پیارا ملک پاکستان حاصل کیا۔ آپ 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور 11 ستمبر 1948ء کو وفات پا گئے۔ آپ کے مزار کے لئے موجودہ جگہ پسند کی گئی۔ مزار کے بہت سے نقشے سامنے آئے لیکن آپ کی پیاری بہن مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ نے سچی مرچنٹ کا تیار کیا ہوا نقشہ پسند فرمایا جو آج مزار کی اصل شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اگر آپ بھی کراچی گئے ہیں تو یقیناً بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے مزار پر ضرور گئے ہوں گے۔ یہ مزار کراچی کی مشہور سڑک، شاہراہ محمد علی جناحؒ پر واقع ہے۔ اس کے احاطے کا رقبہ 65 ہزار مربع گز ہے۔ مزار کا اندرونی قطر ستر فٹ اور بیرونی قطر 72 فٹ ہے۔ اس کی اونچائی ایک سو بیس فٹ ہے، مزار کی اندرونی چھت کا رنگ ہلکا نیلا ہے جسے ہم آسمانی رنگ بھی کہتے ہیں۔ اس چھت میں ہمارے دوست ملک چین کا دیا ہوا تختہ فانوس کی شکل میں جگمگا رہا ہے۔ اس فانوس کی لمبائی پندرہ فٹ اور وزن تین ہزار کلو گرام ہے۔ اس فانوس میں چٹلی طرف سترہ خوب صورت



## ایک آرزو

اے ارض پاک زندہ و پائندہ تو رہے  
تیری سلامتی سے مری آبرو رہے

ذرے ہیں تیری خاک کے غازہ مرے لئے  
میرے لبوں کا حسن تری گفتگو رہے

حل کر دیا مجاہدوں نے عقدہ حیات  
غازی بنے، شہید ہوئے، سرخرو رہے

ترکین گلستاں کو دیے دلولے نئے  
دائم ترا یہ سلسلہ رنگ و بو رہے

جب تک ہے دم میں دم نہ جدا تجھ سے ہوں کبھی  
اک متحد وطن ہی میرے روبرو رہے

﴿شاعر: قیوم نظر، انتخاب: علیرہ طیب، پشاور﴾

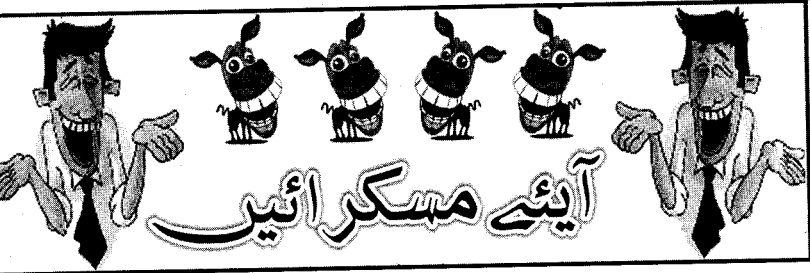
اس کی تعمیر کے لئے پاکستان کے ضلع مردان سے سنگ مرمر لایا گیا۔ پاکستانی سنگ مرمر کے علاوہ اس کی تعمیر میں انلی کا سنگ مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس خوبصورت عمارت میں 14 فٹ گہرا تہ خانہ ہے۔ اس کے اندر وہ عظیم قائد آرام فرما ہے۔ جس کے نام سے یہ مزار مشہور ہے۔ قبر کے اوپر جو تعویذ ہے اس کی حفاظت کے لئے چاندی کا جنگلا لگا ہوا ہے۔ اس جنگل سے دو فٹ ہٹ کر پیتل کا خوبصورت جنگلا ہے اس کی لمبائی 18 فٹ 110 انچ اور چوڑائی 15 فٹ ایک انچ ہے۔ قبر تک رسائی کے لئے چاروں طرف چار دروازے ہیں۔ عمارت کے باہر ہماری بہادر بحری فوج کے نوجوان پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ ہر آٹھ گھنٹے کے بعد گارڈز کی تبدیلی کی پروکار تقریب ادا کی جاتی ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مزار کے احاطے کے دو بڑے دروازے ہیں۔ ایک عوامی دوازہ کہلاتا ہے صبح نو بجے سے رات 10 بجے تک ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اس دروازے سے قائد اعظم کے عقیدت مند آکر اپنے محبوب رہنما کو خراج محبت ادا کرتے ہیں۔ دوسرا دروازہ خصوصی ہے یہ صرف ملکی یا غیر ملکی سربراہوں کی آمد پر ہی کھولا جاتا ہے۔ صدر دروازے اور مزار کی سیڑھیوں کے درمیان میں پندرہ تالاب ہیں۔ ان کی لمبائی پچاس فٹ، چوڑائی اٹھائیس فٹ اور گہرائی تین فٹ ہے۔ ان تالابوں میں چار چار فٹ اونچے فوارے لگے ہوئے ہیں جن سے پانی اچھل اچھل کر ماحول کو بہت دلکش بناتا ہے۔ مزار کے احاطے کو روشن رکھنے کے لئے نوے نوے فٹ اونچے فلڈ لائٹ ٹاور بنائے گئے ہیں۔ ان کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ رات کو مزار چودھویں کے چاند کی طرح جگمگاتا ہے۔ مزار کے چبوترے پر اڑتالیس سرخ لائٹس لگائی گئی ہیں۔ مزار کی لحد پر سورۃ نصر کندہ کی گئی ہے۔ ایک آیت سورۃ فتح کی بھی ہے۔ آخر میں آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ اس مزار کے ساتھ ہی پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح، سردار عبدالرب نشتر اور نور الامین آرام فرمائیں۔ (آمین)



# رنگ بھریں.....!







بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔  
 ”جی میرے ابو ہاتھ روم میں ہیں“  
 (شرجیل، لاہور)

☆.....☆.....☆

ننھا: ”چچا جان اپنی آنکھیں بند کر لیں۔“  
 چچا (حیرت سے): ”کیوں بھی کیا بات ہے؟“  
 ننھا: ”امی کہتی ہیں جب تمہارے چچا جان  
 آنکھیں بند ہو جائیں گی تو ہمیں بہت دولت ملے گی۔“  
 (عمران، ساہیوال)

☆.....☆.....☆

کلاس روم میں ایک لڑکے کو دیکھ کر پروفیسر صاحب  
 نے کہا: ”میرا خیال ہے، پچھلے سال تمہارا بھائی بھی اس  
 کلاس میں تھا۔“

”نہیں سر! وہ میں ہی تھا۔ فیمل ہونے کی وجہ سے  
 میں دوبارہ کلاس اینڈ کر رہا ہوں۔“ لڑکے نے کہا۔  
 پروفیسر صاحب تعجب سے سر ہلاتے ہوئے بولے  
 بہر حال پھر بھی ”مشابہت حیرت انگیز ہے۔“  
 (فرحان، آزاد کشمیر)

☆.....☆.....☆

ایک دوست دوسرے سے۔  
 مجھے ایک کیشئر کی تلاش ہے۔“  
 دوسرا بولا: ”لیکن دو ماہ پہلے ہی تو تم نے کیشئر رکھا  
 تھا۔“  
 پہلے نے جواب دیا۔ ”اسی کی تو تلاش ہے۔“  
 (رباب نیاز، لاہور)

☆.....☆.....☆

نیو یارک میں قتل ہو گیا۔ قاتل نے اپنے وکیل کو  
 شکاگو میں ٹیلی گرام بھیجا کہ میری مدد کو آؤ آج صبح میں  
 نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ وکیل نے فوراً جواب  
 بھیجا گھبرانے کی ضرورت نہیں میں آج شام ہی دو چشم  
 دید گواہوں کے ساتھ پہنچ رہا ہوں۔

(شاملہ، ملتان)

☆.....☆.....☆

نرس نے ہسپتال میں کم سن حسن کا منہ لٹکا ہوا دیکھا  
 تو پوچھا کیا بات ہے بیٹا؟ کیا تمہیں اپنی نئی چھوٹی سی بہن  
 اچھی نہیں لگی؟ اچھی تو ہے، حسن نے بدستور مجھے  
 انداز میں کہا، لیکن دراصل پرسوں میرے دوست فرحان  
 کے باپ بھی چھوٹی بہن پیدا ہوئی ہے وہ سبھی گا میں نے  
 اس کی نقل کی ہے۔

(نسرین، کراچی)

☆.....☆.....☆

استاد نے شاگرد سے پوچھا۔  
 ”بتاؤ چائے نقصان دہ ہے یا فائدہ مند؟“  
 شاگرد نے جواب دیا۔ اگر پلانی پڑے تو نقصان  
 دہ اور اگر مفت میں مل جائے تو فائدہ مند“

(اعجاز بو، وہاڑی)

☆.....☆.....☆

انکیشن کا دور تھا۔ امیدوار گھر گھر جا کر ووٹ مانگ  
 رہے تھے۔ ایک امیدوار نے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو  
 ایک بچہ باہر آیا۔ اس نے بچے سے پوچھا۔  
 ”بیٹا! تمہارے ابو قومی پارٹی میں ہیں یا اسلامی  
 اتحاد میں“

نوجوان شاعر احمد نواز کے اولین شعری مجموعہ ”اشک گویا“ کے لئے چند سطر میں

کے ساتھ ملتی ہے۔ واردات حسن و عشق کا دگلداز بیان بھی اس کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل، غزل کی بنیادی تعریف اور ابتدائی روایت کے قریب تر ہے۔

وہ دی ہے وقت کو وسعت تری محبت نے  
ہر ایک لمحے کے پہلو میں اک زمانہ ہے  
احمد نواز کی نظم سوز و گداز، سادگی و اثر آفرینی، تازہ کاری، فکری و نفسی میلانات کی نمائندہ اور عہد موجود میں مٹی ہوئی اقدار کی نوجوگری کی خواہش کے نقطوں پر مرکوز نظر آتی ہے، عصری حیاتی شعور نے اسے ایک اور غم کدے سے وابستہ کر دیا ہے، جہاں تک احمد نواز کی غزل کا تعلق ہے اس نے سب سے پہلا تاثر داخلی و خارجی مشاہدات اور حسیت کا ہے، اور اس کا یہی حسن ہے کہ جہاں اس نے داخلی حیاتی آلائش کو موضوع بنایا ہے وہاں اس کی قلبی واردات کی روایتی چاشنی بھی شامل نظر آتی ہے۔

چھڑے گا ذکر تری دلبری کا، دل سے مرے  
مہکتے لفظ لپک کر زباں کو آتے ہیں  
میں سوچتا بھی نہیں جن کو سوچنے کا نواز  
وہ آسمان سے نکلتے گماں کو آتے ہیں  
احمد نواز نے جہاں منظر ناموں سے قاری کی بینائی کو فکر و فن کا نور اور معنویت دی ہے وہاں اظہار سادہ موثر اور بلج ہے۔ اس کے اسلوب کی ندرت یہ ہے کہ اس نے ذاتی غم کا اظہار اس انداز سے کیا ہے کہ اس کی آواز میں ہم آواز ہونا بہتری کی آخری صورت نظر آتی ہے۔ یہ جدت اور ادا ادب کی آواہل عمری میں یقیناً اس کے جنس ہونے کا ثبوت ہے، محبت کے سلیقے سے آگاہ احمد نواز تازہ سوچوں کے ساتھ نظم کی دنیا میں وارد ہوا ہے۔ انسانی کم مائیگی ہو یا اس کم مائیگی کی دریافت وہ ہر مضمون کو بڑی نقابست سے بیان کرنے کے ہنر سے آشنا ہے۔

خلیق عموماً معروضات شعوری کا منطقی اختتامیہ ہے، حالات حاضرہ کے اثرات عمومی کا اظہار یہ ہے جس میں داخلی تجربات و احساسات کا پہلو بھی قابل قدر کردار ادا کرتا ہے۔

آج کے شعراء کے ذہن و خیال کی وسعت، تجربے کی انفرادیت آورد اور مشق کا اندازہ ان کے اشعار میں جھلکتا ہے وہ کس تناظر میں پس منظر کو بیان کرتے ہیں ان کے شعور کے سفر کی کیفیات کیا ہیں۔ ان سب کی تفہیم میں قاری کو وقت نہیں ہونی یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بیسویں صدی میں باوجود تمام تر مخالفت کے غزل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شاعری کے افق پر چمکتی دہتی رہی، اقبال، فیض، مجاز، ساحر، کیفی، سردار جعفری جیسے نظم گو شاعر بھی اس سے دامن نہ بچا سکے اردو شاعری میں وقت کے تقاضے مد نظر رکھتے ہوئے کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، یہ تبدیلیاں شاعری کے زندہ ہونے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

”اشک گویا“ نوجوان شاعر ”احمد نواز“ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جسے ساتھ جلی کیشنر نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

”اشک گویا“ میں بھی موسموں کے رنگ موجود ہیں، لطافت، شگفتگی، افکار کی تازہ کاری، روایت کا احترام، غم جاناں کی تخیلیاں وسیع مشاہدات، سلیکے جذبات۔ احمد نواز کو چاہتوں میں عذاب اور رت جکوں میں خواب کی موجودگی کا پورا یقین ہے۔

ایک صورت ہے کہ بچ جائے دنیا احمد  
خواب ہر آنکھ کو۔ پھر خواب کو تعبیر ملے  
احمد نواز کے ہاں کسی رحمان یا میلان کی کارفرمائی نظر نہیں آتی لیکن غزل اپنے آداب و انداز اور اسلوب

# بشری مسرور کا نیا ناول



## ساحل کی تھما کون کرے!

شائع ہو چکا ہے

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

براہ راست منگوانے کیلئے

علم و عرفان پبلشرز

40۔ الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور

042-7352382